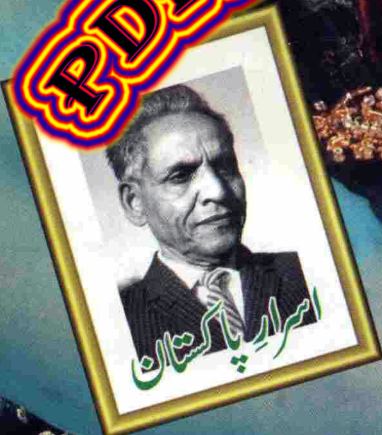
پُراسرار نمبر

دل گداز تحریریں ۰ زندگی کی تصویریں

ماہنامہ
کراچی

سچی کہانیاں

AUGUST
2012



اس شمارے میں

☆ جنوں، بھوتوں، ارواحِ خبیثہ کی 20 سے زائد اسرار بھری کہانیاں

☆ "آتشِ جنوں" سلیم فاروقی کے قلم سے

☆ "مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کے ذریعے آپ کے مسائل کا حل



آزادی

14 اگست 1947ء کو ہمیں آزادی ملی تھی، مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان وجود میں آیا تھا......اور اَب 14 اگست 2012ء ہمیں آزاد ہوئے، نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہو جائے گا......اِن گزرے ہوئے 65 سالوں میں سے چالیس برس شاید وہ تھے، جو ہم نے آزادی کا دُرست مفہوم جاننے یا پھر سمجھنے میں گزارے......اور گزشتہ پچیس برسوں میں ہم نے آزادی کا مطلب جان لیا ہے......اَب ہم یا ہماری اکثریت مادر پدر آزاد ہے......اپنی پسند، مفاد اور فائدے کے لیے ہم، ہر برے سے بُرا کام بہت آزادی سے کررہے ہیں۔ بس کوئی پوچھنے والا نہیں ہے......اور ہم کسی کو پوچھنے کی اجازت کسی صورت دینے کو تیار بھی نہیں ہیں......کیونکہ ہم آزاد ہیں!! مگر ذرا سوچیں، ''آزادی'' کا یہ سلسلہ تو بس ہماری زندگی کے ساتھ ہی چلے گا ناں؟؟؟......مرنے کے بعد......مذہبی حدود اور انسانی ضابطے توڑنے کے سوال اور سزا پر، اپنی پسند، مفاد اور فائدے والے جواب کی کسی صورت کوئی آزادی تو نہیں ملنی ناں؟؟؟

ناصر رضا

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

اکتوبر 2012ء

پُراسرار کہانی نمبر II

ناقابل یقین، دہشت انگیز، خوف ناک سچ بیانیاں، جنوں، بھوتوں اور ارواح خبیثہ کی پراسرار داستانیں ایسے پُراثر سچے روحانی واقعات کا حیرت انگیز مجموعہ جو شاید پہلے کبھی آپ کی نظر سے نہ گزرے ہوں۔

گزشتہ تمام پراسرار نمبرز سے منفرد

اس شمارے کے خاص لکھاری فرزانہ آغا، پروین حیدر، رضوان قیوم ابیہا مسعود، ملک صفدر عباس اعوان، مریم شاہ، شاہد بورے والا، سائرہ اکبر، ایم اے خالق بھٹی، نفیسہ مغل، کاشی چوہان، شیما قیوم، اشعر جواد اور دیگر قلم کار۔

آج ہی اپنے ہاکر سے اکتوبر 2012ء کا شمارہ مختص کرالیں

110 آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

احوال

منزہ سہام مرزا قارئین کے درمیان

بہت ہی اچھے احوالیو! خوش رہیے اور اسی طرح ہمیشہ میرے ساتھ رہیے، اپنے پیارے رسالے ''سچی کہانیاں'' کے ساتھ رہیے۔ میں ذاتی طور پر آپ تمام افراد کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے ابو کے بارے میں نہایت خوبصورت الفاظ استعمال کیے۔ ان کے بارے میں لکھے گئے ہر لفظ کو محبت سے پڑھا...... میں بیٹی ہونے کا حق ادا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں مگر اس کوشش میں مجھے ذرہ بھر بھی کامیابی نہیں مل سکتی اگر آپ لوگ میرے ساتھ نہ ہوں، میں ایک بار پھر آپ سب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ شمارے میں موجود تبدیلیاں آپ سے کچھ کو اچھی لگیں اور کچھ کو ناکافی تو یقین کیجیے آپ لوگوں کی رائے کی میرے لیے بہت اہمیت ہے۔ میں ان تمام مشوروں پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی جو آپ نے مجھے دیے ہیں۔ بس کچھ وقت درکار ہوگا۔ اللہ ہم سب کو آنے والے بابرکت دنوں میں اپنے پیاروں کے ساتھ اپنے رب کے حضور جھکنے کا موقع نصیب فرمائے، آمین۔ آئیے اب چلتے ہیں پہلے خط کی جانب......!

☒ اشعر جواد کراچی سے۔ ''محترمہ ایڈیٹر صاحبہ السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ خیریت سے ہوں گی۔ جولائی کا شمارہ انکل سہام کی یاد تازہ کر گیا، اللہ تعالیٰ انکل کے درجات بلند کرے، آمین۔ اداریہ ''یقین'' ناصر بھائی کے قلم سے لکھی حقیقت پر مبنی تحریر تھی، جس نے ہمارے ایقان کو جلا بخشی۔ ماہِ جنوری سے رسالے میں تبدیلیوں کے اشتہار دیئے جا رہے تھے مگر واہ! جون میں صرف ایک نیا سلسلہ ''سڑک کہانی'' کے عنوان سے شروع ہوا یا پھر سلسلہ وار کہانیوں کے قطار در قطار سلسلے شروع کیے گئے۔ وضاحت طلب امر یہ ہے کہ شمارے میں ''نیا پن'' کیا تھا؟ کہانیوں میں سلیم فاروقی کی تحریر ''آتش جنوں'' کی ابتدائی اقساط میں کہانی کا ٹیمپو کافی تیز ہے۔ جس سے حالات و واقعات ایک جیسے لگتے ہیں اور مار دھاڑ بھی فلمی لگتی ہے۔ غزل گائیک مہدی حسن کی زندگی کے حوالے سے ناصر بھائی نے خوب صورت انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اسی طرح انکل سہام کے بارے میں راجہ محمود نے عمدہ پیرائے تحریر کیا۔ عکاشہ سحر ایمان رسالے میں جو کام کر رہی ہیں وہ ادب اور ڈائجسٹ کی خلیج کافی حد تک کم کر رہا ہے اور رسالے کے ادبی امتزاج میں اضافے کا باعث ہے۔ ایک غور طلب امر ہے کہ بعض تحریروں میں نہایت گھٹیا اور بازاری زبان استعمال ہوتی ہے۔ اس کی طرف توجہ دیں۔ جیسے کہ احمر منصور نے خواجہ سراؤں پر قسط وار کہانی لکھی تھی۔ ذرا وہ ملاحظہ کریں۔ ہم تو وہ کہانی پڑھ کر سوچنے لگے تھے کہ واقعی میں بلاوجہ مرحوم سعادت حسن منٹو پر ''فحاش نگار'' ہونے کا الزام لگتا رہا۔ اگر تنقید بری لگی ہو تو معذرت چاہتا ہوں مگر جو بات محسوس کرتا ہوں وہ کہہ دینے کا عادی ہوں۔''

☆ بھائی شعر! آپ کی رائے سر آنکھوں پر...... کوشش کر رہے ہیں کہ وعدے کے مطابق تبدیلیاں لاسکیں، خط لکھتے رہیے گا۔

☒ ثانیہ بھٹی سیالکوٹ سے۔ ''پیاری آنٹی منزہ السلام علیکم! ہمیشہ آباد اور خوش رہیں، آمین۔ میرا نام ثانیہ ہے۔ میں سیالکوٹ سے ہوں۔ انکل ناصر کے ہوتے ہوئے میں لکھتی رہی ہوں۔ اب کافی مہینے بعد لکھ رہی ہوں۔ کیونکہ میرے 3rd ایئر کے پیپرز ہو رہے تھے۔ ''سچی کہانیاں'' سے ہمارا رشتہ بہت پرانا ہے۔ میری ماما شادی سے پہلے ''سچی کہانیاں'' پڑھ رہی ہیں اور اب میں اٹھارہ برس کی ہوں اور ''سچی کہانیاں'' سے رشتہ برقرار ہے اور رہے گا۔ ''سچی کہانیاں'' ایک منفرد

دکھ کی خبر

گزشتہ دنوں ڈاکٹر تنویر اے طاہر (ایگزیکٹو ڈائریکٹر اے پی این ایس) کی شریکِ حیات محترمہ آصفہ رضوی کی زندگی کا سفر رضائے الٰہی سے تمام ہوا...... ادارہ اِس دکھ اور افسوس کی گھڑی میں ڈاکٹر تنویر اے طاہر اور دیگر سوگواران کے ساتھ ہے اور مرحومہ کی بخشش اور درجات کی بلندی کے لیے دعا گو بھی!!

اور معیاری رسالہ ہے۔ جولائی کے شمارے میں محترم انکل سہام مرزا کے بارے میں پڑھا اللہ پاک ان کے درجات بلند کرے، آمین۔ وہ واقعی عظیم انسان تھے ان کی جدوجہد کی بدولت ہی ''سچی کہانیاں'' آج ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ آنٹی میں جہاں رہتی ہوں وہاں رسالہ بہت دور سے لے کر آنا پڑتا ہے۔ 7 یا 8 تاریخ ہو جاتی ہے۔ مجھے لکھنے کا بہت بہت شوق ہے۔ آپ لوگوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ مجھے بہت...... بہت اچھا لگا۔ مجھے تبصرہ نہیں کرنا آتا بس اتنا کہوں گی سب بہت اچھا لکھتے ہیں۔ آنٹی میں فیملی میگزین میں بھی لکھتی ہوں۔ آنٹی مجھے بس آپ سب کے ساتھ اور حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے اچھا اب اجازت، خدا حافظ۔''

☆ بچے ثانیہ! یہ تمہارا اپنا رسالہ ہے، ضرور لکھو، ہم تمہاری رہنمائی کریں گے اور ساتھ تو ہمارا ہے ہی تمہارا۔ اپنی امی کا بہت خیال رکھا کرو۔ خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے سر پر اُن کے والدین کا سایہ ہوتا ہے۔

✉ رانا محمد شاہد بورے والا سے۔ ''جون کا شمارہ ایک جاذبِ نظر ماڈل کے ساتھ ملا۔ نظروں کا جھکاؤ اور سادگی ہی انسان کا اصل حُسن ہوتی ہے۔ ''سرمایۂ قلم و قرطاس'' سہام مرزا کو ہم سے بچھڑے دس برس بیت گئے۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلتا، کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ مرزا صاحب کی کاوشیں انہیں زندہ رکھیں گی کیونکہ قلم اور کتاب سے تعلق رکھنے والا شخص کبھی نہیں مرتا۔ ناصر رضا نے ''یقین'' پر اداریہ لکھا۔ حقیقت یہی ہے کہ اب تو ہمیں اُسی یقین کو زندہ کرنا ہے جو بندے اور اللہ کا ہے۔ کیونکہ جب تک ہم اُس یقین کو زندہ نہیں کریں گے، پختہ نہیں کریں گے، ہم بے یقینی کے ساتھ، بدگمانی کے ساتھ اسی طرح اندھیروں کا شکار رہیں گے۔ نئے نئے سلسلوں کے ساتھ جہاں نئے قارئین کا اضافہ ہوگا، وہیں پرانے لوگ بھی لوٹ آئیں گے۔ ارشد علی ارشد ''سچی کہانیاں'' کے ایک پرانے اور منجھے ہوئے رائٹر ہیں۔ اُن کی آمد کی خوشی ہوئی۔ مہدی حسن کا شمار پاکستان ہی نہیں، دنیائے موسیقی کے بڑے فنکاروں میں ہوتا ہے۔ بے مثال شہرت کے باوجود عجز و انکساری اور سادگی کا نمونہ تھے۔ ''میرا آشیاں کہاں ہے'' روشانے کی اچھی کہانی تھی۔ نسرین نکہت سبزواری کی ''بھابی ماں'' بھی معاشرتی روایات میں گندھی ایک اچھی کہانی تھی۔ ''شہید کی ڈائری'' والا سلسلہ بھی اچھا ہے۔ اپنے ہم وطن بھائیوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ''موچی بابا'' میں انتہائی تلخ حقیقت کو روشناس کرایا گیا۔ محمد سلیم اختر کا شمار بھی پرانے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ ''بھٹکنے سے ذرا پہلے'' میں انہوں نے انسانی نفسیات کے حوالے سے ایک خاص پہلو کو اُجاگر کیا۔ ارم زہرا کی ''شک کا بیج'' بھی ایک اچھی کہانی تھی۔ خصوصاً آج جب کہ موبائل نے نہ جانے معاشرے میں کیسے کیسے بگاڑ پیدا کر دیئے ہیں۔ ''یادوں کے اوراق'' رخسانہ سہام مرزا کی آپ بیتی دلچسپی سے بھرپور تھی۔ ابتداء میں یہ بات پڑھ کر تو خوب محظوظ ہوئے کہ امرود کا درخت جو ہمارے صحن میں لگا ہوا تھا، اس کا ایک امرود بھی کبھی ہم نے پکنے نہیں دیا تھا۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ دو تجاویز ہیں ایک یہ کہ سرورق کی ماڈل پر بھی ایک صفحہ دیا کریں۔ اِسی طرح کسی نہ کسی مشہور شاعر پر بھی دو تین صفحات ہوں۔''

☆ بھیا رانا! ہمیں بھی یقین ہے کہ پرانے تمام دوست لوٹ آئیں گے۔ اب ایسی بھی کیا مصروفیت کہ اپنوں کے لیے بھی وقت نہ ہو۔ بہر حال آپ لوگ آواز دیتے رہیے کبھی نہ کبھی تو ضرور اثر ہوگا۔ جہاں تک آپ کی تجاویز کا تعلق ہے تو اس پر ضرور غور کریں گے۔

✉ ممتاز احمد سرگودھا سے۔ ''قابل صد احترام بہن منزہ سہام، السلام علیکم! جولائی 2012ء کا شمارہ دیکھ کر دل خوشی سے سرشار ہوگیا۔ میرے خط کو آپ نے خصوصی خط کا درجہ دیا، اس عزت افزائی پر بہت ممنون ہوں۔ مگر بہنا اعزازی طور پر ''دوشیزہ'' اور ''سچی کہانیاں'' موصول نہیں ہوئے۔ ''احوال'' احوالیوں کی خوب صورت باتوں سے چمک رہا تھا۔ اداریہ

بہت بڑا لمحہ فکریہ دے گیا۔ راجہ محمود نے ”سرمایۂ قلم و قرطاس“ محترم المقام سہام مرزا کے بارے میں بہت عمدہ لکھا۔ ناصر رضا نے مہدی حسن مرحوم کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ تمام کہانیاں زبردست رہیں۔ نسرین نکہت سبزواری، محمد سلیم اختر، انیلہ امام بخش، نازنین رضا، کرن شبیر اور عظمٰی اختر نے اپنے قلم کے خوب جوہر دکھائے۔ روشانے سبعین کی ”میرا آشیاں کہاں ہے“ مینا کی ”موچی بابا“ سپنا عباسی کی ”دیر ہے اندھیر نہیں“ اور ارم زہرہ کی ”شک کا بیج“ بہت ہی لاجواب اور عمدہ کہانیاں تھیں۔ سلیم فاروقی صاحب کا ”آتش جنوں“ بہت ہی خوب صورت اور زبردست سلسلہ ہے۔ ”خیال آرائی“ میں سب لکھاریوں نے بہترین خیالات کا اظہار کیا۔ اگست کے شمارے کا شدت سے انتظار ہے اور امید ہے کہ میری کہانی بھی شامل ہوگی۔ آخر میں ”سچی کہانیاں“ کی پوری ٹیم، تمام لکھاریوں اور محترم قارئین کرام کے لیے ڈھیروں دعاؤں اور نیک خواہشات کا تحفہ اور رمضان المبارک کے مقدس اور بابرکت مہینے کی مبارک باد پیش کرنے کے بعد اجازت چاہوں گا۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ حاضری ہوگی۔ تب تک کے لیے اللہ حافظ۔“

☆ بھائی ممتاز! جلد آپ کو دونوں شمارے مل جائیں گے ملنے پر مطلع ضرور کیجیے گا۔ کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ۔

✉ سدرہ انور علی، جھنگ صدر سے۔ ”قابلِ احترام آنٹی جان السلام علیکم! اللہ تعالٰی سے نیک امید ہے کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گی۔ اللہ تعالٰی سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اور سب کو ہمیشہ خوش و خرم ہنستا مسکراتا رکھے، آمین۔ میری طرف سے تمام اہلیان ”سچی کہانیاں“ کو رحمتوں، برکتوں اور مغفرتوں والا ماہِ رمضان مبارک ہو۔ مور شاہد وفا بھیا پچھلے ماہ میرا خط لیٹ تھا شاید اس لیے شاملِ احوال نہ ہو سکا۔ باقی تو بالکل خیریت تھی۔ آپ نے میری کمی محسوس کی بہت اچھا لگا۔ ویری تھینکس۔ جولائی کا ”سچی کہانیاں“ ملا ٹائیٹل گرل کچھ خاص نہیں تھی۔ ”احوال“ میں خطوط پڑھ کر بہت مزہ آیا اور ویسے بھی اس بار خطوط کی تعداد زیادہ تھی۔ انکل ناصر رضا کا اداریہ ”یقین“ دل کی آنکھ سے پڑھا، پسند آیا۔ زندہ کہانی میں راجہ محمود ”سرمایۂ قلم و قرطاس“ میں انکل سہام مرزا کی رودادِ زندگی پڑھی۔ وہ الفاظ میرے پاس نہیں ہیں جن کے ذریعے میں اُن کی تعریف کر سکوں۔ اللہ تعالٰی انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، آمین۔ انکل ناصر رضا کی ”ہم چلے اس جہاں سے“ مہدی حسن پر اُن کی تحریر بہت پسند آئی۔ پُراسرار کہانیاں بہت اچھی لگیں اور ویسے بھی پُراسرار نمبر کا بہت انتظار ہے۔ سفر کہانی عکاشہ ایمان کی ”برف زار“ دوسرا حصہ بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ آخری قسط کا شدت کے ساتھ انتظار ہے۔ میری کہانی میری زبانی میں آنٹی رخسانہ سہام کی ”یادوں کے اوراق“ بہت اچھی لگی۔ ویسے بھی پرانی یادیں تازہ کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ شاعری میں کاشی چوہان بھائی کی ”آدوست میرے“ پسند آئی۔ قیصر محمود کی والدہ کے انتقال پر ہم ان کے غم میں شریک ہیں، اللہ تعالٰی مرحومہ کے درجات بلند کرے، آمین۔ ”بازگشت“ میں انکل سہام کراماتی بجٹ تحریر پسند آئی۔ ہم اُن کی سوچ سے متفق ہیں۔ ڈیئر آنٹی جان پُراسرار نمبر کے لیے کہانی ارسال کی تھی کیا آپ کو مل گئی اور کیسی لگی؟ ضرور بتائیے گا اور میں اب تک کتنی ہی خیال آرائیاں بھیج چکی ہوں وہ شائع کیوں نہیں ہوئیں؟ اشاعت کے قابل نہ ہوں تو بھی بتائیے گا۔ تمام پڑھنے والوں کو سلام، اپنا خیال رکھیے گا۔ اگلے ماہ ملاقات ہوگی بشرطِ زندگی، اللہ نگہبان۔“

☆ پیاری سدرہ! رمضان تمہیں بھی مبارک ہو۔ یہ محض اتفاق ہے کہ کردار کا نام اور مصنف کا نام ایک ہے تمہاری تحریر ناصر بھائی کے پاس ہے۔ میں ان سے ضرور پوچھوں گی کہ ان کی رائے کیا ہے۔ اگلے ماہ انتظار رہے گا۔

✉ خلیل جبار، حیدرآباد سے۔ ”محترمہ منزہ سہام، السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔ جولائی کا شمارہ پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوا۔ ٹائیٹل دیدہ زیب تھا۔ اداریہ ”یقین“ جو اس بار ایڈیٹر ناصر رضا کے قلم سے تھا، اچھا لگا۔ اداریہ میں جو سوال انہوں نے اُٹھائے ہیں وہ ہر ایک کے ذہن میں گونجتے ہیں۔ ناصر رضا صاحب پر سے پرچے کے کام کا بوجھ کچھ کم ہو جائے تو قارئین کو ہر ماہ ایک اچھا افسانہ پڑھنے کو مل سکتا ہے۔ ”احوال“ کے خطوط پڑھتے ہوئے زندہ کہانی کی طرف آئے، جہاں اس بار سہام مرزا صاحب جیسی ہمہ جہت شخصیت پر مضمون پڑھنے کو ملا جس میں سہام صاحب کی جہد مسلسل کی حقیقی کہانی دلکش پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ناصر رضا کے قلم سے مہدی حسن کے حوالے سے مختصر مضمون بھی خوب رہا۔ خصوصی کہانیوں میں روشانے سبعین کی اور نسرین نکہت سبزواری کی اچھی تحریریں تھیں۔ آپ کی ”شہید کی ڈائری“ حسب توقع بہترین رہی۔ سڑک کہانی میں اس بار مینا نے موچی کے کردار کو پورٹریٹ کیا ہے۔ اس

دِل ہے ملال سے آباد

معروف دانشور، صحافی، روزنامہ عوام کے ایڈیٹر نذیر لغاری کی ہمشیرہ کے جواں سال بیٹے اور بیٹی ٹریفک کے اندوہ ناک حادثے میں زندگی سے منہ موڑ گئے...... ادارہ نذیر لغاری صاحب اور ان تمام لوگوں کے لیے صبر و قرار کی دُعا کرتا ہے۔ جن کے دل اس سانحے کے باعث ملال سے آباد ہیں۔

میں مزید گنجائش تھی۔ ''آتشِ جنوں'' تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ قارئین کو کہانی نے پوری طرح گرفت میں لیا ہوا ہے۔ محمد سلیم اختر کی ''بھٹکنے سے ذرا پہلے'' سبق آموز اچھی کاوش تھی۔ اس کے علاوہ سپنا عباسی، انیلا امام بخش، نازنین رضا، شبیر احمد بھٹی، کرن شبیر اور رضیہ علمدار کی تحریریں بھی اچھی تھیں۔ موبائل کہانی میں نگہت عائشہ اور پراسرار کہانی عظمیٰ اختر کی زبردست تھی۔ ارم زہرہ حسب معمول میرے شہر کی کہانی میں ''شک کا بیج'' کے عنوان سے ایک اور اچھی تحریر سمیت حاضر تھیں۔ عکاشہ سحر کا سفرنامہ کا دوسرا حصہ بھی خوب رہا۔ البتہ اس حصے میں تصاویر کی کمی محسوس ہوئی۔ کم از کم تین تصاویر ضرور ہونی چاہیے تھیں اور اب ذکر ہو جائے نئے سلسلے ''یادوں کے اوراق کا'' جس میں رخسانہ سہام مرزا صاحبہ نے اپنے قلم کا جادو خوب جگایا اور سادہ پیرائے میں اچھی تحریر پڑھنے کو دی۔ شازلی سعید مغل کا ناول ''تاشون'' بھی اچھا جا رہا ہے۔ عکاشہ سحر کے قلم سے کتاب تبصرہ ''ایک تھا بادشاہ'' ہمیشہ کی طرح بہترین رہا۔ پراسرار نمبر کے لیے میں نے موبائل کہانی بھجوادی تھی اب یہ کہانی پراسرار نمبر کے بعد والے شمارے کے لیے انجام سے بے پرواہ بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ پسند آئے گی۔''

☆ بھائی خلیل جبار! امید کرتی ہوں آپ اچھے ہوں گے۔ سیر حاصل تبصرے کے ساتھ ''احوال'' میں آئے، شکریہ اور یہ جو انجام سے بے پرواہ ہو کر آپ کہانی بھیج رہے ہیں تو اب تو ہم بھی قائل ہو گئے کہ آپ ''سچی کہانیاں'' سے بے حد محبت کرتے ہیں کیونکہ یہ ادا تو صرف ایک محبوب کی ہی ہولی ہے، خوش رہیے۔

✉ فائزہ شہزاد پشاور سے۔ ''بہت ہی پیاری منزہ جی السلام علیکم! سدا خوش رہیں آباد رہیں آمین۔ سچی کہانیاں سے رشتہ طے ہوئے تو کافی عرصہ ہو گیا مگر آپ سے مخاطب پہلی بار ہوں۔ نہ جانے آپ مجھے جانتی بھی ہیں یا نہیں۔ میں ''سچی کہانیاں'' کی گمشدہ رائٹر فائزہ شہزاد المعروف نانی جی ہوں۔ آہا! کیا خوب صورت دن تھے وہ جب پہلے ''چوپال'' اور پھر ''محفلِ دوستاں'' کی محفلیں سجا کرتی تھیں۔ کیا خوب صورت نوک جھونک اور پیار محبت بھرے خطوط سے یہ محافل سجا کرتی تھیں اور رسالہ ہاتھ میں لیتے ہی میں سیدھی لمبی چھلانگ لگا کر اس محفل میں جایا کرتی تھی۔ لو! اب یہ نانی اتنی بوڑھی بھی نہیں ہوئی کہ چھلانگ نہ لگا سکتی ہو۔ وہ الگ بات ہے کہ بعد میں سِکائی ضرور کرنا پڑتی ہے۔ اب کسی کو بتانہ دینا کیونکہ بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔ ویسے تمام قارئین اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے خط لکھا کریں کہ بھیا آل از ویل! تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ تبصرے کا مطلب ہوتا ہے تعریف + تنقید۔ مگر شدید کوفت ہوتی ہے جب تبصرہ نگار ہر کہانی کے بارے میں لکھتے ہیں۔ یہ بھی زبردست تھی وہ بھی زبردست۔ رضوانہ، رابیل، محفوظ بھائی، ارشد علی ارشد، ایم خالق بھٹی، بھائی جی آ آ آ...... آپ سب نے ہمیشہ دعاؤں میں یاد رکھا۔ بہت مشکور و ممنون ہوں آپ سب کی۔ دراصل پورا ایک سال کچھ ٹینشن اور بیماریوں میں گزرا مگر کسی بھی پل رسالے کی جانب سے غافل نہیں ہوئی۔ منزہ جی! ایک دو رائٹر (نام میں نہیں لکھ رہی)، بہت عجیب اور Cheap سے الفاظ اور جملے استعمال کرتے ہیں جو پڑھتے ہوئے بہت بُرا لگتا ہے۔ نوجوان، بچے، بچیاں بھی پڑھتے ہیں ہم نے اُن کے دل، دماغ، زبان کو سنوارنا ہے نہ کہ بگاڑنا ہے۔ یہ کام تو میڈیا پہلے ہی بہت خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے۔ کم از کم ہمارا قلم تو پاک صاف رہے۔ ضروری نہیں کہ ہر بات کو تہہ در تہہ کھول ہی دیا جائے۔ کچھ باتیں پوشیدہ ہی اچھی لگتی ہیں۔ ایسی کہانیاں پڑھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ جیسے بی پا شا یا عمران ہاشمی کی کوئی مووی دیکھ رہے ہوں۔ پلیز پلیز میرے اس تھوڑے سے لکھے گئے کو زیادہ سمجھیے گا۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پورے تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ تمام قارئین کو، مصنفین کو، تمام بڑوں کو، چھوٹوں کو رمضان المبارک کی رحمتیں، برکتیں اور خوشیاں مبارک ہو۔ اپنی دُعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔''

☆ بہت ہی اچھی فائزہ! یقین ہے کہ تمام پریشانیوں سے پیچھا چھڑا چکی ہوں گی۔ چلیں یہ تو زندگی کا حصہ ہے۔ انسان مشکلات سے نبرد آزما ہو کر بھی ڈٹا رہے یہ بڑی بات ہے۔ میں آپ کی بات سے متفق ہوں کہ تبصرہ، تنقید اور تعریف کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ہمارے کچھ احوالی لکھاری کا نام پھر کہانی کا نام اور پھر کئی سطروں میں اس کے کرداروں کو ڈسکس کرتے ہیں۔ ایسے خطوط پر مجبوراً قینچی چلانی پڑتی ہے۔ صفحات کی کمی کی وجہ سے اتنے طویل خطوط شائع کرنا ممکن ہی نہیں۔ بہر حال یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم آپ کو بھول ہی نہیں سکتے۔ ہم اپنے کسی بھی احوالی کو نہیں بھول سکتے۔ خاطر جمع رکھیں اور احوال میں آتی رہیں۔

✉ مور شاہد حسین وفا۔ ''پیاری آنٹی منزہ سہام، السلام علیکم! امید ہے کہ آپ اور آپ کا تمام اسٹاف بالکل خیر خیریت سے ہوگا۔ سرورق پر (مرحوم) انکل سہام مرزا کو دیکھ کر دل جھوم اُٹھا۔ جولائی کا شمارہ پچھلے مہینوں کے شماروں کے مقابلے، قارئین کے لیے بہت ہی خاص تھا۔ کیونکہ اس شمارے میں آنٹی رخسانہ سہام مرزا، انکل ناصر رضا اور راجہ محمود کی تحریروں نے چار چاند لگا دیئے۔ یہ شمارہ میں نے دل کی آنکھ سے پڑھا۔ انکل ناصر رضا نے ''یقین'' کے عنوان سے زبردست لکھا۔ آپ کے افسانوی مجموعے ''کانچ کی عورت'' کا کب تک انتظار کرنا ہوگا؟ ''احوال'' میں خطوط کی محفل عروج پر تھی۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ زندہ کہانی میں ویلڈن راجہ محمود اس بار لاجواب تحریر ''سرمایۂ قلم و قرطاس'' روشن چراغ انکل سہام مرزا کے بارے میں پڑھا۔ بہت خوشی ہوئی لیکن آخری صفحات دل کو دکھی کر گئے۔ اے کاش انکل ہمارے ساتھ ہوتے۔ انکل ناصر رضا کی تحریر ''ہم چلے اس جہاں سے'' شہنشاہ غزل مہدی حسن کی زندگی کے بارے میں پڑھ کر آنکھیں نم ہوئیں۔ خصوصی کہانیوں میں روشانے سبعین، نسرین نکہت سبزواری، شہید کی ڈائری بے مثال تھی۔ سڑک کہانی ''موچی بابا'' اچھی تھی۔ انکل سلیم فاروقی کی تحریر ''آتشِ جنوں'' پسندیدہ سلسلہ ہے۔ آپ بیتی میں محمد سلیم اختر کی تحریر ''بھٹکنے سے ذرا پہلے'' اچھے موضوع پر لکھی گئی۔ میری کہانی میری زبانی آنٹی رخسانہ سہام مرزا کے قلم سے ''یادوں کے اوراق'' بہت زبردست اور دلچسپ تھی۔ آنٹی اللہ کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ بچپن کی طرح ہمیشہ مسکراتی رہو، آمین۔ اگلی قسط کا بہت ہی شدت سے انتظار ہے۔ شازلی سعید مغل کی تحریر ''تاشون'' لاجواب سلسلہ ہے۔ Mini Mag میں آپ کی ڈائری، خیال آرائی، کتاب تبصرہ، پسند اپنی اپنی، آپ کی خبر اور بازگشت یہ بہت اچھے سلسلے ہیں، بے حد پسند ہیں۔ آنٹی آپ کے حکم کے مطابق ایک موبائل کہانی حاضر خدمت ہے۔ آنٹی رخسانہ سہام مرزا، انکل ناصر رضا، راجہ محمود، شاہد فراز اور قارئین کو خصوصی سلام و دعائیں اور نیک تمنائیں۔ اب اجازت اس دعا کے ساتھ کہ ''سچی کہانیاں'' کے چاہنے والوں کا ہر آج اور کل خوشیوں، محبتوں، چاہتوں اور کامیابیوں میں گزرے، آمین۔''

☆ بھیا مور! خوش رہیے۔ آپ کے خط کو کچھ مختصر کر دیا ہے۔ آپ کو تمام کہانیاں اچھی لگیں، تو تمام لکھاریوں کی جانب سے میں شکریہ ادا کرتی ہوں۔

✉ عمران مظہر ژوب بلوچستان سے۔ ''السلام علیکم! امید ہے آپ اور آپ کا سارا اسٹاف خیر و عافیت سے ہوگا۔ آپ کی ہدایت کے مطابق نئی کہانی بھجوا رہا ہوں۔ کہانی بالکل سچی ہے۔ میں نے نام اور مقام تبدیل کر دیئے ہیں۔ پھر وہی بات کہوں گا کہ کہانی کی نوک پلک سنوارنا آپ کی ذمہ داری ہے کیونکہ میں ابھی سیکھنے کے عمل میں ہوں۔ آپ کی رہنمائی کا طالب ہوں۔ آپ کے پاس میری دو کہانیاں ہو جائیں گی۔ کچھ اور کہانیاں بھی پڑی ہیں جنہیں وقتاً فوقتاً بھیجتا رہوں گا۔ کہانی کے بارے میں آپ کی رائے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ کہانی کے آخر میں ایک مختصر نوٹ لکھ رہا ہوں کیونکہ کچھ قانونی پیچیدگیاں ہیں۔ آپ سے دعاؤں کی درخواست ہے۔ ہماری دعاؤں میں آپ سب رہتے ہیں۔''

☆ عمران بھائی! پرچے پر آپ نے کوئی رائے نہیں دی یہ تو بھائی زیادتی ہے۔ کہانیوں کے بارے میں ناصر بھائی آپ کو جلد بتائیں گے۔

✉ غیاث الدین غیاث کراچی سے۔ ''صد احترام منزہ سہام آداب و سلام! امید ہے، مزاج بخیر ہوں گے۔ ایک طویل غیر حاضری کے بعد حاضری دے رہا ہوں۔ طبیعت کی ناسازی کچھ بھی لکھنے نہیں دے رہی پھر بھی ہمت کی ہے۔ اللہ کرم فرمائے۔ ''سچی کہانیاں'' پابندی سے زیرِ مطالعہ ہے۔ نئی تبدیلیاں قابل ستائش ہیں۔ اللہ بہت ساری کامیابیاں عطا

فرمائے۔ رمضان المبارک کی آمد ہے۔ اس حوالے سے ایک حمد، ایک نعت ارسال کر رہا ہوں۔ ساتھ ہی ایک غزل بھی ہے۔ اگر ہو سکے تو حمد و نعت کو ایک ہی صفحے پر جگہ دے دیں، زیادہ اچھا لگے گا۔ باقی جیسا آپ چاہیں۔ تمام دوستوں اور ساتھیوں کو سلام خاص طور پر ناصر رضا بھائی کی خدمت میں، اچھی دعاؤں کے ساتھ۔"

☆غیاث بھائی! اللہ آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ تبدیلیاں آپ کو اچھی لگیں، شکریہ۔ آئندہ بھی محفل میں آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

✉عبدالعزیز جی آ، چکوال سے۔ "اچھی بہن آداب! پچھلے پرچے میں آپ نے ہمیں مختصر خط لکھنے پر داد دی ہے لیجیے ہم اپنے دل پر بھاری پتھر رکھ کر ایک بار پھر مختصر خط کے ساتھ حاضر ہیں۔ کہیے مزاج کیسے ہیں؟ پرچہ ملا اچھا ہے سب سلسلے اچھے ہیں۔ سدرہ بیٹی کو ہماری خیال آرائی اچھی لگی پسند کی سند پا کر ہم کو بھی از حد خوشی ہوئی، جیتی رہو۔ نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔ نامہ بند کرتا ہوں ہر یاد کرنے والے کو سلام۔"

☆عزیز بھائی! کیا بات ہے، آپ رسالہ توجہ سے نہیں پڑھ رہے ہیں؟ چلیں کوئی بات نہیں مصروفیت میں سے کچھ وقت ضرور اپنے شمارے کے لیے نکالا کریں۔

✉فوزیہ جاوید، گجر خان سے۔ "السلام علیکم! آپ کو "سچی کہانیاں" کی پوری ٹیم سمیت دعاؤں بھرا اسلام۔ میرے پاس میرے ارد گرد بے شمار سچی کہانیاں بکھری پڑی ہیں جن کو لکھنے کی میں ہمت نہیں کر پا رہی۔ پہلی بار کوئی کہانی لکھ رہی ہوں۔ اس امید پر کہ آپ میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ میری کہانیوں کا بتا دیجیے گا کہ قابلِ اشاعت ہیں یا نہیں۔ میں انتظار کروں گی۔ دو کہانیاں بھیج رہی ہوں۔ الگ الگ لفافے میں ڈال کر، میری تمام قارئین اور "سچی کہانیاں" کی ٹیم سے التجا ہے کہ پلیز میرے حالات میرے گھر کے لیے دعا کریں۔"

☆بہت ہی پیاری فوزیہ! تمہاری کہانیاں جب شائع ہوں گی ہم تمہیں ضرور مطلع کریں گے، یہ وعدہ ہے۔ حالات سے کبھی دل برداشتہ مت ہونا، جہدِ مسلسل میں دراصل کامیابی کی ضمانت ہے۔ میرے بہت سارے احوالی بڑے گمبھیر مسائل میں گھرے ہونے کے باوجود کیسے خوش باش محفل میں آتے ہیں۔ اصل بہادری تو یہ ہے حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ یقین رکھو سب اچھا ہو گا۔ ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔

✉مون شاہ سرگودھا سے۔ "محترمہ منزہ سہام السلام علیکم! حمد اُس اللہ کی جس نے حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ ہزاروں درود و سلام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو شافع محشر ہیں۔ سرِ ورق بہت خوب تھا۔ سہام مرزا کی جہدِ مسلسل کی داستان پڑھ کر اچھا لگا۔ اللہ پاک انہیں غریقِ رحمت فرمائے۔ محترم ناصر رضا کے قلم سے "مہدی حسن" کے بارے میں جان کر اچھا لگا اور اُن کی وفات کا دُکھ بھی ہوا۔ کہانیاں سب ہی لاجواب ہیں۔ انعام کا ذکر رہنے دیں اب۔ ملے نہ ملے ہم شہرت کے پیاسے تھے جو خواب ہے دیوانے کا۔ ہر ماہ "سچی کہانیاں" خریدنے کی گنجائش نہیں رکھتے۔ باوجود اس کے کہ یہ پسندیدہ رسالہ ہے اور ہم اس سے جُدا ہونا نہیں چاہتے بہر حال آپ سے گزارش ہے ہے اگر میری کوئی کہانی شائع کرنے کا ارادہ ہو تو مطلع فرمایئے گا۔ نوازش ہو گی۔"

☆ڈیئر مون! تمہاری کہانی شائع کرنے کا پورا پورا ارادہ ہے اور اس بارے میں تمہیں ضرور مطلع کریں گے۔

✉صابر علی کورائی پنو عاقل سے۔ "محترمہ باجی منزہ سہام عقیدت بھرا اسلام، جولائی کا شمارہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اداریہ ناصر رضا کا "یقین" سیاست دانوں کے لیے آئینہ تھا۔ "احوال" میں آئے تو صدف آصف کراچی کا خط پڑھا تبصرہ شاندار تھا۔ اب تک جن احوالیوں کے خط پڑھے ہیں ان میں باجی شکیلہ انجم طارق، ام عادل، تنویر خالد، باجی مریم شاہ، عمران مظہر، نعمان اسحاق، سیمیں غزالہ نہاں، فرید عالم، محمد راشد، حافظہ مون شاہ اور وفا صدام حسین غازی تینو کے خط ہم نے توجہ سے پڑھے ہیں۔ عکاشہ سحر ایمان، ارشد علی ارشد کا خط پڑھا تو نیا سلسلہ "ملکھنی" کے آنے کا سُن کر دل خوش ہوا، ویل ڈن ارشد بھائی۔ رضوانہ کوثر، عزیز جی آ، باجی شگفتہ شفیق اور خلیل جبار، بھائی خلیل جبار آپ کی تحریر خاص کر کے پڑھتے ہیں۔ اب تک تو "احوال" یہیں تک پڑھا ہے۔ اب کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ راجہ محمود کی تحریر "سرمایۂ قلم و قرطاس" انکل سہام مرزا کی برسی کی مناسبت سے اچھی تحریر تھی۔ باجی روشانے سبعین کی کہانی "میرا آشیاں کہاں ہے" سب سے

منفرد کہانی تھی، ویل ڈن باجی۔ دوسرے نمبر پر جو کہانی ہے ''بھابی ماں'' نسرین نکہت سبزواری کی۔ ''آتشِ جنوں'' سلیم فاروقی کی سلسلہ وار کہانی بہت اچھی جارہی ہے۔ ''سائبان کوئی نہیں'' باجی کرن شبیر کی کہانی بھی زبردست تھی۔ آج کل اچھے کردار ہمارے آس پاس موجود ہیں۔ ''ایسے بھی ہیں جہاں میں'' باجی رضیہ علمدار کی کہانی نیک دل انسان کی کہانی تھی جو ہمارے معاشرے میں کم کم ہوتے جارہے ہیں۔ باجی فاطمہ بلگرامی کی سلسلہ وار کہانی ''جن آنکھوں میں خواب بستے تھے'' بھی پڑھی ہے۔ اب تک اتنا ہی پڑھا ہے جس کا تبصرہ حاضر ہے۔ باقی تمام احوالیوں کو سلام عرض اور ''سچی کہانیاں'' کی ٹیم کو دل سے خلوص بھرا اسلام عرض ہے۔ اب اجازت، باقی ساتھ باقی بات باقی۔''

☆ بھائی صابر! کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ، محفل میں آتے رہیے گا۔

✉ عائشہ صدیقہ ضمیر، ''محترم مدیر، السلام علیکم! بعد اس کے گزارش ہے میری کتاب ''اور...... بنتے گئے افسانے'' جو گزشتہ ماہ منظر عام پر آئی ہے۔ اسے میں ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں تبصرے کے لیے ارسال کررہی ہوں۔ مجھے امید ہے جون کے شمارے میں آپ اس پر تبصرہ فرمائیں گے۔ میں ''سچی کہانیاں'' ڈائجسٹ میں لکھتی رہی ہوں۔ اس لیے آپ کے لیے اجنبی نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ جیسے دانشور حضرات اپنی رائے کا اظہار فرمائیں تاکہ مجھے اپنی غلطیوں اور خوبیوں کا اندازہ ہوجائے اور دوسری کتاب میں اُس کا خیال رکھوں۔''

☆ ڈیئر عائشہ! صاحبِ کتاب ہونے پر ہماری جانب سے بہت مبارک ہو مگر یار کتاب تو ملی ہی نہیں، رائے کیسے دیں۔

✉ عائشہ خورشید انور کراچی سے۔ ''پیاری آپی، آداب! جون کا چٹخارہ دار شمارہ اب تک میرے ہاتھوں میں اور چٹخارے لے کر پڑھنے میں جو مزا ہے وہ اور کہاں کیوں کہ میں کوئی اور رسالہ نہیں پڑھتی۔ ایک رسالہ ''سچی کہانیاں'' اور ایک ''اردو ڈائجسٹ'' جو میرے ابو جی کا پسندیدہ رسالہ تھا۔ اب وہ نہیں رہے تو اردو ڈائجسٹ بھی نہیں رہا۔ اب صرف ''سچی کہانیاں'' ہے۔ تمام سلسلے، تمام رائٹرز دل کو بھا گئے اور دماغ پر چھا گئے ''ٹھا'' کرکے۔ ایک چھوٹی سی کاوش کہانی کی صورت میں بھیج رہی ہوں۔ اگر کسی قابل ہو تو ضرور بتایئے گا۔ سب کو میرا اسلام۔

☆ سویٹ عائشہ! تمہارا خط پڑھتے ہوئے میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ ایسے ہی مزے مزے کے الفاظ استعمال کیا کرو۔ کہانی کے بارے میں ناصر بھائی بتائیں گے۔

✉ بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی بہاولپور سے۔ ''محترمہ منزہ سہام صاحبہ السلام علیکم! جولائی 2012ء کا ''سچی کہانیاں'' موصول ہوا، شکریہ۔ ''سرمایہء قلم و قرطاس''۔ سہام مرزا صاحب کی جہدِ مسلسل کی روداد پڑھی، دل خوش ہوا۔ اگست کا ''سچی کہانیاں'' پراسرار نمبر ہوگا۔ یہ اچھی خوش خبری ہے۔ ''سچی کہانیاں'' میں ویسے بھی دوتین پراسرار کہانیاں ہوتی ہیں جو اچھا تاثر چھوڑتی ہیں۔ جولائی کے شمارے میں آپ نے میری کہانی ''اللہ کی عدالت'' کو نوک پلک درست کرکے شائع کیا، شکریہ۔ اس دفعہ ''احوال'' میں مختصر خط لکھ رہا ہوں تاکہ دوسرے قارئین کے خطوط بھی اِن صفحات میں سماسکیں۔ ایک ہی خط میں تین کوپن ارسالِ خدمت ہیں۔ اُن کو اپنے اپنے شعبہ تک پہنچا دیجیے۔ ایک بار پھر تھینکس۔''

☆ بشیر بھائی! آپ کو ابو کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا، بہت شکریہ۔

✉ ارباب قربان علی ایری، بلوچستان سے۔ ''محترمہ منزہ سہام مرزا، ڈھیروں دعائیں! جب جولائی کے شمارے پر نظر پڑی تو یہ اپنی کرنیں میزان چوک پر بکھیر رہا تھا۔ اس بار ٹائٹل بلوچستان کی عکاسی کررہا تھا۔ صنف نازک کی نظریں شرم و حیا سے جھکی ہوئی تھیں۔ واقعی شرم و حیا عورت کا زیور ہے۔ ناصر بھائی کی ''یقین'' کے ذریعے آمد نے طبیعت خوش کردی۔ ''احوال'' میں آپ کے جوابات متاثر کرگئے۔ محنت میں عظمت ہے۔ راجہ صاحب کی سہام مرزا کے حوالے سے لکھی گئی تحریر بے حد پسند آئی۔ اس میں شک نہیں کہ سہام مرزا جیسے عظیم و باہمت لوگ بہت کم ہی پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے جب اِس دنیا میں آتے ہیں تو نہ صرف اپنے حصے کی شمع روشن کرتے ہیں بلکہ انسانوں کی فلاح و بہبود اور اصلاح کا باعث بنتے ہیں۔ ناصر بھائی نے مہدی حسن کی کہانی لکھ کر غیر حاضری ختم کردی۔ کہانیوں کا رنگ بھی سچی کہانیاں کو رنگین بنائے ہوئے تھا۔ آپ کی ڈائری، خیال آرائی، کتاب تبصرہ، پسند اپنی اپنی ساتھ ساتھ اگر غزلوں کے لیے بھی ایک صفحہ مختص کردیا جائے تو ''سچی کہانیاں'' اپنی دھوم مچادے گا۔''

☆ارباب بھائی! یقین رکھیے آپ کی پراسرار کہانی ضرور چھپے گی۔ اس ماہ کا شمارہ آپ کو اچھا لگا شکریہ۔ اپنی قیمتی رائے سے ضرور نوازتے رہیے گا۔

✉ عبدالرؤف عدم، راولپنڈی سے۔ ’’بہت اچھی آپی منزہ سہام السلام علیکم! میرے پاس وقت نہیں۔ ان لوگوں سے نفرت کرنے کا جو مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ کیونکہ میں مصروف رہتا ہوں ان لوگوں میں جو مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ منزہ آپی! ہم جیسے محبتیں ڈھونڈنے اور محبتیں بانٹنے والے شخص کا دل آپ کی محبت، خلوص اور دعائیں پا کر باغ باغ ہو گیا۔ ’’احوال‘‘ میں آپ کی ہمیشہ ہمارے ساتھ رہنے کی خوش خبری سُن کر دل مسرت سے لبریز ہو گیا۔ آپی، ہماری تمام محبتیں، چاہتیں، خلوص، ہمارا وقت، ہماری دعائیں سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ آپ کے ذریعے آپ کے پیارے ابو کے لگائے اس گلشن کو سدا ہرا بھرا اور سلامت رکھے۔ ناصر رضا کے ’’یقین‘‘ پر ہم نے خلوصِ دل سے یقین کیا۔ ’’احوال‘‘ میں اکثر لوگوں کو شکایتیں کرتے ہوئے پایا کہ ان کی کہانیاں شائع نہیں ہو رہی ہیں۔ میری ان تمام احباب کو صبر کی تلقین ہے کیونکہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ تحسین جونیجو ہماری بہت پیاری اور لاڈلی بہنا ہے۔ اس کے لیے بہت سی دعائیں۔ ’’محفلِ دوستاں‘‘ کی ہمیں بھی شدید کمی محسوس ہوتی ہے مگر ادارے کی اپنی کچھ پالیسیاں اور مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ہم ہر حال میں آپ کے ساتھ ہیں منزہ آپی۔ ’’سرمایۂ قلم و قرطاس‘‘ میں اپنے پیارے سہام انکل کی جدوجہد کی داستان پڑھ کر دل خوش ہوا۔ سہام انکل کی جدوجہد جب بھی پڑھتے ہیں ان کی عظمت اور اولوالعزمی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ مہدی حسن کے بارے میں جتنا بھی لکھا جائے، کم ہے۔ کیونکہ ایسا فنکار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ’’شہید کی ڈائری‘‘ پڑھ کر آنکھیں آنسوؤں سے چھلک اٹھیں۔ ’’موچی بابا‘‘ میں کہانی نام کی کوئی چیز نہ تھی لیکن ایک حقیقی جیتے جاگتے کردار کی بھرپور عکاسی تھی۔ ’’بھٹکنے سے ذرا پہلے‘‘ اچھی کہانی تھی۔ شکیلہ کا کردار پسند آیا۔ سپنا عباسی کی ’’دیر ہے اندھیر نہیں‘‘ پسند آئی۔ حسینہ کا صبر کام دکھا گیا اور اسے جائز حق مل گیا۔ نازنین رضا کی ’’تلافی ہو نہیں سکتی‘‘ بہت خوب صورت تحریر رہی۔ کاش کشمالہ کا بھائی انتقام کی بجائے معاف کرنے کو ترجیح دیتا۔ کرن شبیر کی ’’سائبان کوئی نہیں‘‘ ایسی عورت کی کہانی ہے جس نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری۔ نگہت عائشہ کی موبائل کہانی ’’اک آرزوئے طفلانہ‘‘ اچھی لگی۔ ارم زہرا کی ہر تحریر زبردست ہوتی ہے۔ ’’شک کا بیج‘‘ بہت پسند آئی۔ رخسانہ سہام آنٹی کی ’’یادوں کے اوراق‘‘ کا پہلا حصہ بہت زبردست رہا اور اب اس خوب صورت بات کے ساتھ اجازت کہ ’’ہمیشہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرو، کیونکہ انسان بڑے بڑے پہاڑوں سے نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ٹھوکر کھا کر گرتا ہے۔‘‘

☆رؤف بھائی! اللہ آپ کو اچھا رکھے، کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ۔ ’’شہید کی ڈائری‘‘ آپ کو اچھی لگی، یہ مجھے اچھا لگا۔

✉ محمد ولی ہمدرد، بکن کرم ایجنسی سے۔ ’’محترمہ منزہ آپی السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ ’’سچی کہانیاں‘‘ کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ میری طرف سے ناصر رضا اور راجہ محمود کو اسپیشلی دعا و سلام۔ سلام کے بعد اس پیاری سی محفل میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ امید کرتا ہوں کہ اُسے ضرور شائع کریں گے کیونکہ ’’سچی کہانیاں‘‘ کی جتنی بھی تعریف کی جائے اتنی ہی کم ہے۔ کیونکہ یہ بہت اعلیٰ معیار کا حامل ڈائجسٹ ہے۔ ویسے ڈائجسٹ تو بہت سارے ہیں لیکن ’’سچی کہانیاں‘‘ جیسا ڈائجسٹ نہیں کیونکہ اس کی ساری کہانیاں اچھی اور سچی ہوتی ہیں۔ میرا چھوٹا بھائی محمد شعیب وفا ’’سچی کہانیاں‘‘ کا پرانا قاری ہے۔ برائے مہربانی پُراسرار نمبر جلد شائع کریں کیونکہ مجھے پُراسرار، چڑیل، جن، آسیبی، روح، بدروح، خوفناک، پریشانی اور ڈراؤنی کہانیاں بہت زیادہ پسند ہیں۔ ’’احوال‘‘ کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ پرچہ بہت لیٹ ملتا ہے لیکن ساری تحریریں بہت عمدہ اور اچھی ہیں۔ آخر میں میری طرف سے منزہ صاحبہ کو اور سارے اسٹاف کو دعا و سلام۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آباد اور سلامت رکھے، آمین ثم آمین۔‘‘

☆ولی بھائی! آپ کا خط ملتے ہی جواب دے ڈالا۔ آپ اتنی دور سے خط لکھ رہے ہیں یہ جان کر بہت اچھا لگا۔ اب ہر ماہ ’’احوال‘‘ میں آپ کا انتظار رہے گا۔

✉ طاہرہ جبین کراچی سے۔ ’’پیاری سی بہن منزہ سہام مرزا، السلام علیکم! عرض یہ ہے کہ پہلے تو میں آپ سب کی

احوال

اگست 2012ء

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر سیر حاصل تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا / کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام اور مکمل پتا:..

....

ماہنامہ سچی کہانیاں MINI MAG

اگست 2012ء

میں اپنی پسند کا تراشہ بھیج رہا / رہی ہوں جسے میں نے ....

نامی کتاب کے صفحہ نمبر .... سے اتارا ہے۔

میرا نام و پتا: ....

....

اپنی اپنی پسند

اگست 2012ء

میرا پسندیدہ شعر الگ کاغذ پر ہے اسے شائع کر دیں

....

....

....

شاعر: ....

شعر بھیجنے والے کا نام: ....

پتا: ....

بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے اس کارواں میں شریک سفر بنایا۔ انشاء اللہ اب اس سفر میں آپ کے ساتھ چ
چاہوں گی اور آپ نے میری تحریر کو اس قابل سمجھا اور ماہ نامے کی زینت بنایا اور میری حوصلہ افزائی کی اور میں پڑھے
والے قارئین کی بھی بہت بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے میری تحریر کے لیے اپنی رائے دی جس کے نتیجے میں میری تحر
چھٹے انعام کی حقدار قرار پائی۔ ”سچی کہانیاں“ میں مدت سے پڑھ رہی ہوں۔ میں ہی نہیں بلکہ میری سب بہنیں بھی شوق
سے پڑھتی ہیں۔ اس شمارے میں انیلہ امام بخش کی تحریر ”دہلیز کے پار“ ”اللہ کی عدالت“ بشیر احمد بھٹی، سپنا عباسی کی تحریر
دل کو چھو جانے والی تھیں۔ نسرین نکہت کی تحریر ”بھابی ماں“ رشتوں کی مان توڑنے کی سزا پانے کا سبق دیتی ہے۔ ویسے
میں ”سچی کہانیاں“ کی پوری ٹیم کی شکر گزار ہوں آپ سب کا اخلاق بہت اچھا ہے اور خاص کر میرے محترم بزرگ بھائی
ناصر رضا جن سے میں ذاتی طور پر مل چکی ہوں۔ ان کا حوصلہ افزائی کرنے کا طریقہ بہت شفیق ہے۔ ناصر سر! آپ
وعدہ کیا تھا کہ آئندہ شمارے میں آپ میری تحریر ضرور شائع کریں گے۔ آپ سب کی دُعا کی طلب گار ہوں۔ اللہ حافظ“

☆ طاہرہ جبین! ہنستی مسکراتی رہو، میں سمجھ سکتی ہوں کہ کام کرنے کے لیے جب انسان باہر نکلتا ہے پھر اپنے شوق
بھی لکھنے پڑھنے والے شوق پورے کرنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہر حال ہم اور تم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں خوب دل لگا
نوکری کرو اور خوب جان لگا کر کہانیاں لکھو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اپنی تمام بہنوں کو ہمارا پیار دینا۔

✉ قرۃ العین زینب ملتان سے۔ ”ڈیئر منزہ جی، السلام علیکم! پوری امید ہے کہ آپ بالکل خیر خیریت سے ہوں گی۔ اس
بار ماشاء اللہ سے مجھے مہینے کی ابتداء میں ہی نیا شمارہ مل گیا اور انشاء اللہ میں بروقت تبصرے کے ساتھ ”احوال“ میں شامل
سکوں گی۔ ٹائیٹل بہت خوب صورت تھا۔ جولائی کے تپتے ہوئے موسم میں تازہ پھولوں سے سجی پیاری سی ماڈل نے دل خوش
کر دیا۔ ”سرمایۂ قلم و قرطاس“ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ انکل سہام کی زندگی جدوجہد سے بھرپور رہی۔ ایسی ہمت و حوصلہ زندگی
راستے کے لیے ایندھن ثابت ہوتی ہے اور مشکلوں سے لڑنے کا عزم پیدا ہوتا ہے۔ راجہ محمود نے خوب صورت الفاظ
پیراہن میں روداد کو جاندار بنا ڈالا تھا۔ اللہ انکل کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہمیشہ اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھ
آمین۔ ”میرا آشیاں کہاں ہے“ پڑھ کر عدن پر مجھے تو بالکل ترس نہیں آیا۔ اُس نے بھروسہ اور اعتماد توڑا تھا اور اُس کی سزا
اِس پر لازم تھا مگر ایسی صورت حال میں لڑکی کو مظلوم قرار دینا غلط ہے۔ اس وجہ سے کہانی میرے دل کو نہیں لگی۔ ”بھابی ماں
پڑھ کر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دو احادیث یاد آئیں کہ ”شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے“ اور ”دیور موت ہے“۔ ”موچی بابا
اس طبقے کی کہانی ہے جس کی تکلیفوں اور احساسوں کو ہم صرف دور سے دیکھتے ہیں، محسوس نہیں کرتے۔ ”دیر ہے اندھیر نہیں
میں حسینہ کے صبر نے میدان مار لیا۔ وقت جتنا بھی مشکل ہو گزر ہی جاتا ہے۔ ”دہلیز کے پار“ سبق آموز کہانی تھی۔ ”تلافی
نہیں سکتی“ میں عابد کو اس کے کیے کی سزا رب کی طرف سے مل گئی تھی۔ ”سائیاں کوئی نہیں“ میرے نزدیک عنزہ کا اتنا قصور نہیں
تھا جتنا کہ کمیل کا تھا۔ ”ایسے بھی ہیں جہاں میں“ بے حد پسند آئی۔ اللہ تعالیٰ واقعی دیکھ کر عطا کرتا ہے اور خلوص کبھی رائیگاں نہیں
جاتا۔ اتنی اچھی کہانی تھی، پڑھ کر بہت لطف آیا۔ ”شک کا بیج“ پڑھ کر بہت حیرت ہوئی کہ اتنی عقل کی اندھی لڑکیاں بھی ہو سک
ہیں۔ ”برف زار“ کا دوسرا حصہ بھی خاصا دلچسپ تھا۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ ابھی کافی کہانیاں اور سلسلے پڑھنے باقی ہیں۔ ویسے ایک
بات بہت اچھی لگی کہ اب کہانیوں کی تعداد پہلے کی نسبت ماشاء اللہ زیادہ ہوتی ہے اور کہانیوں کا معیار بھی اعلیٰ ہے۔ سلسلے میں
ابھی پڑھ نہیں سکی مگر مجھے علم ہے کہ ان سب کی ہی سنسنی اُسی طرح ہوگی۔ ناصر بھائی کو اسپیشل سلام اور اللہ ان کو مکمل و کامل صحت
عطا کرے۔ ایک شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گی، کوئی بات بُری لگی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔

فقط اک کا ہونے میں ہی حسن بندگی ہے غالب
جو روز قبلہ بدلتے ہیں وہ بے دین ہوتے ہیں

☆ زینب! تمہارا تفصیلی خط پورا پڑھا، اچھا لگا۔ مگر چھاپنے سے پہلے کچھ کچھ کاٹ چھانٹ تو کرنی پڑتی ہے سو کر دی
تمہاری بات تو ہمیں بری لگ ہی نہیں سکتی کیونکہ تم ہماری اپنی جو ہو۔

✉ مریم شاہ شمالی سرگودھا سے۔ ”محترمہ منزہ سہام، السلام علیکم! اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کو ہر لمحہ اپنی حفظ
امان میں رکھے، آمین۔ جولائی کا شمارہ ملا۔ سرورق بہت نائس اور بیوٹی فل تھا۔ ماڈل بھی پیاری تھی۔ ناصر چاچو کا اداریہ ”یقین

اچھا لگا۔ بے شک خدا تعالیٰ ہی بہترین کارساز ہے۔ ''احوال'' میں احوالیو سے ملاقات زبردست رہی۔ ''سرمایۂ قلم وقرطاس'' سہام مرزا کی زندگی کے متعلق جان کر بہت اچھا لگا۔ ایسے لوگ جہاں میں کم ہی پیدا ہوتے ہیں وہ اقبالؒ نے بھی تو فرمایا ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

واقعی سہام صاحب آہنی حوصلے کے مالک تھے۔ ان کی جہدِ مسلسل کی روداد پڑھتے ہی ہونٹوں پر یہ شعر مچل اُٹھا

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پہ ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

مرحوم مہدی حسن پر ناصر رضا کی خصوصی تحریر زبردست رہی۔ دنیائے موسیقی میں مہدی حسن کا نام ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے، آمین۔ سلسلے وار کہانیوں میں سب سے زبردست اور نمبرون سلیم فاروقی کی کہانی ''آتشِ جنوں'' ہے۔ بہت مزہ آتا ہے ان کی کہانیاں پڑھ کر۔ ''گردشِ رنگِ چمن'' حنیف سحر، جتنی جلدی ہو سکے اس کو مکمل کریں۔ فاطمہ بلگرامی ''جن آنکھوں میں خواب بسے تھے'' بہت سلو ٹیمپو چل رہا ہے پلیز تھوڑا تیز کریں۔ پہلے والا مزہ نہیں رہا۔ ''ناشون'' شازلی سعید مغل اچھی جارہی ہے۔ اب بات ہو جائے آنٹی رخسانہ سہام مرزا کے ''یادوں کے اوراق'' کی۔ بہت اچھا لگا۔ بہت مزہ بھی آیا۔ خاص طور پر ان کے بچپن کی شرارتوں کو جان کر۔ کتنا خوب صورت اور دلکش دور ہوتا ہے بچپن کا...... بے فکری...... محبتیں اور منافقت سے عاری...... خلوص اور معصومیت کا امتزاج...... کاش! ہم بچے ہی رہتے۔ آنٹی جی کی خدمت میں محبت بھرا اسلام۔ مستقل سلسلوں میں ''شہید کی ڈائری'' زبردست اینڈ زبردست۔ اللہ کرے منزہ صاحبہ آپ اپنے قلم سے یونہی حقِ محبتِ وطن ادا کرتی رہیں۔ آپ کی ڈائری کے لیے ''روشنی'' انتخاب رضوانہ کوثر اور ''بزم آرائی'' میں محسن نقوی کی غزل، انتخاب اشعر جواد بہت پسند آئے۔ ''پسند اپنی اپنی'' میں تقریباً تمام اشعار ہی اچھے تھے۔ خیال آرائی میں ''محبت'' فرحت صدیقی کی تحریر اچھی لگی۔ سفرنامہ اور کتاب ''ایک تھا بادشاہ'' پر عکاشہ سحر کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ ''بازگشت'' ہر بار کی طرح لاجواب اور بہترین۔''

☆ سوئیٹ مریم! کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ دیکھو۔ تمہاری تنقید ہم نے بلا روک ٹوک جانے دی جو دل چاہے بھیجو اور ایک فون کر کے ناصر بھائی سے پوچھ لیا کرو کہ کب چھاپ رہے ہیں۔

✉ کرن شبیر کراچی سے۔ ''پیاری اپیا منزہ جی السلام علیکم! امید ہے کہ آپ ''سچی کہانیاں'' کا اسٹاف اور قارئین حضرات بالکل خیریت سے ہوں گے۔ انکل ناصر رضا کو بے حد سلام۔ جولائی کا شمارہ بذریعہ ڈاک ملا۔ اپنی کہانی دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی لیکن میری باقی کہانیاں، ان کا کیا بنا؟ سرورق بہت حسین لگا۔ ناصر رضا نے ''یقین'' بہت خوب لکھا۔ ''احوال'' میں سب ایک سے بڑھ کر ایک خط تھے۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ زندہ کہانی، سہام مرزا واقعی سرمایۂ قلم تھے۔ ان کے بچپن سے لے کر ان کی زندگی میں آنے والی اتنی بڑی مشکلات کے بارے میں جان کر بہت ہی افسوس ہوا تھا لیکن وہ بہت ہی ہمت والے انسان تھے۔ اللہ اُن کے درجات بلند کرے، آمین۔ مہدی حسن کے بارے میں کافی مفصل قسم کا مضمون دیا ناصر جی نے۔ روشانے کی کہانی پڑھ کر میں بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کیا واقعی عورت کا کوئی گھر نہیں، کوئی ایسا ٹھکانا نہیں جسے وہ بلا شرکت غیرے حق سے اپنا کہہ سکے؟ شاعری سب کی ہی پسند آئی۔ ''خیال آرائی'' میں سب کے خیالات اچھے لگے۔ عکاشہ کے تبصرے مجھے بہت پسند ہیں۔ کچھ نگارشات ارسال کر رہی ہوں۔ بتائیے گا ضرور کہ قابلِ اشاعت ہیں یا نہیں اور اپیا ''محفلِ دوستاں'' کیوں ختم کر دیا؟ میری پرانی کہانیاں کب تک شائع ہوں گی؟ ناصر انکل نے کہا تھا کہ تھوڑی سی محنت کے بعد ہم شائع کر دیں گے۔ میرے پیپرز بھی ہونے والے ہیں۔ ان کے لیے بھی دعا کیجیے گا۔ خط خاصا طویل ہو گیا ہے۔ امید کرتی ہوں شائع ہو جائے گا۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ ادارہ ''سچی کہانیاں'' کے لیے ڈھیروں دعائیں اور پیار۔ اللہ حافظ۔''

☆ ڈیئر کرن! کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ تمہیں اپنے خط کی طوالت کا احساس تھا دیکھو ہم نے خط چھوٹا کر دیا۔

✉ ام عادل سہراب گوٹھ' کراچی سے۔ ''محترمہ منزہ جی، السلام علیکم! جولائی کا شمارہ سامنے رکھا ہے۔ پورے شمارے میں صرف اپنا خط دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ نہ کہانی نہ خیال آرائی۔ آپ کے محبت بھرے جوابات کے بعد کھل کر شکوہ

کرنے کی گنجائش بھی نہیں رہتی مگر پھر خیال آتا ہے شکوہ بھی تو اپنوں سے ہی کیا جاتا ہے کسی راہ چلتے سے تو شکوہ ہو نہیں سکتا۔ کہانیاں اگر قابلِ اشاعت نہیں تو بھی دو لفظوں میں مطلع کر کے انتظار کی سولی سے اُتار دیجیے۔ ''فلک ٹائمز'' میں بھی آپ نے ہمارے کالم لکھنے کے شوق کو بجائے بڑھانے اور ہماری رہنمائی نہ کر کے ختم ہی کر دیا۔ کالم پہلی دفعہ لکھا تھا۔ یقیناً بہت سی خامیوں سے پُر ہو گا۔ انکل سہام مرزا کی جہدِ مسلسل کی روداد راجہ محمود کے قلم سے اور ناصر رضا کے قلم سے مہدی حسن صاحب پر خصوصی تحریر بھرپور اور معلومات افزا تھیں۔ اس کے علاوہ محمد اقبال زمان کی تحریر ''ظلم کی آگ'' ارم زہرا کی ''شک کا بیج'' انیلہ کی ''دہلیز کے پار'' سپنا عباسی کی ''دیر ہے اندھیر نہیں'' ہی پڑھ پائی ہوں۔ تمام تحریریں لاجواب ہیں اور محترمہ رخسانہ سہام کے ''یادوں کے اوراق'' عہدِ رفتہ کی یادوں کا خزانہ ہے۔ اتفاق ہے کہ میرا بچپن بھی پی آئی بی کی گلیوں میں گزرا ہے۔ سلسلے وار کہانیاں یقیناً حسبِ سابق بہترین ہی ہوں گی، ابھی پڑھی نہیں اب اجازت دیجیے، خدا حافظ۔''

☆ ام عادل! بہت اچھا لگا تم نے ہمیں اپنا مان کر شکوہ کیا۔ کہانیاں کب چھپے گی اس بارے میں تو تم ایک فون کر کے پوچھ سکتی ہو۔ اخبار کا دفتر اور اسٹاف الگ ہے اور دور بھی۔ میں ایڈیٹر کے معاملات میں دخل اندازی کا اختیار نہیں رکھتی۔ یار سمجھا کرو نا اخبار کے حالات بالکل الگ ہوتے ہیں۔ کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ اور یہ کیا لکھ دیا کہ میرا بچپن پی آئی بی کی گلیوں میں گزرا ہے ابھی گزرا کہاں ہے، چلو خوش ہو جاؤ۔

✉ تحسین جونیجو خیر پور ناتھن شاہ سے۔ ''پیاری آپی منزہ، السلام علیکم! نیک تمنائیں آپ اور اسٹاف کے نام۔ لو بھئی محبت کا امتحان شروع، جانتے ہیں محبت ثبوت مانگتی ہے اور اس پر پورا اترنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ کیا ہے آپ کہ محفل دوستاں نہ سہی لیکن تبصرہ کے ساتھ ساتھ ہم کچھ دوستوں سے ''احوال'' میں ہی گپ شپ کی اجازت دے دیں تو بھی چلے گا۔ خالق بھٹی بھائی ہم بڑے ہوشیار ہیں ناں؟ بس جی کبھی غرور نہیں کیا ہاہاہاہا۔ ٹائیٹل اچھا رہا، پر ماڈل کا میک اپ نہیں بھایا۔ اس بار اداریہ ناصر انکل نے پیش کیا۔ اچھا لگا اور خوشی بھی ہوئی۔ ارشد علی ارشد بھائی کو ''احوال'' میں دیکھ کر خوشی ہوئی اور آپ کے ناول ''ملھنی'' کا بھی انتظار ہے تاکہ ہماری رائے جاننے کا آپ کو انتظار بھی نہ کرنا پڑے۔ خوش رہیے۔ اب باری کہانیوں کی۔ انکل سہام مرزا ''سرمایۂ قلم وقرطاس'' کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا۔ ایسی ہی تحریروں کو ہم پڑھنا چاہتے ہیں۔ خاص کر اپنے رائٹرز کی، بہت خوب راجہ محمود صاحب۔ ناصر رضا انکل نے مہدی حسن کی خوب صورت یادیں شیئر کیں۔ بے حد پسند آئی، خوش رہیے۔ رخسانہ آنٹی کی ''یادوں کے اوراق'' سے بھی بہت لطف اندوز ہوئے، باقی کا انتظار ہے۔ رضیہ علمدار کی کہانی انتہائی اچھی رہی۔ انیلہ امام بخش نے اچھا میسیج دیا۔ موبائل کہانی نگہت عائشہ کی سبق آموز رہی۔ ''شک کا بیج'' ارم زہرا سبق آموز کہانی لائیں۔ سب سے خوب صورت جو کہانی لگی وہ ہے انکل سلیم اختر کی ''بھٹکنے سے ذرا پہلے''۔ صابرہ کا پاکیزہ کردار بے حد بھایا۔ پڑھتے ہوئے جیسے سکون مل رہا تھا۔ اس قسم کی کہانیوں کی تعداد میں اضافے کی اشد ضرورت ہے۔ کاشی بھائی کے خیالات اچھے رہے۔ واضح بھی لگ رہا تھا کہ کس کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ عبدالروف عدم بھائی اتنے عرصے بعد آپ کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ خوش رہیے۔ آپی جی اب اجازت کہ آنکھیں بہت تھکی ہوئی ہیں۔ مزید کی اجازت نہیں دے رہیں۔''

☆ سوئیٹ سی تحسین! تمہارا جملہ بہت اچھا لگا۔ ''لو بھئی محبت کا امتحان شروع'' خوش رہو اور یار چھوڑو محفل دوستاں کو ہماری ہی محفل میں آتی رہو...... ہم بھی تمہارے منتظر رہتے ہیں۔ کہانیاں اچھی لگیں یعنی محنت وصول ہوئی۔

✉ حنا بشریٰ لاہور سے۔ ''منزہ صاحبہ، السلام علیکم! میرا تعارف یہ ہے کہ میں بالکل نئے لکھنے والوں میں ہوں۔ پچھلے مہینے کے رسالے میں میری کہانی ''اک ٹیس سی ہے اُٹھتی'' شائع ہوئی، جس پر میں بہت شکر گزار ہوں رسالہ ''سچی کہانیاں'' کی جنہوں نے میری تحریر کو اس قابل سمجھا۔ یہ رسالہ ہی میرا استاد ہے۔ میں نے اسی سے لکھنا سیکھا اور قارئین کا بھی بہت شکریہ جنہوں نے میری کاوش کو سراہا۔ خاص کر میں محمد رضوان قیوم کا شکریہ ادا کروں گی جنہوں نے میری کہانی پر اس انداز میں حوصلہ افزائی کی کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اس رسالے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ میں نے باقی تمام ڈائجسٹ پڑھنا چھوڑ دیئے لیکن ''سچی کہانیاں'' اس قدر اچھا رسالہ ہے کہ میں اس کو چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میری تحریر کو پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ اب ایک نظر کہانیوں پر، ساری ہی تحریریں لاجواب تھیں۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ''گولڈن ہارٹ'' کے عنوان سے شائع ہونے والا مضمون بہت ہی شاندار تھا۔ تحریروں میں نازیہ بتول کی ''زیست

پچھتاوا بنی‘‘ آصفہ اقبال بلوچ کی ’’اماں جی‘‘ اور علی صبا کی ’’بے زبان محسن‘‘ بہت ہی شاندار تھی۔ میں نے کچھ اور بھی تحریریں ارسال کی ہوئی ہیں۔ امید ہے کہ وہ بھی جلد رسالے میں جگہ حاصل کر پائیں گی۔‘‘

☆ ڈیئر حنا! خط لکھنے کا شکریہ تم اب چاہو بھی تو ہم تمہیں ’’سچی کہانیاں‘‘ سے اور اپنے سے دور ہونے ہی نہیں دیں گے۔ پابندی سے خط لکھا کرو۔

✉ شفق شیکی، سیالکوٹ سے۔ ’’ایڈیٹر خالہ السلام علیکم اور ایڈیٹر چچا آپ کی اور آپ کے تمام معاون دوستوں کی خیریت مطلوب ہے۔ اعزازی پرچے بطور تحفہ بھیجنے کا بے حد شکریہ۔ محفل خوشبو سے بھری پڑی ہے۔ جب میں پیارے جریدے کی محفل میں داخل ہوئی تو احوال مختلف چٹ پٹے اور خوب صورت خطوط سے سجا بیٹھا تھا۔ سرورق شوخ اور چنچل تھا۔ بہت اچھا لگا۔ ’’سڑک کہانی‘‘ بہت بہترین ہے۔ ’’گولڈن ہارٹ‘‘ بہت خوب صورت لفظوں اور بہترین مواد کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔ بہت پسند آئی۔ ’’برف زار‘‘ شاندار عنوان کے ساتھ بڑے مختلف سفر پر لے پہنچا ہے۔ ’’انسان یا درندے‘‘ خون میں رنگی سخت دکھی کر گئی۔ زیست پچھتاوا بنی، خوشبو کے ہمسفر، بے زبان محسن اور فریبِ زندگی بھی بہت بہترین کہانیاں تھیں۔ جون کا شمارہ ابھی تک اتنا ہی زیرِ مطالعہ آیا ہے۔ اور تبصرہ اتنے مطالعے پر حاضر ہے۔ ایک شعر کے ساتھ اجازت

روشنی میں اندھیرا پھیلنے لگا ہے

شاید...... آس کا دیا مرنے لگا ہے

☆ بہت ہی پیاری شفق! خوش رہو، تم خوش ہوتی ہو تو ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔ جلدی جلدی شمارہ پڑھ کر رائے دے دیا کرو۔

☆ ارشد بھائی خوش آمدید! آپ کی رائے سر آنکھوں پر۔ رفتہ رفتہ کوشش کریں گے کہ سب پر عمل ہو سکے۔ ہمارے لیے ہمارا ہر لکھاری اور احوالی بہت اہم ہے مگر آپ تو FounderMember ہیں۔ آپ کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ سارے پرانے ساتھیوں کو آپ ہی آواز دے ڈالیں۔ وہ بھی میرے ساتھ ہوں گے تو بہت اچھا لگے گا۔ ارشد بھائی! شمارے میں جو سلسلے چل رہے ہیں اس میں سب لکھنے والے شرکت کر سکتے ہیں جس کی کہانی اچھی ہو گی وہ ضرور شائع ہو گی۔ آپ کا خط میں نے اپنی فائل میں لگا لیا ہے، مجھ سے رابطے کا سب سے اچھا ذریعہ خط ہے۔ وہ مجھ تک ضرور پہنچتا ہے۔ آج کل مصروفیت کچھ ایسی ہیں کہ آدھا دن آفس سے باہر ہی گزر جاتا ہے۔ امید ہے آپ محفل میں اپنی حاضری پابندی سے لگواتے رہیں گے۔

اس ماہ کا خصوصی خط



✉ فرید عالم نقشبندی کراچی سے۔ ’’سچی کہانیاں‘‘ کے روشن ستارو! آپ سب کو سلام! جولائی کا شاہکار لاجواب اور بے مثال بن کر دل میں خوشبو کی طرح چھا گیا۔ ’’احوال‘‘ میں 34 تبصرے اور 23 کہانی نگاروں‘ اس کے علاوہ خیال آرائی، آپ کی ڈائری، پسند اپنی اپنی، نظمیں، غزلیں دوستوں آپ سب نے اپنی اپنی صلاحیت، محنت، محبت، خوش مزاجی سے ثابت کر دیا کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ آپ سب کو بمع اسٹاف کو عقیدت بھرا اسلامِ محبت کا سلوٹ پیش کرتا ہوں۔ منزہ آپی اور تمام ساتھی میری پکار میں ساتھ دیں کہ پرانے ساتھی جہاں کہیں بھی ہوں اس محفل میں آ جائیں۔ فرید عالم نے ناقابلِ ضمانت گرفتاری وارنٹ جاری کر دیے ہیں۔ ہوشیار باش، آپی اب میری رگِ شرارت پھڑک اُٹھی ہے۔ اب کہانی تیار کر رہا ہوں۔‘‘

☆ فرید بھائی! مبارک مبارک! اس بار بہترین خط کا میڈل آپ کے گلے میں، اب اگلی بار محفل میں مٹھائی کے ساتھ آیئے گا۔

پھر ملیں گے گر خدا لایا

منزہ سہام



راجہ محمود

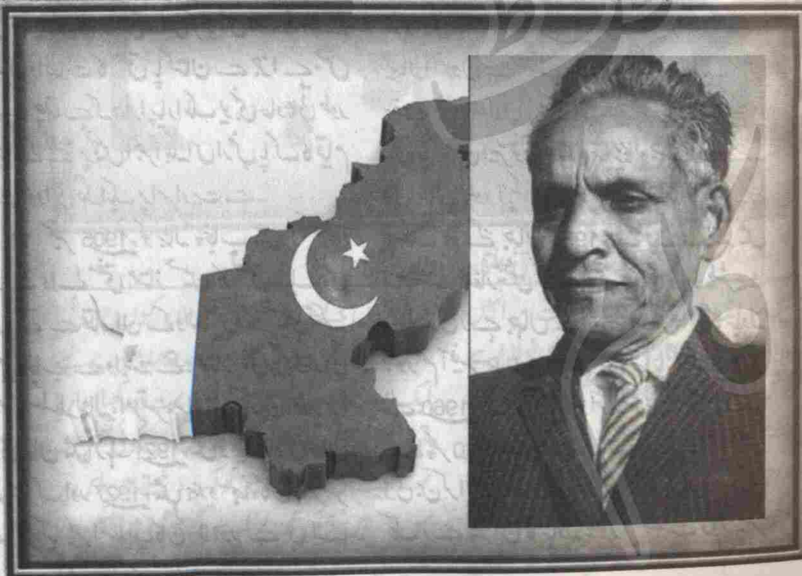


اسرارِ پاکستان

وہ بڑی ہستیاں کون تھیں جو پاکستان کا غم کھانے پر مامور تھیں؟ پاکستان میں کیا خصوصیت ہے کہ بڑی ہستیاں اس پر مامور ہیں؟ خواجہ صاحب کی بات مہمل نظر آتی تھی۔

پاکستان کی دلچسپ اور پراسرار روداد، ممتاز مفتی کی زندہ کہانی

ہمارے اردگرد بے شمار موضوعات بکھرے پڑے ہیں جن پر بہت کچھ کہا جاتا ہے، لکھا جاتا ہے، بحثیں ہوتی ہیں، دلائل دیئے جاتے ہیں، علمی نکتے اٹھائے جاتے ہیں، دوسروں کا نقطۂ نظر سنا جاتا ہے، اپنا بیان کیا جاتا ہے پھر اس سنجیدہ مشق سے مجموعی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے مگر



بات جب پراسرار واقعات کی ہوتی ہے تو اس موضوع کو اَن پڑھ یا کم پڑھے لکھے لوگوں سے منسوب کر دیا جاتا ہے کہ میاں' یہ سب جاہلانہ باتیں ہیں۔ عقل کو حیران کر دینے والے معاملوں کو جھوٹے قصے کہانیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی اور جو ان باتوں پر یقین کرتے ہیں' اسے جاہل گردانا جاتا ہے' اس کا مذاق بنایا جاتا ہے' اسے کم عقل اور کمزور عقیدہ جیسے القابات سے نوازا جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے' صرف ناخواندہ افراد ہی سے پراسرار واقعات کو نتھی کرنا درست نہیں بلکہ بڑے بڑے دانشور قسم کے لوگوں کے ساتھ بھی ایسا کچھ پیش آچکا ہے جس پر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ممتاز مفتی ہمارے ملک کے نامور ادیب و دانشور ہیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت ان کے ساتھ کچھ حیرت انگیز واقعات پیش آئے تھے جنہیں انہوں نے اپنی ایک تحریر میں قلم بند کیا ہے۔ مذکورہ تحریر پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا مظاہر العجائب ہے جہاں بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جس کی کوئی عقلی یا علمی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔ اس تحریر میں ہونے والے پراسرار واقعات کا تعلق پاکستان سے جڑا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارا پیارا ملک یونہی حادثاتی طور پر دنیا کے نقشے پر نہیں ابھرا بلکہ اس ارضِ پاک کا قیام بذاتِ خود اپنی جگہ ایک پراسراریت ہے۔

11 ستمبر 1905ء کو بٹالہ' پنجاب میں آنکھیں کھولنے والے مفتی ممتاز حسین کا تعلق ایک علمی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد مفتی محمد حسین محکمۂ تعلیم پنجاب سے وابستہ تھے۔ ممتاز مفتی کی ابتدائی تعلیم کا سلسلہ بٹالہ، امرتسر، میانوالی، ملتان اور ڈیرہ غازی خان میں رہا۔ 1921ء میں ڈیرہ غازی خان سے میٹرک اور 1927ء میں ہندو سبھا کالج امرتسر سے انٹر کیا پھر اسلامیہ کالج، لاہور سے بی اے کرنے کے بعد سینٹرل ٹیچرز ٹریننگ کالج میں داخلہ لیا۔ ٹریننگ کے بعد محکمہ تعلیم پنجاب کے سینئر انگلش ٹیچر کے طور پر پنجاب کے کئی شہروں کے اسکولوں میں پڑھاتے رہے۔ تدریس کا یہ دور 1933ء سے 1945ء تک تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی ان کا رخ ادب کی جانب ہو گیا تھا۔ سید فیاض محمود اور مجید ملک جیسے دوستوں نے ان میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1934ء میں جب ان کی ملاقات ن م راشد سے ہوئی تو ان میں لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ ابتدائی دو مضامین گوجرہ ہائی اسکول کے جریدا اور رسالہ ''نخلستان'' لاہور میں شائع ہوئے۔ 1944ء میں وہ بطور اسکرپٹ رائٹر آل انڈیا ریڈیو، لاہور سے منسلک ہو گئے جہاں ان کی ملاقات اداکار کمار اور ان کی اداکارہ بیگم پرمیلا سے ہوئی۔ ان دونوں کی فرمائش پر وہ ''سلور فلمز''، ممبئی سے منسلک ہو گئے۔ اس ادارے میں کرشن چندر اور میرا جی کے ساتھ قیام رہا اور سلور فلمز کے تحت فلم ''رضیہ سلطانہ'' کی کہانی لکھی مگر یہ فلم بٹوارے کی نذر ہو گئی۔ ممتاز مفتی 1947ء میں واپس لاہور آ گئے۔ یہاں انہوں نے مختلف ملازمتیں کیں۔ ایک برس ہفتہ وار ''استقلال'' کے سب ایڈیٹر رہے۔ 1949ء میں پاکستان ایئر فورس میں سائیکالوجسٹ ہو گئے۔ اسی سال بطور اسکرپٹ رائٹر ریڈیو آزاد کشمیر سے منسلک ہو گئے جہاں 1951ء تک رہے۔ بعد میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر، کشمیر پبلسٹی ڈائریکٹریٹ راولپنڈی رہے جہاں سے 1957ء میں ان کا تبادلہ بطور فلم آفیسر D.A.F.P کراچی کر دیا گیا۔ 1958ء سے 1960ء تک ویج ایڈ ڈائریکٹریٹ کراچی میں رہے پھر 1960ء میں قدرت اللہ شہاب کے او ایس ڈی بن کر ایوانِ صدر راولپنڈی آ گئے جہاں 1963ء تک رہے پھر ان کا تبادلہ بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر

وزارتِ اطلاعات، راولپنڈی کر دیا گیا جہاں 1965ء تک کام کیا۔ 1965ء سے 1966ء تک او ایس ڈی، وزارتِ اطلاعات رہے اور 1966ء میں ریٹائر ہو گئے۔ آخری زمانے میں وزارتِ اطلاعات اور براڈ کاسٹنگ سے تعلق رہا۔

ممتاز مفتی نے کئی افسانوی مجموعے اور کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کی مطبوعہ کتب کے علاوہ لاتعداد ریڈیائی ڈرامے، ریڈیائی فیچر، نثری تقریریں، مضامین اور خاکے غیر نثری صورت میں بکھرے ے ہیں۔ اعلیٰ ادبی اور علمی خدمات پر انہیں ومت پاکستان نے ستارۂ امتیاز سے بھی نوازا ہے لکہ ''نقوش'' ادبی ایوارڈ کا اعزاز بھی ان کے حصے ں آچکا ہے۔

مندرجہ بالا مختصر خاکے سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا تا ہے کہ وہ کتنی بڑی علمی، ادبی شخصیت تھے۔ اب ن کی شخصیت، علم اور دانشوری کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی یہ تحریر پڑھیے اور غور کیجیے کہ کیا دنیا میں ہونے والے پراسرار واقعات محض ذہنی اختراع یا نفسیاتی مسئلہ ہے یا پھر اس جہانِ رنگ و بو میں کوئی ایسا عالم بھی ہے جہاں تک ہماری نظروں کی پہنچ ممکن نہیں ہے؟

•......•......•......•

''جس زمانے میں پاکستان کے قیام کے لیے جدوجہد ہو رہی تھی' ان دنوں میرے دل میں پاکستان کا کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مسلمان الگ ملک کیوں مانگ رہے ہیں اور مسلمانوں کے اس مطالبے پر ہندو کیوں چراغ پا ہوتے ہیں؟ حصولِ پاکستان کی جدوجہد میرے لیے ایک ایسا ڈراما تھا جو سامنے مگر دور، بہت دور کھیلا جا رہا تھا۔ اس ڈرامے کو میرے جذبات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایسے ہی جیسے کسی چیز کو آپ دیکھتے ہیں اس پر سوچتے ہیں' ذہنی طور پر اسے سمجھتے بھی ہیں لیکن وہ آپ کی زندگی کا جزو نہیں بنتی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی



ممتاز مفتی، افتخار عارف اور دیگر احباب

کہ میں اسلامی جذبے سے قطعی طور پر کورا تھا۔

پاکستان کے قیام سے کچھ عرصہ پہلے جب چھرا بازی کے واقعات عام ہو گئے تھے، میں بمبئی میں مقیم تھا۔ ان تشدد بھرے واقعات کو دیکھ کر مجھے ہندوؤں پر غصہ آنے لگا۔ آخر قیامِ پاکستان پر وہ اس قدر مشتعل کیوں ہو رہے تھے؟ کیوں تشدد پر تلے ہوئے تھے؟ سڑکوں پر اور گلیوں میں چلتے راہ گیروں کو خنجر مارنے سے کیا پاکستان کے قیام کو روکا جا سکتا ہے؟ پاکستان میرے قریب آتا جا رہا تھا۔

انہی دنوں بمبئی کے اسٹیج پر پاکستان کے قیام کے خلاف کھیل کھیلے جا رہے تھے۔ ان کھیلوں کے روحِ رواں پرتھوی راج تھے۔ پرتھوی راج کو میں ایک عظیم فن کار سمجھتا ہوں۔ ان دنوں بھی میرے دل میں ان کے لیے بے پناہ عزت تھی۔ ایک روز میں کھیل دیکھنے گیا۔ پیشکش اعلیٰ تھی، اداکاری عمدہ تھی لیکن پروپیگنڈہ بھونڈا تھا۔ چھرا چلانے کی وارداتیں بڑھتی گئیں۔ نفرت کے جذبات کی وجہ سے میں پاکستان کے قریب اور قریب ہوتا گیا۔ بھارت سے میری یہ پسپائی نفرت اور ڈر کی وجہ سے تھی جس میں نفرت کا عنصر ڈر پر غالب تھا اور یہ نفرت کبھی کبھار اتنی شدت اختیار کر لیتی کہ میرا جی چاہتا، بھرے بازار میں نعرہ لگاؤں۔ ''اللہ اکبر! پاکستان زندہ باد!''

پاکستان اور میرے درمیان اب قطعی طور پر کوئی فاصلہ نہ رہا تھا۔ پاکستان میرے جذبات میں داخل ہو چکا تھا۔ بظاہر ایک دیوار حائل تھی، جرأت کی دیوار۔

14 اگست 1947ء کا دن آ گیا۔ اس روز میں نے پہلی مرتبہ پاکستان کے لیے مثبت جذبہ محسوس کیا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ ہم ریڈیو سیٹ کے پاس بیٹھے تھے۔ ریڈیو پر کوئی ٹیون بج رہی تھی۔ دف کی گمک عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی جیسے طبل بج رہا ہو۔ اونچے سروں میں طوطی للکار رہی تھی لیکن میرے لیے اس ٹیون کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ میں کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھا۔ دفعتاً اعلان ہوا۔ ''ریڈیو پاکستان۔'' میرے ہاتھ سے کتاب چھوٹ گئی۔ سارے بدن پر چیونٹے رینگنے لگے۔ دل میں ایک ہوائی سی چھوٹی۔ سارے وجود میں رنگین ستارے ناچنے لگے۔ پاکستان کے لیے یہ پہلا مثبت جذبہ تھا جس نے انجانے میں میرے بند بند کو جھنجوڑ دیا جیسے چودھویں کا چاند سوئے ہوئے سمندر کو چابک مار کر جگا دیتا ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد بمبئی میں شہرت اور امارت کے واضح امکانات مہمل دکھائی دینے لگے۔ پاکستان پہنچ کر صرف ایک فکر دامن گیر تھی کہ اپنے عزیز واقارب کو ضلع گورداسپور سے نکال کر پاکستان لے آئیں۔ پاکستان ہمارے لیے دارالسلام بن گیا تھا۔ اب مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں مسلمان ہوں، چاہے میرے دل میں ایمان کی روشنی تھی یا نہیں تھی، چاہے میری زندگی اسلام کے رنگ میں رنگی تھی یا نہیں، چاہے میرے قلب میں اسلامی جذبہ تھا یا نہیں، بہرحال میں مسلمان تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد مہاجرین کے کیمپوں میں مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھ دیکھ کر، مشرقی پنجاب میں کشت وخون کے واقعات کے بارے میں سن سن کر، بھارت کے رویئے کو دیکھ دیکھ کر یہ خیال مستحکم ہوتا گیا کہ پاکستان سے ہماری زندگی اور سلامتی وابستہ ہے لیکن ابھی تک یہ جذبہ خام تھا، یہ جذبہ حفظِ ماتقدم کے لیے تھا، اپنی ذات کے لیے محدود تھا، ضرورت وقتی کی پیداوار تھا۔ بھارت کے طرزِ عمل کا ردعمل تھا، یہ جذبہ اسلام کی عظمت کا حامل نہ تھا۔

آٹھ سال گزر گئے۔

اس عرصے میں ایک ایسے ادیب سے میری راہ و رسم ہو گئی جو اسلامی جذبے سے سرشار تھے اور جن کی زندگی میں عملی طور پر اسلامی رنگ نمایاں تھا۔ ایک روز میں اُن کے ہاں گیا تو وہاں ایک معمر آدمی خواجہ صاحب بیٹھے تھے۔ ہمارا تعارف ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کئی بار خواجہ صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ خواجہ صاحب کم گو تھے۔ اپنی بات کہنے کی بجائے دوسرے کی بات سننے کے عادی تھے۔ ذہین اور باریک بین تھے۔ دوسروں کی مدد کرنے کے دلدادہ تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ راست گو تھے۔

ایک روز میرے دوست نے مجھ سے کہا کہ خواجہ صاحب اچھے بزرگ ہیں لیکن خواجہ صاحب میں بزرگ کی کوئی خصوصیت دکھائی نہ دیتی تھی۔ میرے نزدیک بزرگ وہ ہوتے ہیں جو جٹا دھاری ہوں، جن کی ہر بات سے ذاتی اہمیت مترشح ہوتی ہو، جو ڈائس بنا کر بیٹھنے کے عادی ہوں اور پند ونصیحت سے شغف رکھتے ہوں، خواجہ صاحب میں ایسی کوئی بات بھی تو نہ تھی۔ ان کی گفتگو میں روحانیت کی طرف کوئی اشارہ نہ ہوتا تھا بلکہ عام دنیاوی مسائل پر وہ بڑے زیرک انداز میں دنیاوی نقطۂ نظر سے بات کرنے کے عادی تھے۔ ان وجوہات کی بناء پر میں نے خواجہ صاحب سے ملنا جلنا جاری رکھا ورنہ اگر مجھے ذرا بھی شبہ ہو جاتا کہ وہ بزرگ ہیں اور روحانیت سے تعلق رکھتے ہیں تو یقیناً اُن سے پیچھے ہٹ جاتا کیونکہ مجھے بزرگوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ایک روز میں قبرستان کی طرف جا نکلا۔ دیکھا کہ ایک معمولی سی چار دیواری کے اندر خواجہ صاحب ایک مزار پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ میں رک گیا۔ فارغ ہونے کے بعد خواجہ صاحب حسبِ دستور بڑے تپاک سے ملے۔ کہنے لگے۔ ''کہیے، کیا حال چال ہے؟''

میں نے کہا۔ ''جی، کوئی خاص اچھا نہیں، بس غم کھا رہے ہیں۔''

بولے۔ ''کیوں، غم کس بات کا؟''

''خواجہ صاحب! پاکستان کا کیا بنے گا؟ یہ کشتی تو ڈول رہی ہے؟'' میں نے یہ بات تفریحاً کہہ دی تھی۔ یہ درست ہے کہ مجھے پاکستان کے ڈولنے کا احساس تھا لیکن پاکستان کے لیے کوئی خاص لگن میں نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

خواجہ صاحب میری بات سن کر دفعتاً سنجیدہ ہو گئے۔ ''مفتی صاحب!'' وہ بولے۔ ''پاکستان کا غم آپ کیوں کھاتے ہیں جبکہ پاکستان کا غم کھانے کے لیے بڑی بڑی ہستیاں موجود ہیں؟ آپ کو اور مجھے غم کھانے کی کیا ضرورت ہے؟'' ایک ساعت کے لیے وہ رک گئے پھر بولے۔ ''اس بڈھے کو دیکھتے ہیں آپ؟'' میں نے اس جانب دیکھا جدھر خواجہ صاحب اشارہ کر رہے تھے۔ وہاں کوئی بڈھا نہ تھا۔ کیا وہ اس قبر کی طرف اشارہ کر رہے تھے جس پر وہ ابھی ابھی فاتحہ پڑھ کر آئے تھے؟ خواجہ صاحب بولے۔ ''اس بڈھے نے اپنی تمام زندگی قیامِ پاکستان کے لیے وقف کر دی تھی۔ یہ بوٹا اسی بڈھے کا لگایا ہوا ہے۔ مفتی صاحب!'' وہ مسکرا کر کہنے لگے۔ ''پاکستان کے لیے بہت عظیم ہستیاں کام کر رہی ہیں۔ آپ کیوں غم کھاتے ہیں؟''

''تو پھر میں کیا کروں؟'' میں نے ازراہِ مذاق کہا۔

''آپ صرف اتنا کریں کہ ہر کام سے پہلے سوچیں کہ کیا آپ پاکستان کے مفاد کے مطابق کام کر رہے ہیں؟ آپ کا قدم پاکستان کے مفاد کے خلاف تو نہیں؟ اس میں آپ کا اپنا فائدہ ہے۔ پاکستان تو بہرصورت پھلے پھولے گا۔ اس کی بہار دیکھ کر لوگ اش اش کریں گے، انشاءاللہ!''

خواجہ صاحب کی بات سن کر مجھے بے حد حیرت ہوئی۔ خواجہ صاحب نے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی۔ انہوں نے تو کبھی بڑ نہ ہانکی تھی۔ ان کی بات بڑی زیرک ہوتی جو عملی دنیا سے متعلق ہوتی تھی۔ وہ پیر

پرستی کے حق میں نہ تھے۔ پھر وہ بڈھا کون تھا جس نے پاکستان کا بوٹا لگایا تھا؟ وہ بڑی ہستیاں کون تھیں جو پاکستان کا غم کھانے پر مامور تھیں؟ پاکستان میں کیا خصوصیت ہے کہ بڑی ہستیاں اس پر مامور ہوں؟ پاکستان ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ اس میں ابھی تک کوئی اسلامی خصوصیت پیدا نہیں ہوئی اور اسلامی ملک تعداد میں بیسیوں ہیں، سب کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ خواجہ صاحب کی بات مہمل نظر آتی تھی۔ ان کی بات کی طرف توجہ کرتا تو وہ بے معنی معلوم ہوتی۔ ان کے کردار کی طرف نظر جاتی تو ازسرنو شش وپنج میں پڑ جاتا۔ خواجہ صاحب کی زیرکی، ان کی راست گوئی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

خواجہ صاحب میں ایک عجیب خصوصیت تھی۔ جب بھی وہ اللہ کا نام لیتے تو کچھ ایسے انداز میں بات کرتے جیسے اللہ ان کے پاس بیٹھا ہو اور اللہ کا ایک خصوصی پروگرام ہو، اور وہ ''کن'' کہہ کر تخلیق کرنے والا اللہ نہ ہو بلکہ ہر لمحے محنت، مشقت اور مزدوری کرنے والا ہو، جس کے ہاتھ محنت کرتے کرتے بھدے ہو چکے ہوں اور جو ہر بات میں دوسروں کا ہاتھ بٹانے کا دلدادہ ہو۔ ان کی یہ بات مجھے کھلتی تھی۔ خواجہ صاحب نے اللہ کو مزدور بنا رکھا تھا۔

اللہ کا میں بڑا قائل تھا۔ میرے ذہن میں اللہ کی دو خصوصیات نمایاں تھیں، اس کی عظمت اور بے نیازی۔ اللہ کی عظمت کا احساس فلکیات اور جمادات کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا اور اس کی بے نیازی میرا اپنا تاثر تھا۔ میں اسے رب العالمین سمجھتا تھا، رب المسلمین نہیں۔ میرے نزدیک اللہ ایک عظیم شہنشاہ تھا جس کی ریاست سیکولر تھی۔ اسلام میرے نزدیک ایک ضابطہ عمل تھا جو صرف بنی نوع انسان کے لیے باعث فلاح تھا جس کے لیے اللہ کو اپنے طرزِ عمل میں ردوبدل گوارہ نہ تھا۔ میرے اللہ کو افراد سے

دلچسپی نہ تھی۔ مذہب کے نقطۂ نظر سے رعایت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا پھر پاکستان کی امتیازی حیثیت کے کیا معنی؟ ساری بات ہی بے ہنگم تھی۔ اس کے باوجود چونکہ وہ بات خواجہ صاحب نے کی تھی میرے دل میں گومگو کا عالم پیدا ہو گیا۔ دل میں ایک پھانس سی لگ گئی۔

پاکستان کی امتیازی حیثیت کا یہ پہلا تذکرہ تھا۔ چار سال بیت گئے۔

میرا تبادلہ ہو گیا اور مجھے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ میرے نئے افسر میں چند ایک خصوصیات نمایاں تھیں۔ وہ بے حد ذہین تھا، کم گو تھا۔ اس میں برداشت کا عنصر اس قدر زیادہ تھا کہ دیکھنے والے کو غصہ آ جاتا اور اس میں ذات کا خیال قطعی طور پر مفقود تھا۔

صاحب نے مجھے بلایا، بولے۔ ''آپ کام شروع کر دیں۔''

میں نے کہا۔ ''یس سر.......!''

بولے۔ ''اس صندوقچی میں پچھلے ہفتے کے خطوط ہیں، ان سب خطوط کو غور سے پڑھیں، موضوع کے لحاظ سے انہیں ترتیب دیں اور سمری بنا دیں جو خط خصوصی توجہ کے قابل ہو، اسے الگ کر دیں۔''

''یس سر.......!'' میں نے کہا۔

''چپراسی صندوقچی لے آئے گا۔'' وہ بولے۔

''آل رائٹ سر.......!'' میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں نے پہلا خط کھولا، لکھا تھا۔ ''اے شاہ! تو خوش نصیب ہے کہ تجھے پاکستان کی بادشاہی عزت ملی۔''

خط پڑھ کر میں سوچنے لگا، عجیب خط ہے۔ دوسرا خط کھولا تو اور بھی حیران ہوا، لکھا تھا۔ ''خبردار! پاکستان میں آٹا مہنگا نہ ہونے دیجیو۔'' ''تیسرے

میں لکھا تھا۔ ''وہ وقت دور نہیں جب پاکستان میں ایسا عالم ہوگا کہ مدینے کے رہنے والے دیکھ کر کہیں گے، سبحان اللہ!''

ان خطوط کو دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے یہ خط کیوں لکھے تھے؟ ان کا مقصد کیا تھا؟ بہرطور ایک بات واضح تھی کہ توجہ حاصل کرنا مقصود نہ تھا کیونکہ زیادہ تر خطوط میں لکھنے والوں کے نام بھی مرقوم نہ تھے۔ یہ خط دعا گو، خادم یا عاجز پر ختم ہوتے تھے۔ بیشتر خطوط کاغذ کے پرزوں پر لکھے ہوئے تھے۔ تحریر اور انداز بیان دونوں ہی خام تھے۔ اثر ڈالنے کا عنصر مفقود تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے پیسے کیوں خرچ کیے تھے؟ وقت کیوں صرف کیا تھا؟

پھر میں نے ایک طویل خط اٹھایا۔ یہ خط جنوبی ہند کے کسی شہر ملائم سے موصول ہوا تھا۔ لکھنے والا سب جج تھا جو 20 سال پیشتر ایک حادثے کی وجہ سے اپاہج ہو چکا تھا اور گزشتہ بیس برس سے صاحب فراش تھا۔ ان 20 برسوں میں اس کا واحد کام عبادت تھا۔ خط میں تحریر تھا کہ میں یہ خط تمہارے لیے نہیں لکھ رہا ہوں۔ جلد ہی پاکستان ایک عظیم مملکت بن جائے گا۔ ایک عظیم فتح حاصل ہو گی اور پھر پاکستان دنیائے اسلام کا ایک مرکز بن جائے گا۔

ان خطوط نے مجھے پاگل کر دیا۔ یہ کون سی دنیا تھی؟ یہ کس قسم کے لوگ تھے؟ خط لکھنے سے ان کا مقصد کیا تھا؟ کیا یہ سب مذہبی ہسٹریا کے مریض تھے؟ جنونی تھے؟ مجذوب تھے یا جاگتے میں خواب دیکھنے کے عادی تھے؟ لیکن ان میں کئی ایک خطوط پڑھے لکھے لوگوں کے بھی تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ ان خطوط میں کسی فرد کا تذکرہ نہ ہوتا تھا۔ کسی فرد کی توقیر و تعظیم نہ ملتی تھی۔ یہ خط قصیدہ گوئی سے خالی تھے۔ ان خطوط میں کسی ظلِ الٰہی کو خطاب نہ کیا گیا تھا۔ ان کا موضوع پاکستان تھا۔ پاکستان کی خصوصی عظمت، پاکستان سے رسول اللہ ﷺ کا التفات، پاکستان پر اللہ کی برکت و رحمت۔ ان خطوط کو پڑھ کر میں پاگل ہو گیا، مجھ پر ایک عجیب سی وحشت سوار ہو گئی۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ دنیا کون سی دنیا ہے؟ پاکستان کیا ہے؟ اسے کیا امتیاز حاصل ہے؟ کیوں حاصل ہے؟

طبیعت کے لحاظ سے میں ایک مجذوب واقع ہوا ہوں۔ عام حالات میں مجھ پر کسی واقعے کا اثر نہیں ہوتا لیکن جب اثر ہو جائے تو میں شل ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے اندر لاوا کھولنے لگتا ہے اور پھر گویا آتش فشاں جاگ اٹھتا ہے۔ ان خطوط کو پڑھ کر پہلے تو میں سوچتا رہا پھر نہ جانے کیا ہوا کہ عقل و خرد کے دونوں کنارے ٹوٹ گئے، جذبے کا دھارا بہہ نکلا اور میری نیا ڈگمگانے لگی۔

دو روز میں دیوانوں کی طرح اپنے گھر میں صحرا نوردی کرتا رہا پھر طوفان تھما تو میں سوچنے لگا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ صاحب سے مل کر کہوں کہ جناب عالیٰ! یہ خط میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ مجھے کوئی سنجیدہ کام دیجیے جسے عقل سے تعلق ہو۔

تیسرے روز میں تیار بیٹھا تھا کہ جب بھی صاحب اکیلے ہوں تو میں جا کر ان سے بات کروں۔ عین اس وقت صاحب کا چپڑاسی آ گیا۔ میں نے سوچا، چلو اچھا ہوا۔ اس سے کہہ دیتا ہوں کہ صاحب اکیلے ہوں تو مجھے اطلاع کر دے۔ چپڑاسی نے آ کر کہا۔ ''جی! صاحب بلاتے ہیں۔'' صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے وقت میں نے سوچا کہ صاحب اپنی بات کر لیں تو پھر میں اپنی درخواست پیش کر دوں گا۔

اس وقت صاحب کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''آپ گیٹ پر سیکورٹی کے کمرے میں چلے جائیں۔ وہاں ایک شخص مجھ

سے ملنے کے لیے مصر ہے۔ آپ اس سے بات کریں۔ کہیں کہ میں نے آپ کو بھیجا ہے۔ اگر وہ آپ سے بات کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اس سے بات پوچھ لیں کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے لیکن اگر وہ مجھ سے ملنے پر مصر ہے تو اسے جانے نہ دیں بلکہ مجھے اطلاع دیں میں اس سے ملوں گا۔“

”یس سر......!“ صاحب کی بات سن کر میں دروازے کی طرف مڑا۔

”اور دیکھیے۔“ صاحب بولے۔ ”سیکورٹی کے کمرے میں بات نہ کریں۔ اسے باہر لے جائیں۔ علیحدگی میں، سمجھے؟“

”یس سر!“ اس وقت صاحب سے اپنی بات کرنے کا موقع نہ تھا میں نے سوچا، واپسی پر بات کروں گا۔

سیکورٹی کے کمرے میں ایک دہقان قسم کا آدمی کھڑا تھا۔ میں اسے باہر باغیچے میں لے گیا۔

”صاحب کام میں مصروف ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”انہوں نے مجھے بھیجا ہے۔ اگر آپ یہ بتا دیں کہ آپ انہیں کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں تو......“

میں ابھی جملہ ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ بولا۔ ”بابو جی! میں نے صاحب سے مل کر کیا لینا ہے۔ مجھے تو اس سے کوئی کام نہیں۔ میں اپنے گاؤں سے آرہا تھا۔ اس سڑک کے پاس مجھے ایک سانڈنی سوار ملا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں پاس گیا تو وہ کہنے لگا۔ میاں! اس مکان کے اندر جاؤ۔ صاحب سے ملو اور ہمارا ایک پیغام اسے دے دو۔ سانڈنی سوار بزرگ آدمی تھا۔ میں نے اس کی بات مان لی اور ادھر آ گیا لیکن پولیس والے دوسرے کی بات ہی نہیں سنتے۔ اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”آپ پیغام مجھے دے دیں۔ میں صاحب تک پہنچا دوں گا۔“

”سانڈنی سوار نے مجھ سے کہا تھا۔“ وہ بولا۔ ”جا کر اس سے کہہ دو کہ جو کاغذ وہ لکھ رہا ہے، وہ غلط ہے اور جو وہ لکھ کر پھاڑ چکا ہے، وہ صحیح ہے۔“

”عجیب مہمل سا پیغام ہے۔“ میں نے سوچا۔ ”نہ سر نہ پاؤں۔ سانڈنی سوار کو صاحب کے نوٹ سے کیا واسطہ! اور پھر سانڈنی سوار یہاں کہاں! میں نے تو کبھی اس علاقے میں کوئی سانڈنی سوار نہیں دیکھا۔ یقیناً یہ دہقان پاگل ہے۔“

مجھے یقین تھا کہ صاحب بات سن کر مسکرا دیں گے اور پھر کام میں مصروف ہو جائیں گے لیکن ایک ساعت کے لیے وہ سوچ میں پڑ گئے پھر نہایت سنجیدگی سے بولے۔ ”ذرا یہ ویسٹ پیپر باسکٹ تو اٹھائیے۔“

میں نے ٹوکری اٹھا کر میز پر رکھ دی۔ وہ بڑی توجہ اور احتیاط سے کاغذ کے ٹکڑے ٹوکری میں سے چننے لگے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ کیا صاحب سانڈنی سوار کی بات سچ مان بیٹھے ہیں؟

صاحب نے وہ پرزے میری جانب بڑھا دیئے۔ بولے ”اگر آپ کو فرصت ہو تو انہیں جوڑ دیجیے۔“

”یس سر......!“ میں نے کہا۔ صاحب نے وہ نوٹ اٹھا لیا جو وہ لکھ رہے تھے اور اسے پھاڑ کر ٹوکری میں ڈال دیا۔ حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یہ شخص جو اس قدر ذہین اور زیرک ہے کہ ہم ابھی بات کرنے کے لیے منہ کھولتے ہیں تو ہمارا عندیہ بھانپ لیتا ہے۔ یہ شخص جو ہر ایک کی بات سننے کے باوجود اپنی رائے رکھتا ہے۔ جس کے خیالات میں انفرادیت اور ندرت ہے جو پٹے ہوئے رسمی خیالات سے دور رہتا ہے جسے توہمات سے دور کا واسطہ بھی نہیں یہ شخص ایک مبہم سانڈنی سوار کی بات کو یوں اپنا رہا ہے جیسے ہمیشہ سے اسے ایسے سانڈنی سواروں سے واسطہ رہا ہو جیسے اس قسم کے پیغامات سے مانوس ہو۔ یہ کیا بھید ہے؟

میں نے کاغذ کے پرزے جوڑے۔ وہ نوٹ پاکستان کے مجوزہ آئین کی ایک اہم شق تھی جسے اسلام سے تعلق تھا۔

اس کے بعد صاحب سے خطوں کی بات کرنا بے معنی نظر آنے لگا اور میں از سر نو ان خطوں کی الف لیلیٰ میں کھو گیا۔ وہ خط روز موصول ہوتے تھے۔ جگہ جگہ سے موصول ہوتے تھے لیکن عام طور سے ان کا موضوع ایک ہی ہوتا، پاکستان، پاکستان کا امتیاز، پاکستان کی آنے والی عظمت، درخشندہ مستقبل، آہستہ آہستہ میں اس طوفان میں بہہ گیا۔ میرے دل میں شکوک پیدا ہونے لگے۔ شاید یہ چوتھی سمت بھی حقیقت ہو۔ شاید اللہ کسی ملک یا فرد میں خصوصی دلچسپی لینے سے گریز نہ کرتے ہوں۔ آخر وہ مالک ارض وسما ہے۔ اگر وہ کوئی بات کرنا چاہے تو اسے کون روک سکتا ہے؟

ایک روز صاحب نے مجھے بلایا اور ایک کام دے کر اپنے ہی کمرے میں بٹھا لیا تا کہ وہیں بیٹھ کر ختم کر دوں۔ میں ایک کونے میں بیٹھ کر کام کر رہا تھا کہ چپڑاسی آیا۔ صاحب سے کہنے لگا۔ ”سر! میرا ایک چچا اب کی بار حج کرنے گیا تھا۔ وہ مدینہ شریف سے آپ کے لیے ایک پیغام لایا ہے۔ حکم ہو تو اسے بلا لوں۔“

صاحب نے بڑی سنجیدگی سے چپڑاسی کی بات سنی۔ بولے۔ ”بلا لو۔“ انہوں نے اپنا کام ایک طرف رکھ دیا۔ اٹھ کر بڈھے سے مصافحہ کیا اور بڑے غور اور احترام سے اس کی بات سننے لگے۔

تمہید کے بعد بڈھے نے کہا۔ ”جناب! وہ جہلم کے رہنے والے ہیں۔ فوج میں سپاہی تھے۔ بڑی جنگ میں لام پر گئے تھے۔ وہاں سے مدینہ شریف میں سلام کے لیے حاضر ہوئے، بس وہیں بیٹھ گئے۔ آج تک وہیں بیٹھے ہیں۔ اب وہ روضہ مبارک کے چابی بردار ہیں۔ یہ بہت بڑا عہدہ ہے جناب! انہوں نے آپ کو پیغام بھیجا ہے۔“

صاحب نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

بڈھے نے بات شروع کی۔ ”انہوں نے فرمایا کہ سن 42ء میں ہم نے خواب دیکھا کہ مسجد نبوی سے ایک بیل پھوٹی اور بڑھتے بڑھتے دور نکل گئی اور اس کے پرلے سرے پر سبز پتیاں نکل آئیں۔“

صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”چار ایک سال بعد خواب میں پھر اسی بیل کو دیکھا۔ شاخ جوں کی توں قائم تھی لیکن پتیاں مرجھا گئی تھیں۔ اب پھر خواب میں ہم نے وہی بیل دیکھی ہے۔ وہ پھر سے سر سبز ہو رہی ہے پھر سے کونپلیں نکل رہی ہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ ہماری طرف سے جا کر مبارک باد دینا اور ہمارا پیغام دینا۔ کہنا، بھیڑوں کے رکھوالے خود سائے میں نہیں بیٹھتے۔“

جب تک وہ بڈھا بات کرتا رہا، کوشش کے باوجود میں اپنے کام کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ جب اس نے کہا کہ ہماری طرف سے مبارک باد دینا تو میں نے محسوس کیا جیسے مجھے مبارک باد دی جا رہی ہو۔ اس روز مجھے پاکستان کا ہر بوٹا مزید ہرا بھرا نظر آنے لگا اور ہر سوکھی شاخ سے نئی کونپلیں پھوٹتی نظر آنے لگیں۔ لاکھ لاحول پڑھتا۔ اپنے آپ کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا لیکن بے سود، الف لیلیٰ کی اس دنیا میں ایک عجب کیفیت تھی۔ عجب نشہ تھا۔ میری عقل مجھے ملامت کرتی لیکن مجھے اس نشے کی لت پڑ رہی تھی۔

اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جسے دیکھ کر میرا بند بند لرز گیا۔ خوف سے میری گھگی بندھ گئی۔ صاحب کے ایک دوست نے فون کر کے انہیں بلایا۔ کہنے لگے کہ ہمارے ہاں ایک درویش آئے ہوئے ہیں۔ پہلے یہ حیدر آباد میں آئی جی پولیس تھے، پھر بلاوا آ گیا۔ سب کچھ چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ آپ سے ملنے کی خواہش

رکھتے ہیں۔

صاحب درویش سے ملنے جانے لگے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے اس درویش کی شکل بڑی ڈراؤنی تھی۔ سیاہ رنگ، ہڈیوں کا ڈھانچہ، خوفناک آنکھیں، کرخت آواز، صاحب کا تعارف کرانے کے بعد صاحب خانہ کسی کام سے باہر چلے گئے اور صاحب اور وہ درویش جو مجھے سڑی ہوئی مرچ دکھائی دے رہا تھا۔ اکیلے رہ گئے۔ میں ملحقہ کمرے میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ اخبار پڑھ رہا تھا۔

دفعتاً اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ ملحقہ کمرے میں مرچ انگریزی بول رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ”فلے یو الائیو۔ پٹ برین آن یو اینڈ پلیس یو ان دی سن“ ارے! یہ کیا صاحب سے کہہ رہا ہے؟ یہ درویش ہے یا قصائی؟

”میں یہاں صرف اس مقصد کے لیے آیا ہوں۔“ اس کی کرخت آواز پھر گونجی ”کہ تمہیں وارننگ دوں۔ تمہیں پتا ہے کہ اس سلسلے میں وارننگ نہیں دی جاتی۔ جو کوتاہی کرے، اسے ہٹا دیا جاتا ہے۔ رد کر دیا جاتا ہے لیکن پاکستان کو خصوصی رعایت حاصل ہے اس لیے وارننگ دی جا رہی ہے۔ اگر اب بھی کوتاہی ہوئی تو کھال ادھیڑ دی جائے گی اور نمک لگا کر دھوپ میں رکھ دیا جائے گا۔“

یہ سن کر خوف سے میرا خون جم گیا اور میں دیوانہ وار باہر نکل گیا۔ تین گھنٹے صاحب اور مرچ اس کمرے میں بند رہے۔

جب صاحب باہر نکلے تو ان کا منہ زرد تھا، جیسے تمام خون چوس لیا گیا ہو۔ وہ بصد مشکل چل رہے تھے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی ہڈی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

دو سال بعد ایسی ہی نوعیت کا ایک اور واقعہ ہوا۔ صاحب اور میں دورے پر کراچی گئے ہوئے تھے۔

ایک شام ہم سینٹرل جیل گئے۔ صاحب کو وہاں کچھ کام تھا۔ ابھی وہ کام سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ جیل کے ایک گارڈ نے آ کر سلوٹ مارا، بولا۔ ”حضور! ایک قیدی آپ کا نام لے لے کر پکار رہا ہے۔ کہتا ہے اُسے بلاؤ۔“

ہم اس گارڈ کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ایک چھوٹے سلاخ دار کمرے میں ایک ہیجڑا بند تھا۔ صاحب نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ ”تالا کھولو۔“ صاحب بولے۔ تالا کھلا تو وہ اندر داخل ہو گئے اور گارڈ سے بولے۔ ”تم جاؤ۔“ گارڈ چلا گیا۔ میں اوٹ میں کھڑا رہا۔

ہیجڑے نے صاحب کو دیکھتے ہی چلا کر غصے سے کہا۔ ”تجھے خبردار کرنے کے لیے ہمیں قید ہونا پڑا۔“

یہ سنتے ہی مجھ پر خوف طاری ہو گیا اور میں وہاں سے بھاگا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب صاحب وہاں سے نکلے تو ان کی وہی حالت تھی جیسے مرچ سے ملاقات کرنے کے بعد ہوئی تھی۔

یا اللہ! یہ کیا اسرار ہے۔ میرے ذہن میں پھر سے ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ اگلے روز میں اکیلا جیل پہنچا لیکن وہ قیدی وہاں نہیں تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر سے اس کے کوائف پوچھے۔ پتا چلا کہ وہ باقاعدہ قیدی نہ تھا۔ جیل کے قریبی بازار میں دنگا کر رہا تھا کہ جیل کے ایک گارڈ نے لا کر کمرے میں بند کر دیا۔ صاحب کے جانے کے بعد اس کے کمرے کو مقفل کر دیا تھا۔ کسی گارڈ کو علم نہ تھا کہ کس نے اسے رہا کیا ہے۔

ان واقعات نے مجھے پاگل کر دیا۔ پاکستان کی امتیازی حیثیت کا بھید اور بھی پراسرار ہو گیا لیکن انجانے میں مجھے پاکستان کی امتیازی حیثیت کا یقین ہو گیا۔

پھر میرا تبادلہ ہو گیا اور میری خدمات ایک اور محکمے کو پیش کر دی گئیں۔ اس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ گاہے گاہے بیٹھے بٹھائے مجھے وہ دور یاد آ جاتا تو میرے جسم پر چیونٹے سے رینگتے اور ایک عجیب کیفیت مجھے اپنی آغوش میں لے لیتی۔ سانپ گزر چکا تھا لیکن لکیر باقی تھی اور وہ لکیر روز بروز روشن تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس لکیر نے گویا زبردستی میرا زاویہ نگاہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود ذہنی طور پر میں کچھ بھی نہ سمجھ پایا تھا۔ میری کیفیت یہ تھی کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ پاکستان کے لیے میرے دل میں خوانخواہ عقیدت پیدا ہو چکی تھی۔ میں پاکستان کے ہونے پر فخر محسوس کرنے لگا تھا اور پاکستان کے مستقبل کی طرف نگاہیں اٹھائے انتظار کر رہا تھا۔ کس کا انتظار؟ یہ مجھے علم نہیں۔

ایک روز جب میں اسلام آباد کے گرد و نواح میں گھوم رہا تھا، ایک ٹیکسی میرے قریب آ کر رک گئی۔ میرے ایک پرانے دوست احمد نے ٹیکسی سے سر نکالا۔ اسے دیکھ کر میں چلایا۔ ”ارے! تم تو یورپ گئے ہوئے تھے۔“

”میں اسی ہفتے واپس آیا ہوں۔“ احمد بولا۔

”یہاں کیسے گھوم رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”بری شاہ لطیف جا رہا ہوں۔“ وہ بولا۔ احمد کی زبان سے شاہ لطیف کا نام سن کر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ احمد تہذیب جدید کی پیداوار تھا۔

”تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”آؤ یار۔“ وہ بولا۔ ”میرے ساتھ چلو۔ ابھی واپس آ جائیں گے۔“

جب ہم مزار پر پہنچے تو فاتحہ خوانی کے بعد احمد بولا۔ ”یار! حیرت کی بات ہے۔ کیا یہ لوگ اس قدر صاحب نظر ہوتے ہیں؟ ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں یورپ کی متعدد لائبریریوں میں گیا۔ وہاں ایک نسخہ ملا جس میں درج تھا کہ شاہ لطیف نے نہ جانے کتنے سو سال پہلے فرمایا تھا کہ ہمارے نزدیک ایک اسلامی شہر آباد ہو گا جو دنیائے اسلام کا مرکز بنے گا اور یہ نسخہ دو ڈھائی سو سال پرانا تھا۔ دیکھ لو، اسلام آباد نور پور سے آدھ میل کے فاصلے پر ہے۔ صرف آدھ میل......! حد ہو گئی۔“

جب ہم نور پور سے واپس آ رہے تھے تو ٹیکسی رک گئی۔

”کیوں بھائی، رک کیوں گئے؟“ احمد پوچھا۔

ڈرائیور بولا۔ ”جناب، نور پور کی سڑک یہاں سے توڑ دی گئی ہے۔“

ہم نے باہر دیکھا سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔ دس پندرہ گز کا ٹکڑا کچا تھا۔ احمد نے قہقہہ لگایا۔ بولا۔ ”دیکھ لو مفتی! اسلام آباد نے سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ بری شاہ لطیف کو جانے والی سڑک کاٹ دی ہے اور یہ شہر دنیائے اسلام کا مرکز بننے والا ہے۔“ اس نے ایک قہقہہ لگایا۔

”نور پور کے تانگے کو اسلام آبا میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔“ ڈرائیور نے کہا۔

”سنتے ہو؟“ احمد پھر ہنسنے لگا۔

پھر جنگ چھڑ گئی۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ عجیب و غریب نوعیت کی خبریں آنے لگیں۔ یہ خبریں مافوق الفطرت عنصر سے بھری ہوئی تھیں۔ قدم قدم پر معجزات کے تذکرے تھے۔ اخباروں کے کالم ایسے بیانات سے بھرے ہوئے تھے۔ لوگ ان خبروں کو سنتے اور سر دھنتے تھے۔

متعدد لوگوں نے خواب میں دیکھا کہ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم عجلت میں گھوڑے پر سوار ہو کر پاکستان تشریف لا رہے ہیں۔ جنگ بدر کے شہداء محاذوں پر پہنچ چکے ہیں۔ حضرت علیؓ، حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ سفید ملبوسات پہنے سیالکوٹ کے قرب و جوار میں محاذ کی طرف جاتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔

ایک محاذ کے بھارتی قیدی کا بیان تھا کہ سفید پیراہن والی پاکستانی فوج بھارتیوں کو تہس نہس کر رہی تھی۔ ان کی تلواروں سے شعلے نکل رہے تھے۔ دوسرے محاذ کے قیدی کا بیان تھا کہ سرخ ٹوپیوں اور چھوٹے قد والے پاکستانی فوجیوں نے بھارتی سینا کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ بھارتی توپچی نے کہا کہ گولے پھینکنا بے کار ہے۔ ایک سفید ریش بڈھا میرے گولے کیچ کر کے پرے پھینک دیتا ہے۔ بھارتی ہوابازوں کا بیان تھا کہ جب وہ گولے پھینکتے تھے تو سفید ریش بڈھے انہیں ہاتھوں میں پکڑ کر زمین پر یوں رکھ دیتے کہ وہ پھٹتے نہ تھے۔

سارا پاکستان ان معجزاتی تذکروں سے گونج رہا تھا۔ ایک دانشور نے تحقیر بھرا قہقہہ لگایا۔ ''یار! یہ پاکستانی عوام معجزے گھڑنے میں کمال رکھتے ہیں۔ آج کل ایسا ایسا معجزہ ایجاد ہو رہا ہے جس کا جواب نہیں۔''

''لیکن......'' دوسرا بولا۔ ''یار' اگر ان معجزوں سے ہٹ کر حقائق کی روشنی میں بات سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بات بنتی نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' تیسرے نے کہا۔

''مطلب یہ کہ اگر حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہمیں جنگ ہار جانی چاہیے تھی اور بھارت کو پاکستان پر قابض ہو جانا چاہیے تھا۔''

''ہاں۔'' ایک اور دانشور بولے۔ ''بھارتی حملے کا پلان فوجی اصولوں کے لحاظ سے عین پریکٹیکل تھا۔ اس میں کوئی سقم نہ تھا۔''

''لیکن یہ مافوق الفطرت داستانیں چھوڑو یار......!'' ایک نے کہا۔ ''خالص جدت طرازی۔''

وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

''لیکن یار......!'' ایک رپورٹر بولا۔ ''دو ایک باتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔''

''دو ایک باتیں ہر کسی نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں۔'' پہلے دانشور نے تضحیک بھرا قہقہہ لگایا۔ میں ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا لیکن مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ ان سب کے دلوں میں بار بار ایک ہی خیال ابھرتا ہے اور وہ اسے بھولنے کے لیے دلیلوں اور قہقہوں کا سہارا لے رہے ہیں۔

جنگ نے پاکستان کے معمے کو از سر نو میرے سامنے لا کھڑا کر دیا لیکن اب مجھ میں مدافعت کی طاقت نہ رہی تھی۔ اب مجھ میں اس بات کو شدت سے رد کرنے کی ہمت نہ رہی تھی جسے میں اپنی عقل و خرد کے مطابق سمجھ نہیں سکتا تھا۔ جنگ کے دوران میں ان محیر العقل باتوں نے پاکستان کی امتیازی حیثیت پر مہر لگا دی تھی۔

جنگ کے دوران میں میرا ایک ہم کار مجھ سے ملنے آیا۔ ملاقات کے بعد میں نے پوچھا۔ ''کیا گھر جاؤ گے؟''

بولا۔ ''نہیں' قاضی صاحب سے مل کر گھر جاؤں گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ کون ہیں؟''

بولا۔ ''وہ ایک عابد آدمی ہیں۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے بھی ساتھ لے چلو۔''

قاضی صاحب کے کمرے میں جا بجا مکہ مدینہ کی تصاویر آویزاں تھیں۔ جائے نماز پر تسبیحیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بڑے اخلاق سے ملے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھ سے بولے۔ ''آپ بھی کوئی بات کریں۔''

میں نے کہا۔ ''جی' پاکستان کے لیے دعا فرمائیں۔''

دفعتاً وہ سنجیدہ ہو گئے، بولے۔ ''میں بہت چھوٹا آدمی ہوں، بہت ہی چھوٹا آدمی ہوں۔ میری کیا

حیثیت ہے کہ میں پاکستان کے لیے دُعا کروں۔ نہیں جناب! میں اتنی حیثیت کا مالک نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جناب قاضی صاحب' دعا تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔''

وہ بولے۔ ''ٹھیک ہے لیکن پاکستان کی اور بات ہے۔ آپ کو پتا نہیں۔ مجھے بھی تھوڑی سی خبر ہے، بہت تھوڑی۔ میں چھوٹا آدمی ہوں بہت چھوٹا۔ پاکستان پر بڑوں کا ہاتھ ہے۔ وہ پاکستان کے محافظ ہیں۔ اس کے نگہبان ہیں۔ آپ پاکستان کی فکر نہ کریں۔''

قاضی صاحب کی بات نے سوئی ہوئی بھڑوں کے چھتے کو پھر سے چھیڑ دیا۔

یا اللہ! یہ بڑے کون ہیں؟ کیا وہی ہیں جو جہاد میں شامل ہونے کے لیے عجلت سے گھوڑے پر سوار ہو رہے تھے؟ کیا وہی ہیں جو سیالکوٹ کے گرد و نواح میں سفید پیراہن پہنے دیکھے گئے تھے؟

کیا یہ وہی تھے جو بھارتی توپچیوں کے گولے کیچ کرتے تھے؟ ہوائی جہازوں سے گرتے ہوئے بموں کو اُٹھا اُٹھا کر دور پھینکتے تھے؟ کیا انہی بڑوں میں سے کسی نے بھارتی پائلٹ کی نظر بندی کر دی تھی اور اسے دریائے راوی پر چھ پل نظر آنے لگے تھے؟ کیا انہوں نے ہی بھارتی پائلٹ کو حکم دیا تھا ''بیل آؤٹ، بیل آؤٹ'' اور وہ پاکستانی مزاحمت کے بغیر بڑوں کی آواز سن کر بیل آؤٹ کر گیا تھا؟

کیا پاکستان کے لیڈروں کو اس بات کا شعور تھا کہ بڑے قدم قدم پر پاکستان کی امداد کر رہے ہیں؟ کیا انہوں نے کبھی یہ سوچا ہے کہ پاکستان کی مثالی ترقی میں ہماری جدوجہد کو ان نتائج سے کچھ مناسبت نہیں جو بظاہر ہماری کوششیں پیدا کر رہی ہیں؟ کیا انہیں اس حقیقت کا شعور ہے کہ بین الاقوامی سطح پر جو اہمیت پاکستان کو حاصل ہے، وہ کس کی مرہونِ منت ہے؟ کیا پاکستان کے سربراہوں کو کبھی شک پڑا ہے کہ پاکستان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور کیا انہوں نے اس بات کی عملی کوشش کی ہے کہ پاکستان کی کشتی اس امتیازی حیثیت کی طرف لے جائیں؟ کیا انہوں نے ان بڑوں سے رابطہ پیدا کرنے کی خواہش محسوس کی ہے جو پاکستان کی فلاح و بہبود اور اس کے تحفظ کے لیے پیہم مصروف عمل ہیں؟

''ہاں۔'' قاضی صاحب کی بات نے سوئی ہوئی بھڑوں کے چھتے کو پھر سے چھیڑ دیا۔

جنگ ختم ہو گئی لیکن بھڑوں کا چھتا ابھی تک بھن بھن کر رہا ہے۔

قبرستان کے قریب ایک ننگ دھڑنگ مست اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ ''ابھی کیا ہے' ابھی تو خون کی ندیاں بہیں گی' بہت مریں گے، بہت' لاشیں ہی لاشیں پھر بڑی فتح ہو گی پھر بڑی فتح ہو گی اور پھر سبحان اللہ! سبحان اللہ!'' وہ جوش میں تالیاں بجا رہا تھا جیسے مجھے چڑا رہا ہو۔

خواجہ صاحب کو مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے دیکھ کر میں رک گیا۔

''کیا حال ہے مفتی صاحب؟'' وہ بولے۔

''فکر میں گھل رہا ہوں خواجہ صاحب!'' میں نے کہا۔

''کس کی فکر میں گھلنے لگے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''پاکستان کی فکر لگی ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ سنجیدہ ہو گئے۔ ان کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے، بولے۔ ''مفتی جی! اللہ کا کام اللہ پر چھوڑ دو۔ اللہ کا کام اپنے ذمے نہ لو۔ پاکستان کی فکر کرنے والے آپ کون ہیں جی؟ آپ اپنی سوچیے۔ اپنی فکر کیجیے۔ واہ مفتی جی! اتنی سی بات آج تک نہیں سمجھ سکے؟''

چلتے چلتے میں نے جو سر اٹھا کر دیکھا تو راستہ نامانوس نظر آیا۔ میں نے اسے اہمیت نہ دی اور چلتا رہا لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا' توں توں یہ احساس بڑھتا گیا کہ میں غلطی سے کسی انجانی سڑک پر نکل آیا ہوں۔ میں نے سوچا کوئی راہ گیر ملے تو اس سے پوچھوں کہ یہ کون سا علاقہ ہے۔ کچھ دور سڑک سے ہٹ کر ایک بہت بڑا برگد کا درخت تھا جس کے قریب ہی گھاس پھوس کا ایک جھونپڑا تھا۔ جھونپڑے کے باہر ایک شخص کھڑا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص سے پوچھ لوں۔ جھونپڑے کے برابر پہنچا تو سیٹی سی بجنے کی آواز آئی اور اسکوٹر کے پچھلے پہیے کی ہوا نکل گئی۔ میں نے اسکوٹر روک لیا۔ کیا مصیبت ہے میں نے سوچا۔ اب فالتو پہیہ فٹ کرنا پڑے گا۔

میں نے سر اٹھایا تو روبرو ہی شخص کھڑا تھا جسے میں نے جھونپڑے کے سامنے دیکھا تھا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''پنکچر ہوگیا ہے۔''

''اسے ادھر کھڑا کردے نا۔'' وہ بولا۔

''یہ سڑک کدھر جاتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کہیں بھی نہیں جاتی۔'' وہ بولا۔ ''ادھر پہاڑی کے نیچے جاکر ختم ہوجاتی ہے۔''

''آس پاس کوئی گاؤں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ بولا۔ ''ادھر ایک رکھ ہے' وہاں سے کبھی کبھی ٹرک آتا ہے تو یہاں دھوپ میں کیوں کھڑا ہے؟ جھونپڑے میں جاکر بیٹھ۔'' اس نے کہا۔ میں اسکوٹر کا دھیان رکھوں گا۔''

جھونپڑے میں چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں چادر سی لپٹی پڑی تھی۔ دوسرے کونے میں پانی کا گھڑا تھا، ساتھ ہی ٹین کا ڈبا پڑا تھا۔ میں نے پانی پیا اور پھر دروازے کے سامنے بیٹھ گیا۔

چادر میں حرکت ہوئی اور ایک دبلا پتلا سفید ریش چہرہ نکل آیا۔'' اٹھتے ہی بولا۔ ''تو آگیا۔''

''جی!'' میں نے جواب دیا۔ میں راستہ بھول کر ادھر آنکلا ہوں۔''

''ہاں۔'' بڈھا بڑبڑایا۔ ''جب چاہتے ہیں راستہ دے دیتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں راستہ بند کردیتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جی، میرے اسکوٹر کی ہوا نکل گئی ہے، پنکچر ہوگیا ہے۔''

''ہاں۔'' وہ بولا۔ ''ہم خود میں ہوا بھرتے رہتے ہیں۔ ان کا کرم ہو جائے تو ہوا نکل جاتی ہے۔'' پہلے تو میں اُس کی باتوں پر ٹھٹکا پھر سوچا کہ کوئی مجذوب ہے جو اناپ شناپ بول رہا ہے۔ کچھ دیر کے لیے وہ چپ رہا پھر مدھم آواز میں بولا۔

''تو جو نئے بت بنا رہا ہے' کیا تجھے قلم اس لیے دیا تھا کہ بت بنائے؟''

قلم کی بات سن کر میں چونکا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ میں لکھتا ہوں لیکن بت بت تو قلم سے نہیں بنائے جاتے۔

دفعتاً وہ بڈھا جوش میں آگیا کہنے لگا۔ ''کیا حیثیت ہے پاکستان کی؟ ایک چھوٹا چھٹنکی سا ملک' غریب ملک' نہ تین میں نہ تیرہ میں۔'' وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہوگیا پھر آپ ہی چھڑ گیا۔ ''اور یہاں کے لوگ! چاروں طرف سے میں، میں کی آوازیں آتی ہیں، بکرے میں میں کر رہے ہیں۔ کھائے جارہے ہیں، کھائے جارہے ہیں۔ اللہ کی اس دی ہوئی دیگ کو کھائے جارہے ہیں۔ ساتھ اپنا اپنا کٹورہ بھرے جارہے ہیں۔ اپنی اپنی کوٹھالی میں دانے ڈالتے جارہے ہیں۔ ضرورت نہیں۔ طمع، خالص طمع۔ دوسرے چاہے بھوکے مریں۔ پڑے مریں، میری

کوٹھالی بھر جائے۔ کوئی ملک کا نہیں سوچتا۔ آخرت کا نہیں سوچتا۔ کوئی دین کا نہیں سوچتا۔ آخرت کا نہیں سوچتا۔ بس آپا دھاپی پڑی ہے۔ بادشاہ بھی میں میں کر رہا ہے۔ فقیر بھی میں میں کر رہا ہے۔ بلیاں چھیچھڑوں کی رکھوالی پر بیٹھی ہیں۔ اس ملک کو تم بت بنا رہے ہو۔ خوش خبریاں دے رہے ہو۔ ملک تو اس لائق ہے کہ غرق کردیا جائے۔ سمجھے؟'' اس نے مجھے ڈانٹا۔ غصے بھری نگاہ مجھ پر ڈالی۔ ''بول کیا کہتا ہے؟ کیا تجھے اس لیے قلم دیا تھا کہ اس ملک کے قصیدے لکھے؟ بول'' وہ چلایا۔

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔ دیر تک وہ خاموش بیٹھا رہا پھر بولا۔

''حرص ہی حرص، طمع ہی طمع' اتنے حریص ہوگئے ہیں کہ اپنی غرض کے لیے اللہ کا نام بیچنے لگے ہیں۔ اللہ سے مخول کر رہے ہیں جھوٹے فریبی۔ جب بڑوں کا یہ حال ہے تو چھوٹوں کا کیا ہوگا اور تو کہتا پھرتا ہے اس ملک پر اللہ کی رحمت ہے جہاں اللہ کا نام ٹکے ٹکے بک رہا ہو۔ اتنی ناقدری! وہاں رحمت ہوگی کیا؟ بول۔'' پھر وہ غصے میں چلانے لگا۔ ''تجھے یہاں اس لیے نہیں بلایا ہے کہ منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھا رہے۔''

''مجھے بلایا ہے؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''اور کیا تو خود آیا ہے یہاں؟'' وہ بولا۔ ''ہمیں یہاں تیرا انتظار کرنا پڑا۔ ہمیں پتا تھا کہ تو آئے گا اور تو آگیا۔''

''لیکن میرا کیا قصور ہے بابا؟'' میں غصے میں آگیا۔

''ہاں تیرا قصور ہے۔'' وہ بولا۔ ''جن باتوں کو تو نہیں سمجھتا نہیں جانتا ان کے بارے میں کیوں بات کرتا ہے؟ کیوں اللہ کی خلقت کو گمراہ کرتا ہے؟''

''میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ میں سمجھتا ہوں جانتا ہوں۔ میری تو کوئی حیثیت نہیں بابا۔'' میں نے جواب دیا۔

''جو تو بے حیثیتہ ہے تو بے حیثیتہ بن کے رہ۔ بہتی باتاں نہ بگھار۔ شیخیاں نہ مار۔ پر تو بھی ان جیسا ہے وہ اپنی بات بنانے کے لیے پاکستان کی وڈیائی کی باتیں کر رہا ہے۔''

''غلط ہے، بالکل غلط۔'' غصے سے میری کنپٹیاں بجنے لگیں۔ ''میں تو صرف وہ باتیں لکھ دیتا ہوں جو تمہارے جیسے باباؤں کی زبانی سنتا ہوں۔ میں نے کبھی اپنی طرف سے بات نہیں کی۔ میں نے کبھی بڑھا چڑھا کر بات نہیں کی۔ میں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میں جانتا ہوں۔ تو بتا کیا لائل پور کے اس بابے نے مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد دو اڑھائی سو لوگوں کے سامنے نہیں کہا تھا کہ ایک دن آنے والا ہے جب یو این ہر قدم اٹھانے سے پہلے پاکستان سے پوچھے گی۔ کیا یہ قدم اٹھانے کی اجازت ہے اور انہوں نے کہا تھا اگر ایسا نہ ہوا تو تم آکر میری قبر پر تھوکنا۔ تو کیا اس بابے نے جھوٹ بولا تھا؟ بول بابا' چپ کیوں ہوگیا؟''

وہ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا پھر سر اٹھا کر کہنے لگا۔ ''نہیں بابا' جھوٹ نہیں بولتا۔''

''کیا نور پور کے بابے نے اڑھائی سو سال پہلے نہیں کہا تھا کہ یہاں ایک اسلامی شہر آباد ہوگا جو عالمِ اسلام کا مرکز بنے گا؟''

''کہا تھا۔'' اس نے کچھ توقف کے بعد کہا

''کیا دو صدیوں سے بابے یہ کہتے نہیں آرہے کہ ایک دن آنے والا ہے جب ہند میں اسلام کا ڈنکا بجے گا؟''

وہ خاموش بیٹھا رہا۔

''کیا مریڑ کے بابا نے جس کے حضور مجھے بھیجا

گیا تھا' قیام پاکستان کے وقت شاہِ دکن کو دعوت نہیں دی تھی کہ آ' تجھے شہنشاہِ ہند بنا دیں۔ کیا دکن کے سی این سی پنڈی میں آ کر بابا سے نہیں ملے تھے؟ بابا نے نشاۃ ثانیہ کی خبر نہ سنائی تھی۔ پاکستان کی مرکزی حیثیت کی بات نہیں کی تھی؟ بتا۔'' میں غرایا۔

''تو نہیں سمجھتا۔'' وہ بولا۔ ''بزرگوں کی باتیں برحق ہیں لیکن تجھ میں سمجھ کی کمی ہے۔ تو ان کی بات کے رخ کو نہیں سمجھتا اور انہیں اس طرح بیان کرتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اللہ تجھے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، دیکھ؟'' وہ توقف سے بولا۔ ''پاکستان کی کوئی حیثیت نہیں، کچھ حیثیت نہیں۔ ایک چھوٹا سا عام سا غریب ملک ہے۔ ساری اہمیت اللہ کے دین کی ہے۔ وہ دن آنے والا ہے جب اللہ کے دین سے دنیا منور ہو گی اور اللہ کا بھیجا ہوا وہ بندہ جس کے وجود سے دنیا منور ہو گی' پاکستان میں آئے گا۔ ان کا قیام پاکستان میں ہو گا۔ انشاء اللہ' پاکستان کی عظمت ان کے قیام سے وابستہ ہے۔ بذات خود نہیں۔'' وہ خاموش ہو گیا۔

پھر تڑپ کر بولا۔ ''دیکھ! ضروری نہیں کہ وہ صاحب پاکستانی نژاد ہوں۔ کیا پتا کہ وہ یورپ کے ہوں یا افریقہ کے ہوں یا کہیں کے ہوں البتہ ان کا قیام پاکستان میں ہو گا اور یہ پاکستان کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔ وڈیائی دیکھ۔'' وہ بولا۔ ''کوئی بابا حتمی بات نہیں کر سکتا۔ کسی کو مجاز نہیں کہ وہ حتمی بات کرے۔ وہ قادر مطلق ہے' جو چاہے' کرے۔ آخری فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے۔''

وہ خاموش ہو گیا پھر کچھ دیر کے بعد بولا۔ ''آئندہ سے بڑوں کی باتوں پر قلم نہیں اٹھانا، سمجھا؟''

اس نے مجھے ڈانٹا پھر وقفے کے بعد دھیمی آواز میں بولا۔ ''ہم تمہیں دو لفظ دیتے ہیں۔ ان کا وِرد کرتے رہنا۔'' قریب پڑے چند کاغذات سے اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔

''میں پاک حالت میں نہیں رہ سکتا۔'' میں نے کہا۔

''کچھ پروا نہیں۔'' وہ بولا۔

''میں عربی نہیں پڑھ سکتا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا۔'' وہ رک گیا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔'' اور کچھ لکھنے لگا۔ لکھنے کے بعد اس نے کاغذ کا ٹکڑا ایک پرانے لفافے میں ڈالا اور وہ لفافہ مجھے پکڑا دیا کہنے لگا۔ ''گیارہ مرتبہ صبح اور گیارہ مرتبہ سوتے وقت اس کا ورد کیا کرو۔ اب تو جا اللہ تجھے سمجھنے کی توفیق عطا کرے۔''

میں اُٹھ بیٹھا باہر میرا اسکوٹر سڑک کے قریب کھڑا تھا۔ میں نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور چل پڑا۔

کچھ دور جا کر دفعتاً مجھے یاد آیا کہ میرے اسکوٹر کا پہیہ تو پنکچر تھا۔ میں اسکوٹر روک کر نیچے اترا۔ پہیے کو دیکھا۔ ہوا ٹھیک ٹھاک تھی پھر میں نے اسٹپنی کو دیکھا۔ وہ بھی ہوا سے بھری ہوئی تھی، یہ کیسے ہوا؟ مجھ پر حیرت طاری ہو گئی۔ دیر تک اسی عالم میں چلتا رہا پھر جو نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ راستہ مانوس تھا۔

ساری رات میں سوچتا رہا۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔ شام کو میں پھر اسکوٹر لے کر چل پڑا تا کہ اس سڑک کا پتا لگاؤں جس پر غلطی سے مڑ گیا تھا۔

کچھ دیر تلاش کرنے کے بعد وہ سڑک مل گئی۔ میں اس پر چل پڑا۔ بڑ کے درخت کو دیکھ کر مجھے تسلی ہو گئی لیکن بڑ کے آس پاس جھونپڑا دکھائی نہ دیا۔ بڑ کے نیچے ایک آدمی نماز پڑھ رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے پوچھا۔

''یہاں ایک جھونپڑا تھا۔''

''جھونپڑا؟'' اس نے حیرت سے میری طرف

دیکھا۔

''نہیں۔'' وہ بولا۔ ''یہاں کوئی جھونپڑا نہیں۔''

''تو ادھر کب آیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''بابو! میں رکھ میں کام کرتا ہوں۔ روز ادھر سے گزرتا ہوں' دو بار۔ میں نے کبھی کوئی جھونپڑا نہیں دیکھا۔''

''میں کل آیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''بڑی دیر اس جھونپڑے میں بیٹھا رہا تھا۔'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا جیسے میں پاگل خانے سے چھوٹ کر آیا ہوں۔

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب پہلی مرتبہ میں نے پاکستان پر مضمون لکھا تھا۔ اسے شائع ہوئے ایک مہینہ گزرا تھا۔

میں ایک منہ زبانی مسلمان ہوں۔ میری زندگی عمل سے یکسر خالی ہے۔ میری زندگی میں چار ایک ایسے واقعات ہوئے ہیں جنہیں بیت کر مجھے پتا چلا کہ ہماری دنیاوی زندگی کے متوازی ایک رُوحانی نظام بھی چل رہا ہے۔

لیکن بنیادی طور پر میں ایک ادیب ہوں، دانشور ہوں۔ میرا باطن شکوک و شبہات سے اٹا پڑا ہے۔ ایسے واقعے سے میں چند ایک روز متاثر ہوتا ہوں پھر منکر ہو جاتا ہوں۔

پھر دو ایک ماہ کے بعد میں نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک مڑا تڑا لفافہ برآمد ہوا۔ اس میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ اوپر بسم اللہ لکھی ہوئی تھی۔ نیچے لکھا تھا۔ ''گیارہ بار صبح جاگتے وقت اور گیارہ بار رات سوتے وقت ورد کرو۔'' اس کے نیچے لکھا تھا۔ ''چھوٹا منہ' بڑی بات۔''

......☆☆☆......

ستارے

لمبی، سرد کالی راتوں میں
جب تیری یادیں
حد سے بڑھنے لگتی ہیں
تو نیند آنکھوں میں چبھنے لگتی ہے
اور ایسے میں
ترے بخشے ہوئے زخم
میری آنکھوں میں
چمکتے ستارے لگتے ہیں!
تنہائیوں میں
جینے کے سہارے لگتے ہیں



اشعر جواد



عارف شین روہیلا

آفت کی پرکالہ

میں نے زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں اتنا خودغرض ہوسکتا ہوں۔ جب اپنی جان پر بن آئی تو میں مردہ بھی قبر سے نکالنے پر تیار ہوگیا تھا۔ کیونکہ اِس کے بغیر جان نہیں چھٹ سکتی تھی۔

کرائے کے مکان میں شروع ہونے والے شیطانی چکر کی سنسنی خیز داستان

میرا کمرہ گھر کی تیسری اور آخری منزل پر ہے جو کھلا ہوا اور ہوادار ہے۔ یہاں سردیاں تو بہتر گزرتی ہیں مگر گرمیوں میں دن گزارنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ جب بچے نہیں تھے تو گرمی بھی زیادہ محسوس نہیں ہوتی تھی مگر جیسے جیسے بچے بڑھے اور گرمیوں میں آئے دن بیمار رہنے لگے تو بیگم نے گرمیاں کرائے کے مکان میں گزارنے کی فرمائش تیز کردی۔ میں ایک بے انتہا غریب' مفلوک الحال انسان ہوں' اپنی چھوٹی سی کرائے کی دکان ہے جہاں بائیک مکینک کا کام کرتا ہوں جبکہ میرے دونوں بڑے بھائی سرکاری ملازم ہونے کے علاوہ ان کے اپنے اپنے کاروبار بھی ہیں۔

جب بڑے بھائی نے اپنا مکان الگ کیا تو اُسی روز سے بیگم نے میرا جینا حرام کردیا۔ میں مانتا ہوں کہ وہ ایک دین دار اور محبت کرنے والی عورت ہے مگر میں اس قابل نہیں کہ تین مہینوں کے لیے کرائے کا مکان لوں۔ کرائے کی دکان کا تو کوئی خاص خرچ نہیں جبکہ گھر میں بجلی' گیس اور پانی کا خرچ ہوتا ہے اور کام ہو یا نہ ہو' مہینہ یوں پلک جھپکتے میں آجاتا ہے پھر ایک روز امی اور بیگم میں نجانے کس بات میں گرما گرمی ہوئی کہ شبانہ نے بچوں کو چھوڑا اور ڈوب کر مرجانے کے لیے نکل گئ' اس کے جاتے ہی ریحانہ بہن نے فون کر کے مجھے جلدی گھر آنے کا کہا۔ میری بہن نے اس قدر گھبراہٹ میں یہ بات بتائی تھی کہ میں ایک منٹ بھی دکان پر نہیں رکا اور گھبراتا ہوا بھاگم بھاگ گھر پہنچا۔ اس وقت ہماری امی سر پکڑ کر رو رہی تھیں جبکہ بہن اور دونوں بھابیاں بھی اشک بھری آنکھوں سے امی کو تک رہی تھیں۔

''کیا ہوا' خیریت تو ہے؟ کیوں رونا مچایا ہوا ہے؟'' میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی چیختے ہوئے پوچھا۔



''شبو بھابی' کراچی جانے کے لیے امی سے پانچ سو روپے ادھار مانگ رہی تھیں' امی کے پاس تھے نہیں' اسی بات پر اتنی تو تو میں میں ہوئی کہ وہ بچوں کو چھوڑ کر برقع پہن کر نہر میں ڈوب کر مرجانے کا کہہ کر چلی گئی ہیں۔'' بہن نے بتایا۔

میں نے دھیمے لہجے میں امی سے کہا۔ ''ایک تو آپ نجانے کیوں اس بے وقوف کے پیچھے پڑی رہتی ہیں؟ اب کہاں ڈھونڈوں اسے؟ اگر اس نے ایسی ویسی حرکت کرلی تو......؟'' میں نے غصے سے اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

''بھائی' جاؤ دیکھو' وہ عالیہ کے گھر گئی ہوگی۔'' ریحانہ بہن نے مشورہ دیا۔

''ہاں بھائی جان' جلدی کریں' وہ بہت غصے میں گئی ہے۔'' چھوٹی بہن نے بھی کہا۔

''ارے......تم میں سے کسی نے تو اسے روکا ہوتا؟ اسے جانے ہی کیوں دیا؟'' میں غصے میں دوبارہ دھاڑا تو امی بھی غصہ دکھاتے ہوئے بولیں۔

''ہم نے اسے بہت روکا مگر وہ کسی کی سنتی ہی کب ہے؟''

''گھبراہٹ میں' میں موبائل بھی دکان پر ہی بھول آیا تھا۔ میں فوراً عالیہ بہن کے گھر گیا اور اس سے شبانہ کا پوچھا تو اسے خود حیرت ہوئی۔ میرے کہنے پر اس نے اپنے موبائل سے شبانہ کا نمبر ملایا' کال جا رہی تھی مگر بار بار نمبر ملانے کے باوجود بھی شبانہ نے فون پر بات کرنا گوارہ نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ انسان غصے اور جذبات میں کتنا نقصان کر بیٹھتا ہے' خیر' میں فوراً دکان پر پہنچا اور وہیں سے شبانہ کا نمبر ملایا مگر اس بار بھی اس نے فون ریسیو نہیں کیا۔ میں نے فوراً ہی کراچی میں اپنی خالہ جان جو میری

ساس صاحبہ بھی ہیں اور سالیوں سے بات کی اور ان سے کہا کہ وہ شبانہ سے بات کرنے کی کوشش کریں مگر انہوں نے بھی یہی کہا کہ باجی فون نہیں اٹھا رہی ہیں۔ اس وقت تک تو یہ بات عقل میں آ گئی تھی کہ اس نے ابھی تک انتہائی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ میری بیوی ایک دین دار خاتون ہے۔ مجھے امید تھی کہ وہ خودکشی جیسا عمل نہیں کرے گی مگر انسان جتنے بھی برے اعمال کرتا ہے، غصے اور ضد میں ہی کرتا ہے۔

ذرا ہی دیر میں، میں نے انہیں عشرت بھابی اور عارفہ بہن کے گھر تک میں بھی دکھوالیا تھا مگر وہ کہیں نہیں ملی۔ دوپہر کے بعد ہی میں بچوں کو مدرسے سے لے آیا۔ جب اُن دونوں بچوں کو اپنی ماں کے چلے جانے کا پتا چلا تو وہ دونوں بھاں بھاں کرنے لگے جبکہ تیسرا خیر محمد بھی ان کی دیکھا دیکھی رونے لگا۔ مغرب کی نماز کے بعد صابر بھائی ملنے کے لیے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ سائیں نسیم صاحب یاد کر رہے ہیں۔ سائیں کا سنتے ہی میں سمجھ گیا کہ محترمہ وہاں پہنچ گئی ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو بیگم موجود تھیں۔ سائیں نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اختر میاں، آپ بہت سمجھدار ہو، اپنی بیگم کا خیال رکھو، ان کے بھی آپ پر حقوق ہیں۔"

میں نے سائیں کو صرف اتنا کہا۔ "سائیں، یہ میری غیر موجودگی میں ہماری والدہ سے لڑ کر نکلی ہیں۔" میں نے کھڑے کھڑے سائیں کو مختصر تمام بات بتائی۔ انہوں نے مزید نصیحت نہیں فرمائی اور میں محترمہ کو خاموشی سے گھر لے آیا۔

والدین، بہن اور دونوں بھابیاں و بچے انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اُسی روز سے میں نے شبانہ سے بات کرنا چھوڑ دیا۔ میں روز رات کو دیر سے گھر پہنچتا اور وہ مجھے اکثر سوئی ہوئی ملتی۔ میں رات کا کھانا باہر ہی کھا لیتا تھا، صرف سونے کے لیے ہی گھر آتا تھا۔ اس بار شبانہ کے یوں گھر سے چلے جانے پر سب ہی ڈر گئے تھے۔ امی الگ پریشان تھیں۔

دو روز بعد ہی انہوں نے مجھ سے کہا۔ "شبانہ گرمی کی وجہ سے پریشان اور چڑچڑی ہو گئی ہے تو دو تین مہینوں کے لیے کہیں کرائے کا مکان دیکھ لے۔" میں جانتا تھا کہ یہ بات امی نے بہت دکھی دل سے کہی تھی مگر حالات کے پیشِ نظر اور شدید گرمی کے آگے اس بے وقوف کا پارہ کہیں پھر نہ چڑھ جائے، میں مجبور ہو کر قریب ہی کہیں مکان دیکھنے لگا۔ کوئی ایک ہفتے بعد مجھے پتہ چلا کہ پچھلی گلی میں امام بخش کا مکان دو مہینوں سے خالی ہے۔ میں نے شبانہ کو بتایا تو وہ اُسی روز امام بخش کی بیٹی انجم سے بات کر آئی۔ آخر جمعے کے روز میں نے اپنے کمرے کا کچھ سامان اُس مکان میں منتقل کر دیا۔ میرے جانے پر ابا جی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ امی سب کچھ جانتی تھیں، انہوں نے ابا جی کو سمجھایا۔ اُسی شام گرمیوں کی پہلی برسات ہوئی تھی۔ میں اپنے والدین کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا مگر آج ایسے حالات آ گئے تھے کہ میں اپنے بوڑھے والدین کو بہتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ چھوڑ کر آ گیا تھا۔ میں غصے اور تھکاوٹ سے بے حال تھا، اوپر سے لائٹ چلی گئی۔

رات گرمی کی شدت کم تو ہو گئی تھی مگر حبس بڑھ گیا تھا۔ اپنے پلنگ پر لیٹے مجھے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ شبانہ میرے بستر پر آ گئی۔ میں نے کروٹ بدل لی تو اس نے اپنا بازو میرے شانے پر رکھ دیا۔ میں نے جھڑک کر اس کا بازو واپس ہٹایا تو وہ بے تکلف ہونے لگی۔ اُسی وقت لائٹ آئی تو وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ اس کے اس طرح دوڑ جانے پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے خود ہی اٹھ کر لائٹ بند کی اور زیرو کا بلب جلایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شبانہ تو منے عبدالغفار کے ساتھ بے خبر سو رہی ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے حیرت ہوئی۔ خیر، یہ اُس کی عادت ہے، وہ شرم سار خاتون ہے۔ اُس وقت مجھ پر غنودگی سوار تھی اسی لیے میں پھر سے اپنے بستر پر آ گیا اور جلد ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ رات پھر جانے کب لائٹ چلی گئی تو وہ دوبارہ میرے بستر پر آ گئی۔ اُس وقت اُس نے کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی میں کچھ بولا۔ میں اُس وقت لمبے آرام کے موڈ میں تھا جبکہ شاید وہ اپنے رویئے پر پشیمان تھی۔ میں بھی درگزر کرنے والا انسان ہوں اسی لیے میں نے اُس کی طرف رخ کر لیا مگر آنکھیں نہیں کھولیں پھر ذرا ہی دیر بعد وہ اپنے منے کے رونے پر واپس چلی گئی۔

رات پانچ بجے موبائل الارم نے مجھے بیدار کیا تو میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور غسل کے بعد نمازِ فجر کے لیے چلا گیا۔ فراغتِ نماز کے بعد میں گھر آیا تو تب تک شبانہ بچوں کو ناشتا بنا کر دے چکی تھی۔ آج صبح سات بجے پھر لائٹ چلی گئی تھی اسی لیے بچوں کے کپڑے استری ہونے اور مدرسے چھوڑ کر آنے میں دیر ہو گئی۔ مدرسے سے واپسی پر میں نے پہلا ناشتا امی کے پاس جا کر کیا تھا جبکہ دوسرا ناشتا بیگم کے ساتھ کیا تھا پھر میں دکان پر چلا آیا۔

دکان پر اُس روز تمام دن بے انتہا مصروفیت رہی۔ دوپہر کو میں کھانا لینے گھر پہنچا تو امام بخش کی بیٹی انجم، بیوی کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ بہت سال پہلے میرے پاس ٹیوشن پڑھتی تھی۔ اب تو بڑی ہو گئی تھی اور بہت خوب صورت بھی۔ میرے سامنے آتے ہی وہ مجھ سے ادب سے ملی پھر بیگم سے بات کر کے چلی گئی۔ مجھے بہت تیز بھوک لگ رہی تھی اسی لیے فوراً ہی کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ ابھی میں نے چند لقمے ہی لیے تھے کہ ایک خاتون گھر میں داخل ہوئیں، اُن کے ہاتھوں میں ایک کٹورا تھا جس میں گندھا ہوا آٹا تھا۔ انہوں نے آتے ہی مجھ سے پوچھا۔

"وہ...... بھابھی کہاں ہیں؟"

"وہ...... جی......" میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں باتھ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"آٹا فرج میں رکھنا ہے، ہمارا فرج کولنگ نہیں کر رہا ہے۔ شام تک کے لیے رکھ لیں، مہربانی ہوگی۔" خاتون نے عاجزی سے کہا۔

"آپ خود ہی فرج میں رکھ دیں۔" میرے کہنے پر انہوں نے خود ہی آٹا فرج میں رکھا اور گہری نظر سے مجھے دیکھتی ہوئی چلی گئیں۔

شبانہ نے باتھ روم سے نکلتے ہی پوچھا۔ "کون آیا تھا؟ کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

"کوئی خاتون آئی تھیں آٹا فرج میں رکھنے کے لیے۔" میں نے اسے بتایا۔

میرے کہنے کے باوجود اس نے فرج کھول کر دیکھا تو بولی۔ "یہاں تو آٹے کا کوئی کٹورا نہیں ہے۔ بتائیں ناں، کون آیا تھا؟" پہلے اس نے فرج میں جھانکا پھر خفا ہونے کے سے انداز میں مجھ سے پوچھا۔

"ارے، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بھئی، ایک تو آپ میری ہر بات کو مذاق سمجھتی ہیں۔" میں نے بھی اٹھ کر فرج میں جھانکا تو واقعی اندر آٹے کا کوئی کٹورا نہیں تھا۔ یہ حیرت کی بات تھی اور یہ کوئی میرا وہم بھی نہ تھا۔

بیوی نے اس بات کو مذاق سمجھا اور بولی۔ "شام کو میں عالیہ کے گھر جاؤں گی، آپ وہیں آ جانا۔" میں نے اچھا کہا اور جلدی جلدی کھانا کھانے لگا کیونکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی عبدالرحمان

کا دکان سے فون آیا تھا کہ جمشید بھائی اپنی بائیک کا انتظار کر رہے ہیں۔

شام سے رات تک میں خوب مصروف رہا۔ اُن دنوں بھی لوڈشیڈنگ ہو رہی تھی اسی لیے میں نے اپنا کام جلد ہی نمٹا لیا تھا پھر لائٹ کے جاتے ہی میں دکان بند کر کے عالیہ کے گھر جانے کی بجائے امی کے گھر چلا آیا۔ امی نے مجھے کھانا دیا پھر لائٹ آتے ہی میں چابی لے کر گلی نمبر چار والے کرائے کے مکان پر آ گیا اور ٹی وی پر ڈرامہ دیکھنے لگا۔ یہ میرا پسندیدہ ڈرامہ تھا اور عالیہ کے گھر بھی صرف اسی وجہ سے نہیں گیا تھا کہ کہیں اس ڈرامے کی قسط نہ نکل جائے۔ مجھے یقین تھا کہ شبانہ خود ہی آ جائے گی اسی لیے میں نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہی خاتون آ دھمکیں۔ انہیں دیکھتے ہی میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

خاتون نے آتے ہی پوچھا۔ ''وہ...... جی...... بھابی کہاں ہیں؟ میں آٹا لینے آئی تھی۔''

''شبانہ تو کہہ رہی تھی کہ اس میں آٹا رکھا ہی نہیں ہے؟'' میں نے خاتون کو کہا۔

''آپ کے سامنے ہی تو رکھا تھا' ویسے آپ اپنی بیوی سے بہت ڈرتے ہیں۔'' خاتون نے عجیب انداز میں یہ بات کہی تھی۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر آپ ان سے نہیں ڈرتے تو کبھی بھی ان کے لیے کرائے کا مکان نہیں لیتے۔'' خاتون کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ شبانہ نے دو ہی روز میں اپنی کارگزاری سے یہاں کی عورتوں کو آگاہ کر دیا تھا۔ خاتون نے میرے سامنے ہی فرج سے آٹا نکالا اور چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی امام بخش کی بیٹی انجم آ گئی' اس نے بھی آتے ہی یہی پوچھا کہ بھابی کہاں ہے اور یہ کہتے ہوئے میرے پلنگ پر ہی بیٹھ گئی۔ اسے اپنے اتنے قریب بیٹھتے دیکھ کر میں سمٹ کر ایک طرف ہو گیا۔

''سر' جب میں آپ کے پاس پڑھتی تھی تو اُس وقت رخسانہ آپ کو بہت چاہتی تھی جبکہ میں اُس سے بہت جلتی تھی کیونکہ آپ مجھے شروع سے ہی پسند تھے۔'' اُس بھولی بھالی معصوم سی لڑکی نے اس بہادری سے یہ بات کہی کہ میں حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ذرا بھی شرم نہیں تھی' مجھے اس کے معصوم سے چہرے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے ہمت کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ''تم جاؤ یہاں سے' تمہاری بھابی آئے تو تم آنا۔''

''مجھے معلوم تھا کہ بھابی نہیں ہیں اسی لیے تو میں آئی ہوں۔'' پھر وہ اٹھی' باہر کا دروازہ اندر سے بند کرنے لگی۔ اس کی اس حرکت پر تو میرے ہوش اڑ گئے۔

''ارے...... یہ تم کیا کر رہی ہو؟'' میں نے جیسے چیخ کر کہا مگر اس بے غیرت پر کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ وہ مست چال چلتی ہوئی میری طرف آنے لگی۔

''انجم...... رکو...... ارے...... خدا سے ڈرو...... میں تمہارے بڑے بھائی جیسا ہوں...... تھوڑی تو شرم کرو......'' میں نے اب باقاعدہ التجائیہ انداز میں اس سے کہا۔

''سر...... میں آپ کو بہت چاہتی ہوں' میں بہت پہلے سے آپ کے عشق میں مبتلا تھی' اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔ پلیز سر' مجھے اب اور نہ ترپائیں......'' یہ کہتے ہوئے وہ اور آگے بڑھی تو میں دل ہی دل میں اپنے مالک سے پناہ مانگنے لگا اور اس مصیبت سے بچنے کی دعا کرنے لگا۔

''ٹھہرو...... میں ابھی تمہارے باپ کو بلاتا ہوں......'' یہ کہتے ہی میں نے لپک کر دروازے کی

طرف بڑھنا چاہا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا راستہ روک لیا۔ میں خود کو اس آفت سے بچانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ میں نے وہیں سے آواز لگائی۔ ''امام بخش بھائی...... !عرفان...... !''

مگر بار بار آواز دینے پر بھی کسی نے توجہ نہیں دی تو اُس نے بے باکی سے کہا۔ ''سر...... آپ کیسے سنگدل ہیں' جب میں خود تیار ہوں تو آپ کیوں پیچھے ہٹ رہے ہیں؟'' پھر اچانک ہی اس نے اپنے تیور بدلے۔ پہلے اس نے اپنا دوپٹہ ایک طرف پھینکا اور بولی۔ ''سر...... اب آپ خاموش ہوتے ہیں یا میں چیخ چیخ کر لوگوں کو اکٹھا کر لوں؟'' اس نے بڑی ہمت اور بہادری سے مجھے پھانسنے کی کوشش کی تھی۔

''تم یہ اچھا نہیں کر رہی ہو؟'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''آپ وقت ضائع کر رہے ہیں۔'' اس نے خاص انداز سے کہا۔ اس وقت میں حیرت انگیز طور پر اندر سے کشمکش کا شکار تھا اور اپنی عزت بچانے کے چکر میں تھا اور وہ تھی کہ ٹلنے کا نام نہیں لے رہی تھی پھر اچانک ہی اس نے برآمدے کی لائٹ بند کر دی اور مجھے کسی بچے کی طرح گھسیٹتی ہوئی کمرے میں لے گئی اور اپنا آپ میرے سپرد کر دیا۔ مجھے شبانہ کے آنے کا خوف تھا مگر انجم کسی مقناطیس کی طرح مجھ سے چپکی ہوئی تھی۔ اچانک ہی دروازے پر دستک ہوئی' دستک سنتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ آج تو برے پھنسے تھے' اس کمینی انجم نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا تھا' خوف سے کپکپاتے ہوئے میں نے لائٹ آن کر دی۔ روشنی ہوتے ہی انجم باتھ روم کی طرف بھاگی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اس وقت میں خوف سے لرز رہا تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آج تو اس کمینی کی وجہ سے ساری عزت خاک میں ملنے والی تھی۔ خیر' میں نے ڈرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ پہلے تو بچے گھر میں داخل ہوئے پھر شبانہ۔ سب بچے غنودگی میں جھوم رہے تھے۔ شبانہ اور عادل باتھ روم جانا چاہتے تھے لیکن میں باتھ روم کے دروازے کے پاس سے نہیں ہٹا تو عادل رونے لگا۔

''ارے...... اسے باتھ روم جانے دیں' ہٹیں یہاں سے۔'' یہ کہتے ہی شبانہ نے مجھے زبردستی دروازے سے پرے دھکیلا اور دروازہ کھول دیا۔ عادل فوراً ہی باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ اس کے آتے ہی فہد منا بھی گیا اور پھر شبانہ بھی...... مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انجم میرے سامنے اندر گئی تھی جبکہ یہ لوگ اندر ہو کر بھی آ گئے تھے۔ وہ کہاں گئی؟ آخر اپنے شک کو دور کرنے کے لیے میں بھی باتھ روم میں گیا مگر باتھ روم میں کوئی بھی نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اندر سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ وہ میرے سامنے باتھ روم میں گئی تھی مگر وہاں موجود نہیں تھی' یہ حقیقت دل ہلا دینے کے لیے ہی کافی تھی۔ اندر ہی اندر خوف سے کانپتے ہوئے میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ کچھ بھی تھا۔ اللہ نے آج اتنی بڑی مصیبت سے مجھے بچا لیا تھا۔ بچے آتے ہی سو گئے۔ شبانہ میرے لیے کھانا گرم کرتے ہوئے بولی۔

''میں دیر تک آپ کا انتظار کرتی رہی۔ اگر کھانا نہیں کھانا تھا تو آنا تو چاہیے تھا؟ آپ کو پتا ہے کہ بچے سو جاتے ہیں' بڑی مشکل سے انہیں اٹھا کر لائی ہوں۔''

''میں بہت تھک گیا تھا اسی لیے نہ آ سکا۔ کھانا دو' بھوک لگ رہی ہے۔'' میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ کھانے کے دوران میں انجم کے روئیے اور اس کے باتھ روم سے پراسرار طور پر

غائب ہونے کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ میں ان ہی خیالوں میں تھا کہ انجم نے اوپر سے آواز لگائی۔

''بھائی......! میں نے موٹر کھول دی ہے' ٹنکی بھر لینا۔'' انجم کی آواز سنتے ہی میں حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں سے نکلے بغیر اپنے گھر کیسے پہنچ گئی؟ اوہ میرے خدا! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

شبانہ جب نماز سے فارغ ہو گئی تو میں نے اس سے کہا۔ ''آپ انجم کو کہیں کہ آپ کی غیر موجودگی میں نہیں آئے۔'' یہ بات میں نے ڈرتے ہوئے کہی تھی۔

''کیوں' وہ آئی تھی کیا؟'' اس نے بھی حیرت سے پوچھا۔

''جی......جی ہاں......'' میں نے اسے بتایا۔

''کیوں آئی تھی؟'' اس نے تفصیل جاننے کی کوشش کی۔

''تمہارا پوچھ کر یہیں بیٹھ گئی تھی۔'' میں نے اسے ادھوری بات بتائی۔

''وہ ایسی تو نہیں ہے۔ خیر' میں اسے کہہ دوں گی۔'' بیگم نے میری بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور منے کے ساتھ جا لیٹی جبکہ میں بھی لائٹ بند کر کے اندر کمرے میں چلا گیا اور سونے کے لیے اپنے بستر پر آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد شبانہ اندر آ گئی اور میرے ساتھ ہی پلنگ پر دراز ہو گئی۔

''مجھے برا نہ سمجھیے' مجبوری میں' میں وہاں سے نکلی ہوں' اپنے گھر سے اچھا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ میں جانتی ہوں' آپ کو اور خالہ' خالو کو کس قدر دکھ ہوا ہوگا مگر میں کیا کروں' یہ گرمی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ خدا کے لیے' مجھے معاف کر دیں' میں آپ کو دکھی کر کے خوش نہیں رہ سکتی۔'' گویا چار روز بعد شبانہ کو اب اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی میں نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا اور آنکھیں موندے لیٹا رہا پھر وہ خود ہی اٹھی اور بڑی سی چادر لا کر مجھے بھی اس میں چھپا لیا۔ وہ میرے ساتھ ہی سوتی رہی مگر جیسے ہی منے عبدالغفار کے رونے کی آواز آئی تو وہ جلدی سے اٹھی اور بچے کے پاس باہر چلی گئی۔ جب کافی دیر تک وہ نہیں آئی تو میں بھی کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ رات نجانے کس وقت وہ میرے بستر پر آ گئی۔ میں بہت تھک گیا تھا مگر شاید وہ آج ساری محبت لٹانے کے موڈ میں تھی۔ اچانک ہی خیرو نے پانی مانگا مگر شبانہ نے مجھے جانے نہیں دیا مگر جب اس نے رونا شروع کر دیا تو میں جھنجلاہٹ میں اٹھا اور اسے پانی پلانے کے لیے باہر آیا۔

اچانک میری نظر شبانہ پر پڑی' وہ اپنے منے عبدالغفار کے ساتھ لیٹی بے خبر سو رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میری آنکھیں پوری طرح سے کھل گئیں۔

اوہ مائی گاڈ! یہ سب کیا ہے؟ شبانہ تو میرے ساتھ اندر کمرے میں تھی؟ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں واپس کمرے میں پلٹا مگر کمرہ خالی تھا۔ یا اللہ! یہ سب کیا ماجرہ ہے؟ میں نے کوئی خواب دیکھا تھا؟ میں واقعی کمرے میں شبانہ کے ساتھ تھا مگر وہ تو باہر منے کے ساتھ سو رہی تھی؟ خوف سے مجھ پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی' نیند آنکھوں سے غائب ہو گئی اور ہاتھ پیر لرزنے لگے' خوف کے باعث میں شبانہ ہی کے ساتھ اس کے پلنگ پر لیٹ گیا حالانکہ پلنگ پر جگہ نہیں تھی مگر اپنا خوف کم کرنے کے لیے میں نے یہی بہتر سمجھا تھا۔ اس کے ساتھ لیٹے ہوئے میں خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا مگر نیند میری آنکھوں سے غائب تھی۔ تھوڑی دیر بعد شبانہ نے کروٹ بدلتے ہوئے پوچھا۔

''نیند نہیں آ رہی کیا؟''

''آں......ہاں......''

''اللہ کا نام لیں اور سونے کی کوشش کریں۔'' اس نے پیار سے کہا۔

''پھر بھی نیند نہیں آ رہی؟'' میں نے بے چارگی سے کہا۔

''جائیں' وضو کر کے آ جائیں پھر نیند آ جائے گی۔'' اس وقت مجھ پر خوف سوار تھا' سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے' وہم تھا یا خوف مگر میں جانتا ہوں' یہ حقیقت تھی مگر شبانہ کو کیسے بتاتا' عورتیں تو ویسے بھی ڈرپوک ہوتی ہیں۔ ان ہی سوچوں میں جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

صبح بچوں کو اسکول چھوڑ کر آنے کے بعد میں نے ناشتا نہیں کیا اور پیٹ کے درد کا بہانہ بنا کر لیٹا رہا۔ ناشتے کے بعد جب وہ برتن دھونے لگی تو میں برش لیتا ہوا اس کے قریب آ بیٹھا اور برش کرتے ہوئے اس سے بولا۔ ''دیکھیں' میں نے آپ کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں' اب تو اپنا دل صاف کر لیں۔''

''کرائے کا مکان ضد نہیں' ضرورت ہے۔ میں خود خالہ جان کو چھوڑنا نہیں چاہتی اور میں آپ کی مالی حیثیت بھی سمجھتی ہوں مگر میں ان گرمیوں میں مجبور ہوں۔''

''رات آپ میرے پاس کمرے میں کب آئی تھیں؟'' میں نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

''میں تو نہیں آئی تھی؟'' اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''یاد کریں۔''

''آپ یاد کریں' بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔ میں نے کلی کی اور اسے گدگدانے لگا تو وہ معصوم بچے کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔

اچانک ہی خیرو گھر میں داخل ہوا اور رونی سی صورت بنا کر بولا۔ ''مس فیس اور کورس کے پیسے منگوا رہی ہیں۔''

''کہا تو تھا کہ ایک دو دن بعد دے دیں گے۔'' بیگم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''آپ چلیں' انہوں نے کل بھی مجھے مارا تھا۔'' خیرو ضد کرتے ہوئے بولا۔

''آپ جائیں بھئی' اس کی مس سے بات کریں' وہ بچے کو کیوں بھیج رہی ہیں؟'' میں نے کہا۔ بیگم کو غصہ آ گیا اور وہ برقع اوڑھ خیرو کے ساتھ چلی گئی۔

اسے گئے ابھی چند لمحے ہی ہوئے تھے' وہی خاتون گھر میں داخل ہوئی جو پہلے گندھا ہوا آٹا فرج میں رکھوا کر گئی تھیں۔ اس بار بھی اس کے ہاتھوں میں گندھے ہوئے آٹے کا برتن تھا جبکہ گوشت کی تھیلی بھی تھی۔

''یہ چیزیں فرج میں رکھ لیں جی' میں شام کو لے لوں گی۔''

''آپ خود ہی رکھ دیں۔'' میرے کہنے پر اس نے وہ چیزیں فرج میں رکھیں اور گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں تو سمجھی تھی کہ آپ اپنی بیوی سے ڈرتے ہیں مگر آپ تو بہت بہادر اور چھپے رستم نکلے......''

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ نے تو اپنی شاگرد انجم کو بھی نہیں چھوڑا......؟'' اس نے بے باکی سے کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' میں نے اندر ہی اندر خوف سے سہمتے ہوئے کہا۔

''چھوڑیں جی' اس نے خود ہی مجھے رو رو کر بتایا ہے' اس کا کہنا پتھر پر لکیر ہے۔ ابھی تک تو اس نے صرف مجھے بتایا ہے' اب اگر اس نے اپنے گھر والوں

کواور آپ کی محبت کرنے والی بیگم کو یہ بات بتادی تو سوچیں کیا ہوگا؟'' اس خاتون نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟'' میں نے خوف سے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

''آپ گھبرائیں نہیں۔'' وہ سکون سے بولی۔ ''اصل میں وہ ہے ہی بے غیرت...... خود ہی آپ کے پاس آئی ہوگی...... میں جانتی ہوں' اس مکان میں آنے والے نجانے کتنے کرائے داروں سے وہ اپنا منہ کالا کرا چکی ہے۔ آپ فکر نہ کریں' وہ کسی کو نہیں بتائے گی' میں اسے سمجھاوں گی۔ اصل میں ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں' آپ میرا کام کردیں' ہم اپنی زبان بند کرلیں گے۔'' اس خاتون نے مکاری اور سودا کرنے کے سے انداز میں کہتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔

''آ...... آپ کا کون سا کام......؟'' میرے منہ سے بمشکل نکلا۔

''میں بھی انجم کی طرح بھوکی ہوں' اگر آپ نے منع کیا تو سوچ لیں' آگے عمر بھر کی ذلت کی زندگی ہے۔ ڈریں نہیں' میں خود آپ کی جھولی میں گرنے کے لیے آئی ہوں......''

''میری بیگم آنے والی ہیں' ابھی تو آپ جائیں......'' میں نے خوف سے سہمتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ آپ کی بیگم بیٹے کے ساتھ اسکول گئی ہیں' وہ دیر سے آئیں گی' آپ وقت ضائع نہ کریں......'' اس خاتون نے بے باکی سے کہا اور پلٹ کر دروازہ بند کردیا اور میری طرف بڑھنے لگی۔ اس وقت بیگم کی آمد کے خوف سے میرا برا حال تھا جبکہ وہ خاتون اپنا سب کچھ لٹانے کے درپے تھی۔ ابھی چند لمحے ہوئے تھے کہ برابر والے اسلم بھائی کے گھر میں سے ایک چوہا ہمارے گھر میں آیا تو اس کے پیچھے ایک بلی بھی آ گئی' چوہا ڈر کر کمرے میں آیا تو بلی بھی اس کے تعاقب میں کمرے میں آ گئی' بلی کو دیکھتے ہی اس خاتون نے ایک خوفناک چیخ ماری اور اچانک ہی اس کی شکل تبدیل ہوگئی' اس کے ہاتھ پاؤں پیچھے کی طرف ہو گئے' دانت لمبے ہو گئے اور زبان منہ سے باہر نکل آئی' وہ چیخ مار کر مجھ پر سے ہٹی' اسے دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے جبکہ وہ اسی حالت میں دوڑتی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی۔

یہ ایسا خوفناک منظر تھا کہ خدا کی پناہ......! اب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ انجم بھی یہی تھی' اس کی دوسری شکل تھی۔ میں کانپتا ہوا دروازہ کھول کر باہر گلی میں آ گیا اور بے چینی سے شبانہ کا انتظار کرنے لگا۔ جب شبانہ گلی میں داخل ہوئی تو میں بھی اس کے ساتھ گھر میں آ گیا۔ میں نے شبانہ کو بتایا کہ وہ خاتون پھر آٹا اور گوشت رکھنے کے لیے آئی تھی۔ اس نے فرج میں جھانکا مگر وہاں اس بار بھی کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ آپ اوپر والی خاتون کو منع کریں کہ وہ آپ کی غیر موجودگی میں یہاں نہ آئے تو شبانہ ہنستے ہوئے بولی۔

''اوپر والا مکان تو دو مہینوں سے خالی پڑا ہے......'' شبانہ کی بات سن کر میرا شک' یقین میں بدل گیا کہ اس مکان میں ضرور اثرات ہیں۔ شبانہ کو میں تمام واقعات بتا سکتا تھا مگر جانتا تھا کہ عورتیں ڈرپوک ہوتی ہیں۔ اب مجھے جلد از جلد اس مکان کو خالی کرنا تھا۔ اب تک جو کچھ میرے ساتھ ہو چکا تھا' وہ کسی بھی انسان کو ہلا دینے کے لیے کافی تھا اور اب جبکہ میں اس بدروح کا اصلی چہرہ دیکھ چکا تھا' مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے ضرور نقصان پہنچائے گی اور میں یہ بھی دیکھ چکا تھا' وہ بدروح بلی سے ڈرتی ہے۔ زندگی کا سوال تھا اس لیے میں گوشت مارکیٹ سے بلی

کے دو بچے لے آیا۔ شبانہ کو میرے اس عمل پر حیرت ہو رہی تھی مگر میں نے اسے کچھ نہیں بتایا اور سائیں فیاض صاحب کے گھر جا پہنچا۔ وہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ اُن دنوں سائیں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی مگر انہوں نے مجھ سے ملاقات کی۔ میں نے بہت ہمت کر کے سائیں کو وہ تمام واقعات جو کہ میرے ساتھ پیش آئے تھے' بتائے۔

''حیرت ہے' تم جیسا نمازی پرہیزی اس کے چکر میں آ گیا؟ خیر' اللہ نے رحم کردیا۔ اب تم پہلی فرصت میں اس مکان کو خالی کردو۔''

''مگر سائیں' بیگم کو کیسے سمجھاؤں؟'' میں نے ادب سے پوچھا۔

''گھر پہنچ کر تم اُن سے میری بات کرادینا۔''

''بہتر سائیں......!'' میں نے کہا۔

سائیں نے مجھے ایک تعویذ لکھ کر دیتے ہوئے کہا۔ ''اسے اپنے بازو پر اور فوٹو کاپی کرا کے باہر کے دروازے اور اندر کمرے کے دروازے پر باندھ دینا۔ اب وہ تمہیں ڈرانے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گی۔'' سائیں کی بات پر میں مزید خوف زدہ ہوگیا۔ گھر آتے ہی میں نے سائیں کو فون کر کے بیگم کی بات کرادی۔ سائیں نے ان سے نجانے کیا کہا کہ وہ فوراً ہی گھر جانے پر راضی ہوگئی۔ بیگم کے اس طرح گھر آنے پر امی' بہن اور بھابیاں سخت حیرت زدہ تھیں۔ ان سب نے پوچھنے کی کوشش بھی کی مگر شبانہ نے انہیں صرف اتنا بتایا کہ میرا دل چاہ رہا تھا اسی لیے یہاں آ گئی۔

بڑے بھائی صاحب نے اماں کو کہا کہ کسی طرح وہ بھی مکان خالی نہیں چھوڑنا' اس گلی میں بہت چور لڑکے رہتے ہیں۔ یہ بات میرے والدین اس سختی سے کہتے رہے کہ میں بحالت مجبوری جب گھر جانے لگا تو شبانہ بھی میرے ساتھ آ گئی۔

میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا' وہ لرزا دینے کے لیے کافی تھا۔ اب اگر بیوی یا بچوں کے ساتھ کچھ ہوا تو انہیں سنبھالنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ میں بیگم کو سمجھا نہیں سکتا تھا کیونکہ اپنے ساتھ ہونے والے واقعات کی میں کتنی بھی قسمیں کھاتا' دلائل دیتا مگر وہ اعتبار نہیں کرتی اور واپس اماں کے گھر جانے کا بہانہ سمجھتی۔ بہرحال میں انتہائی خوف زدہ کیفیت میں گلی نمبر چار والے مکان میں آ گیا۔

اس دن شدید گرمی تھی اسی لیے رات بھی حبس کا عالم تھا۔ شبانہ کھانا تیار لائی تھی۔ اس نے بچوں کو کھانا کھلایا اور بچوں کا بستر لگا کر خود نمازِ عشاء ادا کرنے لگی جبکہ میں ٹی وی پر پروگرام دیکھنے لگا۔ نماز کے بعد اس نے کچھ دیر تسبیح پڑھی اور پانی پر دَم کر کے مکان میں چاروں طرف چھڑکنے لگی پھر تھوڑی دیر بعد وہ پلنگ پر آ گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ لیٹ گیا اور تسبیحات پڑھنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد شبانہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی جبکہ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اصل میں' میں خود بھی سونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ بلا میرے سونے کے دوران ہی آتی تھی پھر رات گیارہ بجے کے بعد لائٹ چلی گئی تو نجانے کب مجھے نیند آ گئی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ باہر کا دروازہ بجا۔ پہلے تو میں نے کوئی اہمیت نہیں دی مگر جب وہ دستک بار بار ہونے لگی تو میں بے زار ہو کر اٹھا اور دروازے کے قریب جاتے ہی بولا۔

''کون ہے؟'' مگر باہر سے کوئی جواب نہیں آیا تو میں واپس اپنے بستر آ گیا۔ تھوڑی دیو بعد دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اب کی بار آواز ذرا تیز آئی تو میں جھنجھلا کر اٹھا اور درولنے کے قریب گیا۔

''کون ہے؟'' مگر اس بار بھی جواب نہیں آیا تو

میں سہم گیا۔ شبانہ بھی بیدار ہو گئی تھی۔
''کیا ہوا' خیر تو ہے؟''
''کوئی دروازہ بجا رہا ہے مگر آواز نہیں دے رہا کہ کون ہے؟'' میں نے پریشانی سے کہا۔
''مگر مجھے تو دروازے کی کوئی آواز نہیں آئی؟'' اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی اوپر جانے والے زینے کا دروازہ بجنے لگا تو میں نے چونک کر کہا۔
''دیکھا تم نے' سنو۔''
''تمہارا وہم ہو گیا ہے' مجھے تو کوئی آواز نہیں آرہی؟'' اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''کیا کہہ رہی ہو' کیا میں پاگل ہوں؟'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ باتھ روم کی چھت ایک دھماکے سے گر گئی۔ ہم دونوں ہی گھبرا گئے۔ ہم نے جلدی جلدی بچوں کو اٹھایا اور خوف زدہ ہوتے ہوئے کمرے میں آگئے۔ اس وقت تک لائٹ نہیں آئی تھی۔ دھماکے کی آواز سن کر امام بخش اور اس کے گھر والے اوپر سے جھانکتے ہوئے بولے۔
''کیا ہوا بھائی' خیریت تو ہے؟''
''خیریت نہیں' جلدی یہاں آؤ' باتھ روم کی چھت گر گئی ہے۔'' میری آواز اور لہجے میں اتنا کرخت پن تھا کہ وہ بے چارے فوراً ہی نیچے ہمارے مکان میں آگئے۔
''بھائی امام بخش' آپ نے ہمیں کیوں نہیں بتایا کہ اس مکان میں کسی بدروح کا اثر ہے؟ میرے ساتھ چار بار ایسا ہو چکا ہے' اب جبکہ میں نے کاٹ کرائی تو اس کا اثر دیکھیں' رات بھر یہاں دروازے بجتے ہیں اور میری بیگم تک کو آواز نہیں آتی۔ اس بدروح نے ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہے' کبھی وہ آپ کی بیٹی انجم کی صورت میں آتی ہے اور کبھی کسی اور صورت میں' ہم یہاں سکون کے لیے آئے تھے اور یہاں آکر ہماری زندگی جہنم بن گئی ہے۔'' میں غصے میں انہیں نجانے کیا کچھ کہہ گیا۔ بچے تو اُسی وقت رونے لگے جبکہ شبانہ حق دق میری شکل دیکھنے لگی۔
''مم...... مگر ہمارے ساتھ تو کبھی ایسا نہیں ہوا؟'' امام بخش نے ممیاتے ہوئے کہا۔
''آپ یہاں نہیں رہتے نا' اسی لیے...... ہم ابھی اسی وقت یہاں سے جا رہے ہیں۔ آپ یہاں رہیں گے تو سب پتا چل جائے گا۔ آپ رہیں اس گھر میں۔ ہمیں کل ہی مکان خالی کرنا ہے۔'' یہ کہتے ہی میں نے خوف زدہ بیگم و بچوں کو لیا اور گھر آگیا۔ ہمارے یوں آنے پر اماں کو مزید حیرت ہوئی تھی۔
''کیا ہوا......؟ کیوں آگیا......؟''
''امی...... لائٹ نہیں ہے اور اوپر سے ہوا بھی بند ہے۔ کم از کم یہاں رات تو سکون سے گزار سکتے ہیں۔'' میں نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ اوپر آتے ہی ذرا دیر میں بچے تو سو گئے مگر بیگم کو نیند نہیں آرہی تھی' وہ اب بھی میری باتوں پر اعتماد نہیں کر رہی تھی مگر جب میں نے تمام حقیقت اسے قسم کھا کر بتائی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
وہ میرے سینے سے لگتے ہوئے بولی۔ ''اللہ آپ کو سلامتی دے' اپنی امان میں رکھے۔ ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ اتنی بڑی بات ہو گئی اور میں بے خبر رہی؟ مجھے معاف کر دیں۔''
''وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ سائیں کے دیئے ہوئے تعویذ کی وجہ سے وہ بلا گھر میں داخل نہیں ہو سکی ورنہ وہ اندر آکر نجانے کیا کرتی۔''
''اب آپ اس مکان میں مت جانا۔'' اس نے مجھے گویا تنبیہ کی تھی۔

''مگر سامان تو لانا ہی ہے نا؟'' میں نے اس سے کہا۔ ''اگر میں وہاں اکیلا گیا تو وہ بلا مجھے ضرور نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گی۔''
''پھر کیا کریں؟'' بیگم کے چہرے پر تفکر نمایاں تھا۔
''صبح سائیں فیاض صاحب سے بات کرتا ہوں' وہی کوئی حل بتائیں گے۔'' میرے تسلی دینے پر وہ زمین پر ہی بچوں کے ساتھ لیٹ گئی جبکہ میں بھی اس کے قریب ہی لیٹ گیا۔ ابھی مجھے لیٹے کوئی آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ اچانک مجھے لگا کہ جیسے کوئی پوری قوت سے مجھ پر آگرا ہو اور میرا گلہ دبا رہا ہو۔ میں نے خود کو اس عذاب سے چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر مجھ پر وزن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ خوف و وحشت سے میں چیخنے لگا تو بیگم ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔
اس نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہوا' بولتے کیوں نہیں؟''
''وہ...... وہ...... کوئی میرا گلہ دبا رہا تھا۔ اگر آ...... آپ مجھے نہ جھنجھوڑتیں تو وہ بلا میری جان ہی لے لیتی......'' میری بات سن کر بیگم بھی خوف سے کانپنے اور رونے لگی۔
''اب کیا کریں؟ یا اللہ! ہم پر رحم فرما۔''
رات کے بارہ بجنے والے تھے مگر سائیں فیاض صاحب کو فون کرنا ضروری تھا اسی لیے میں نے ان کا نمبر ملایا۔ فون سائیں کی بیوی نے اٹھایا تھا۔
''باجی...... میں اختر بات کر رہا ہوں۔ اس وقت ہم بڑی مصیبت میں ہیں۔ سائیں سے بات کرنی ہے' یقیناً وہ اس وقت آرام میں ہوں گے۔ برائے مہربانی آپ ان سے ہماری بات کرا دیں۔'' میں نے عاجزی سے کہا۔
''صبح بات کر لینا' وہ ابھی ابھی سوئے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔
''سائیں کو ہماری پریشانی کا علم ہے۔ پلیز مہربانی کریں۔'' انہوں نے تھوڑی دیر بعد ہی سائیں سے بات کرا دی۔ سائیں نے فون پر آتے ہی پوچھا۔
''خیریت تو ہے میاں' کیا ہوا؟'' اس وقت میرے ساتھ جو کچھ بھی پیش آیا تھا' وہ میں نے انہیں بتا دیا۔
''آپ ابھی جائیں اور دروازے پر جو تعویذ آپ نے باندھا ہے' وہ لے کر اس کی فوٹو کاپی کرائیں اور اسے بھی اپنے والدین کے گھر کے دروازے اور اپنے کمرے کے دروازے پر باندھ دیں۔ اللہ خیر کرے گا اور کل ظہر کی نماز کے بعد آپ مجھ سے ملیں۔'' سائیں کے کہتے ہی میں گلی نمبر چار والے مکان پر پہنچا اور دروازے پر بندھے ہوئے تعویذ کو کھول کر میں فوٹو کاپی کرانے کے لیے چلا گیا مگر رات بارہ بجے کہاں دکانیں کھلی ہوتی ہیں۔ اپنی جان کی فکر تھی اسی لیے گھر آکر بھائی کی موٹر سائیکل نکالی اور صدر جا پہنچا۔ وہاں ایک دکان کھلی ہوئی تھی' وہیں سے فوٹو کاپی کرا کے پہلے گلی نمبر چار والے مکان کے دروازے پر وہ تعویذ باندھا تو اچانک ہی اندر سے ان بلی کے بچوں کی آوازیں آنے لگیں جنہیں میں بلا سے بچنے کے لیے لایا تھا۔ ان کا خیال آتے ہی میں نے ڈرتے ہوئے دروازہ کھولا اور ان بلی کے بچوں کو اپنے ساتھ گھر لا کر تعویذ اندر اور باہر دروازے پر باندھ دیئے۔ بلی کے بچوں کو دیکھ کر امی حیران ہو گئیں۔ اس وقت میرے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں جنہیں شاید امی پڑھ چکی تھیں اسی لیے انہوں نے حیرت کا اظہار کیا مگر کہا کچھ نہیں۔ اوپر کمرے میں آکر میں نے وہ تعویذ کمرے کے دروازے پر بھی باندھ دیا جبکہ بلی کے بچوں کو باہر برآمدے میں چھوڑ دیا۔ بیگم کی

کیفیت مجھ سے مختلف نہ تھی' اس پر بھی بے انتہا خوف سوار تھا۔ وہ بار بار کچھ پڑھ کر پانی پر دم کرتی اور کمرے و برآمدے کی دیواروں پر چھڑکنے لگتی۔ اچانک مجھے لگا کہ جیسے کوئی ہمارے کمرے کی چھت پر چل رہا ہے' یہ آوازیں شبانہ کو بھی آ گئی تھیں جبکہ کمرے کی کھڑکی جو کہ گلی نمبر چار کی طرف کھلتی ہے' زور زور سے ہلنے لگی حالانکہ وہ بہت مضبوطی سے دیوار میں لگی ہوئی تھی پھر اچانک ہی وہ مضبوط کھڑکی ٹوٹ کر سوئے ہوئے بچوں کے قریب آ گری۔ اس وقت بدحواسی و خوف کے عالم میں ہم دونوں نے سوتے ہوئے بچوں کو اٹھایا اور روتے چیختے ہوئے زینے سے نیچے کی جانب دوڑے۔ ہماری آوازیں سن کر گھر والے جاگ اٹھے۔

امی نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہوا' خیر تو ہے؟''

''امی......! ہمیں اوپر ڈر لگ رہا ہے۔'' میں نے سہمے ہوئے انہیں بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئیں۔ لائٹ ابھی تک نہیں آئی تھی جبکہ ہم پر بے انتہا خوف سوار تھا۔ امی نے اندر والا کمرہ کھول دیا اور ہم کمرے میں سمٹ کر لیٹ گئے۔ خوف کی وجہ سے نیند آنکھوں سے دور تھی۔ ہر وقت کھٹکا لگا ہوا تھا کہ اب کچھ نہ ہو جائے؟ اس انہونی مصیبت نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا پھر ساڑھے بارہ بجے لائٹ آنے پر پنکھے چلے تو سکون ملا اور ہم سب نجانے کب سو گئے۔

صبح شبانہ نے امی کے گھر سے ناشتا بنا کر بچوں کو اسکول بھیج دیا جبکہ میں بھی ناشتے کے بعد ذرا دیر گھر پر رہا پھر دکان جانے کے بجائے سائیں فیاض صاحب کے گھر چلا آیا۔ میں نے انہیں تمام روداد سنائی تو وہ بھی پریشان ہو گئے پھر اسی وقت انہوں نے کوئی نمبر ملایا' رابطہ ہوتے ہی انہوں نے کہا۔

''حافظ صاحب......! خیریت سے ہیں؟ بھئی ہمارے دوست کے ساتھ ایک اہم مسئلہ ہو گیا ہے اور آپ کی مدد کی اشد ضرورت ہے۔'' یہ کہتے ہی انہوں نے میرے ساتھ ہونے والے تمام معاملات دوسری طرف سنا دیئے پھر ان سے ٹائم لے کر وہ مجھ سے گویا ہوئے۔

''لو بھئی' اب سمجھ لو کہ تمہاری مشکلیں دور ہوئیں' کوٹری میں ہمارے پیر بھائی حافظ رضوان رہتے ہیں' وہ ان بدروحوں سے نمٹنا خوب جانتے ہیں۔ میں کئی لوگوں کو اُن کے پاس بھیج چکا ہوں' تم بھی اُن سے مل لو۔ انشاء اللہ' تمہاری مشکل حل ہو جائے گی۔'' یہ کہتے ہی سائیں فیاض صاحب نے مجھے حافظ رضوان کا ایڈریس سمجھایا جسے میں نے موبائل میں سیو کر لیا اور سائیں کا شکریہ ادا کر کے فوراً ہی کوٹری کے لیے روانہ ہو گیا۔ حافظ صاحب گھر پر ہی میرا انتظار کر رہے تھے' بہت تپاک سے ملے اور توجہ سے میری تمام باتیں سن کر بولے۔

''میاں' میں اس وقت کسی اور کے کام سے جا رہا ہوں۔ آپ کے ساتھ جو مسئلہ ہے' کسی بدروح کا ہے۔ خیر' اللہ مالک ہے۔ آپ گھر جائیں' میں دوپہر ایک بجے کے بعد آپ کی طرف آؤں گا تو وہ مکان بھی دیکھ لوں گا جس میں اس کا اثر ہے۔'' انہوں نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''حافظ صاحب......! مجھ پر نظرِ عنایت فرمائیں۔ میں مصیبت زدہ آپ کا محتاج ہوں۔'' میری عاجزی شاید انہیں اچھی نہیں لگی۔

''آپ ایک مردِ قلندر کے مرید ہیں' ہمت کریں۔ میں ہر طرح سے آپ کے ساتھ ہوں' آپ اپنا فون نمبر مجھے دے دیں اور میرا انتظار کریں۔ اللہ آسانی فرمائے گا۔'' یہ کہتے ہی انہوں نے مجھے رخصت کیا اور میں اپنی والدہ محترمہ کے گھر آ گیا۔ اماں بار بار پوچھتی رہیں کہ رات کیا ہوا تھا؟ کیوں ڈر گیا تھا؟ مگر میں انہیں کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا۔

پہلے وہ مکان ہمارے لیے مصیبت تھا مگر وہ مصیبت اب یہاں بھی آ گئی تھی۔ اگر یہ بات میں گھر میں کسی کو بتا دیتا تو سبھی خوف زدہ ہو جاتے اسی لیے مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا' جلدی کرنا تھا۔ دوپہر ایک بجے کے بعد حافظ صاحب کا انتظار شروع ہوا مگر وہ نمازِ ظہر کے بعد تک نہیں آئے۔ فکر و خوف کی وجہ سے کھانا پینا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ تین بجے کے بعد وہ آئے اور دیر سے آنے کی معذرت کرنے لگے۔ مجھے امام بخش والے مکان سے ضرورت کی چیزیں لانی تھیں اسی لیے انہیں لے کر فوراً ہی گلی نمبر چار والے مکان پر پہنچا۔ دروازہ کھولتے ہی میں نے حافظ صاحب کو آگے کر دیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی خوف سے میرا وجود لرزاں تھا۔ اوپر والے مکان کا دروازہ جو کہ اسی مکان کی طرف کھلتا ہے' وہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ حافظ صاحب اندر کمرے اور باتھ روم تک کا جائزہ لینے کے بعد وہیں بیٹھ گئے۔

''میاں......! یہ تعویذ جو آپ نے اپنے اور گھر میں باندھے ہیں' اس بلا کو روک تو سکتے ہیں مگر اس سے آپ کو بچا نہیں سکتے اور اگر آپ نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس کا انجام...... آپ یہ باتھ روم کی گری ہوئی چھت' یہ دروازہ اور اپنے گھر کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی دیکھ رہے ہیں۔''

''اب میں کیا کروں؟'' میں نے بے چارگی سے پوچھا۔

''یہ مصیبت جان لے کر جائے گی مگر پھر آ جائے گی لہٰذا اسے مردار کے ساتھ دفن کرنا پڑے گا۔'' انہوں نے کہا۔

''مردار کے ساتھ......؟ میں سمجھا نہیں......'' میں نے پوچھا۔

''کسی نومولود بچے کی نعش چاہیے ہو گی' جتنی جلدی نعش مل جائے گی' اتنی جلدی ہی جان چھوٹے گی۔''

''نعش......؟ وہ بھی نومولود کی......؟ مگر نعش کا بندوبست کیسے ہو گا؟'' میں نے ششدر ہو کر پوچھا۔

''میاں......! اللہ کی زمین پر روز بچے پیدا ہوتے ہیں۔ روز مرتے ہیں۔ آپ کسی سے ملیں' بات کریں' کسی قبرستان کے گورکن سے بات کریں' ان کا دھندہ ہی یہی ہے' اپنی جان چھڑانے اور دیگر گھر والوں کو بچانے کے لیے یہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔''

''یہ گناہ مجھ سے کیسے ہو گا؟'' میں نے خوف سے سہمتے ہوئے خود کلامی کی۔

''یہ گناہ نہیں ہے' کیا اپنی جان بچانے کے لیے ہم زندہ جانور کا صدقہ یا قربانی نہیں دیتے؟ بس اس کو جان کا صدقہ سمجھیں۔ آپ سائیں فیاض صاحب کے پاس جائیں' وہ آپ کو دوسرا تعویذ دے دیں گے۔ جب تک آپ سوچ لیں' سمجھ لیں' مشورہ کر لیں اور اگر اس بلا سے چھٹکارہ حاصل کرنا ہے تو نعش کا بندوبست کر کے مجھے فون کر دینا۔ یہ عمل رات کو کرنے کا ہے' ایک بکرے کی سری کی بھی ضرورت ہو گی۔'' یہ کہتے ہی وہ اٹھے اور میرے ساتھ ہی باہر آنے لگے تو میں نے جلدی جلدی کچھ ضروری چیزیں اٹھائیں اور مکان کو تالا لگا کر ان کے ساتھ ہی باہر آ گیا۔

سائیں فیاض صاحب کو میں نے تمام روداد سنا دی۔ اتنے مشکل عمل کے بارے میں جان کر وہ بھی حیران ہو گئے۔ انہوں نے مجھے ہمت کرنے کی تلقین

کی اور دوسرے تعویذ لکھ کر دے دیئے۔

یہ ایسا اہم معاملہ تھا کہ اس کا مشورہ بیگم سے نہیں ہوسکتا تھا اسی لیے میں سیدھا نعیم کے پاس چلا گیا۔ نعیم میرا بچپن کا دوست ہے اور میرے اس سے قریبی تعلقات ہیں' اس وقت تو وہ اپنی دکان پر مصروف تھا مگر جیسے ہی وہ فارغ ہوا' میں نے اپنا تمام مسئلہ اسے بتا دیا۔ میرے معاملات سن کر اس کی سٹی بھی گم ہوگئی پھر اس نے بھی یہی مشورہ دیا جو کہ حافظ صاحب و سائیں فیاض صاحب نے دیا تھا۔ کسی نومولود بچے کی نعش حاصل کرنا میرے لیے بہت مشکل تھا۔ بچہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو بازار سے مل جائے۔ بہرصورت اب جو کچھ بھی کرنا تھا' جلدی کرنا تھا۔

قبرستان میں کام کرنے والے میرے دو تین واقف کار تھے' ان سے بات کرسکتا تھا مگر اپنی عزت کا ڈر تھا۔ دوسری طرف اپنی جان کی بھی فکر تھی اسی لیے نعیم کے سمجھانے پر میں سیدھا عبدالرحمان گورکن کے پاس گیا۔ قبرستان کے قریب اس کی پھولوں کی دکان تھی۔ اس کے بھتیجے نے بتایا کہ وہ اندر قبرستان میں کام کر رہا ہے۔ میں قبرستان میں عبدالرحمان کے پاس جا پہنچا۔ اس وقت وہ ٹھیکے دار کے طور پر ایک قبر پر مزدوروں کے ساتھ مل کر ٹائل لگوا رہا تھا۔ مجھے یوں قبرستان میں دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ سلام دُعا کرنے کے بعد میں اسے ایک طرف چھاؤں میں لے گیا اور اپنی تمام روداد اسے سنا دی اور اپنا مسئلہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

''اللہ معاف کرے' میں نے کبھی ایسا نہیں کیا مگر جو لوگ یہ کرتے ہیں' میں ان کے حال سے بھی واقف ہوں۔ کتا اگر قبر کھود کر نعش کھا جائے تو پولیس کیس نہیں بنتا مگر نعش قبر میں سے غائب ہو جائے تو یہ جرم ہے۔ جو لوگ یہ کام کرتے ہیں' میں تیری ان سے ملاقات کرائے دیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ایسا نہیں کرنا عبدالرحمان......! میں کسی کے سامنے نہیں آسکتا تو ہی کچھ کر یار' میری اور میرے گھر والوں کی زندگی کا مسئلہ ہے۔'' میں نے عاجزی سے اپنے ہاتھ جوڑتے ہوئے اس سے کہا تو وہ خاموش ہوگیا۔

''یار' تو نے مجھے عجیب مشکل میں ڈال دیا ہے۔'' اس نے پریشانی سے کہا۔

''میں تیرا احسان مند رہوں گا میرے بھائی......!'' میں نے منت کرتے ہوئے کہا۔

''میں کوشش کرتا ہوں مگر نعش واپس دینا ہوگی......''

''ہاں' ہاں' جیسے ہی عمل پورا ہو جائے گا' تجھے نعش واپس دے دوں گا۔'' میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''تو ٹھیک ہے' میں دیکھتا ہوں۔ اگر ایسا کوئی بچہ قبرستان میں دفن کرنے کے لیے لایا گیا تو میں تجھے فون کردوں گا تو فوراً بائیک لے کر آجانا۔'' عبدالرحمان کے کہنے پر میں نے اپنا موبائل نمبر اسے دیا اور گھر چلا آیا۔ اُس روز بھی بڑے بھائی صاحب کہتے رہے کہ مکان کو یوں اکیلا مت چھوڑ' اس گلی میں بہت چور لڑکے رہتے ہیں مگر میں نے ان کی بات سنی اَن سنی کردی۔ میرے ذہن میں بس یہی تھا کہ میں ابھی جینا چاہتا ہوں اور اگر میں نے اس بلا کا راستہ نہیں روکا تو میرے مرنے کے بعد بیگم اور بچوں کی جان پر بن آئے گی۔ اس وقت انہیں کون بچائے گا یا گھر والوں میں سے کسی کے ساتھ یہ معاملہ ہوگیا تو کیا ہوگا؟! اگر جان اسی طرح بچ سکتی ہے تو یہ کر گزرنا تھا۔

سائیں فیاض صاحب نے اس بار جو تعویذ دیا تھا' اس سے کچھ خوف ضرور کم ہوگیا تھا۔ جب میں دوپہر کے بعد کرائے والے مکان میں سے ٹی وی لینے گیا تو اس وقت مجھ پر وحشت طاری نہیں تھی حالانکہ میں اس وقت اکیلا گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بلا میری تاک میں ہی ہوگی مگر رب العزت کی بڑی مہربانی ہوئی کہ میں ساتھ خیریت سے واپس آگیا۔ حافظ صاحب نے ایک اہم بات اور بتائی' انہوں نے کہا تھا کہ جب تک اس بلا سے جان نہیں چھوٹ جائے' کوئی بھی سامان اس مکان سے گھر میں مت لانا کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ آسیب سامان کے ساتھ ہی اس گھر سے نکل کر مستقل طور پر تمہاری والدہ کے گھر میں آجائے۔ اس دہری مصیبت نے عجیب پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ بیگم و بچوں کو اب میں وہاں لے جا نہیں سکتا تھا جبکہ وہاں سے گھر کا سامان لا بھی نہیں سکتا تھا۔ امی بھی حیرت زدہ تھیں' وہ یقیناً سوچ رہی ہوں گی کہ کل تک تو اس کی بیوی یہاں سے اڑ جانا چاہتی تھی اور آج اپنا تمام سامان چھوڑ کر یہیں رہ رہی ہے۔ عبدالرحمان کے یقین دلانے کے بعد میں نے حافظ صاحب کو فون کر کے کہہ دیا تھا کہ میں نومولود بچے کے لیے کوشش کر رہا ہوں۔ انہوں نے بھی یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ جیسے ہی یہ کام ہو جائے' مجھے فون کر دینا' میں اُسی رات آجاؤں گا۔

اس وقت میری عجیب کیفیت تھی' میں نے زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں اتنا خودغرض ہوسکتا ہوں۔ جب میری اپنی جان پر بن آئی تو میں مردہ بھی قبر سے نکالنے پر تیار ہوگیا تھا۔ ان حالات میں' میں اپنی نظروں میں گر گیا تھا۔ بیگم الگ پریشان تھی' کرائے کے مکان میں جانے کا اس کا بھوت اب اتر چکا تھا۔ ہم سبھی کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ کسی کی گود اجڑنے کی دعا ہم کر نہیں سکتے تھے کہ ہم بھی اولاد والے تھے جبکہ اب اس کے بغیر جان بھی چھٹنا مشکل تھی' اب تو صرف عبدالرحمان کے فون کا انتظار تھا۔ دو دن تک میں خود بھی عبدالرحمان سے ملتا رہا۔ شاید ابھی اللہ پاک کی طرف سے آزمائش باقی تھی پھر تیسری شام عبدالرحمان کا فون آگیا۔

''تیرا کام ہوگیا ہے' رات ساڑھے نو بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک لائٹ جاتی ہے' تم ایک ٹوکری موٹر سائیکل پر لے آنا۔ انشاءاللہ' آج رات ہی تمہارا کام کردوں گا۔'' فون سنتے ہی میں نے عبدالرحمان کا شکریہ ادا کیا اور دوسرے ہی لمحے حافظ صاحب کو بھی خبر کردی۔ انہوں نے چند چیزیں لانے کو کہا اور رات بارہ بجے کے بعد آنے کا وعدہ کر کے فون بند کر دیا۔

اب تو مجھے صرف رات ہونے کی فکر تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اس حد تک گر جاؤں گا مگر مجبوری انسان کو انسانیت سے کس قدر گرا دیتی ہے' مجھے آج اس کا اندازہ ہو رہا تھا۔ رات ہونے سے پہلے میں مطلوبہ چیزیں لے آیا تھا پھر کھجور کی بڑی سی ٹوکری بھی میں نے خرید لی تھی۔ رات ساڑھے نو بجے لائٹ گئی تو میں نے پہلے خود کو اور مضبوط کرنے کی کوشش کی اور عبدالرحمان کو فون ملایا۔ اس نے مجھے گرین سگنل دے دیا اور کہا کہ قبرستان کے دوسرے گیٹ سے آؤں' وہاں سناٹا رہتا ہے۔ جب میں قبرستان کے قریب پہنچا تو لائٹ گئی ہوئی تھی۔ لائٹ جانے پر قبرستان اور بھی خوف ناک منظر پیش کر رہا تھا۔ قبرستان میں داخل ہوا تو میرے پاؤں خوف سے کانپ رہے تھے' ہر قبر جیسے کھانے کو دوڑ رہی تھی۔ ابھی میں تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ عبدالرحمان نے آواز دے کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ آگے موٹر سائیکل لے جانے کی جگہ نہیں تھی اسی لیے میں نے بائیک قریب ہی کھڑی کی اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ عبدالرحمان کی طرف بڑھنے لگا۔ اس

کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی میں نے اپنے موبائل کی ٹارچ بھی آن کرلی تھی۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ عبدالرحمان ایک چھوٹی کچی قبر کے پاس کھڑا ہے' وہ قبر کھودنے کے لیے کدال وغیرہ بھی لایا تھا۔ اس نے میرے سامنے ہی قبر کھودنا شروع کی۔ ابھی اس نے کدال چلایا ہی تھا کہ دو خونخوار کتے دور کھڑے ہوکر بھونکنے اور ہمیں گھورنے لگے۔

''دیکھ اختر' یہ وہ کتے ہیں جو اکثر بچوں کی نعشیں قبر کھود کر لے جاتے ہیں' ان سے ڈرنا نہیں۔'' عبدالرحمان نے کہا مگر میں اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ قبر کے اوپر سے مٹی اور سل ہٹاتے ہی عبدالرحمان نے بچے کی میت قبر میں سے نکال کر اس چھبڑی میں ڈال دی جو میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کے بعد اس نے قبر واپس پہلے جیسی ہی بنا دی۔ اب کسی معصوم انسانی بچے کی نعش میرے ساتھ تھی۔ عبدالرحمان نے بھونکتے ہوئے کتوں کو پتھر مارے تو وہ اِدھر اُدھر دوڑ گئے مگر جب تک ہم دونوں قبرستان سے نہیں نکل گئے' وہ کتے ہمارے پیچھے پیچھے آتے رہے۔ قبرستان سے گھر تک آتے ہوئے میرے کیا احساسات تھے' اسے میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ کرائے والے مکان تک آتے ہوئے میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس بچے کی نعش کو کہاں رکھوں؟ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں؟ خیر' میں نے جب حافظ صاحب سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ اسے فرج میں رکھ دو' میں ابھی آتا ہوں۔ عبدالرحمان کو میں نے وہیں سے فارغ کردیا تھا اسی لیے خود ہی لرزتے ہوئے قدموں سے گھر میں داخل ہوا اور فرج کے اوپر والے خانے میں وہ معصوم سی نعش میں نے کسی طرح رکھ کر فرج بند کردیا اور فوراً ہی گھر سے باہر نکل کر تالا لگا دیا۔

اللہ کی مہربانی سے ایک اہم کام تو ہوگیا تھا۔ اب صرف حافظ صاحب کے فون کا انتظار تھا۔ اس وقت میری عجیب حالت تھی' کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ رات لائٹ آنے کے بعد تک حافظ صاحب نہیں آئے تو میں نے انہیں دوبارہ فون کیا تو کافی دیر بعد ان کی آواز آئی۔

''میاں......! صبر سے کام لیں' میں بہت مصروف انسان ہوں اور کسی کے علاج کے سلسلے میں کہیں مصروف ہوں۔ میں فارغ ہوتے ہی آجاؤں گا۔ بار بار فون نہ کریں۔'' اس بار انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا تھا۔ مجھے ان پر غصہ تو بہت آیا مگر سوائے صبر کے اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ پوری رات انتظار میں کٹ گئی مگر نہ ان کی طرف سے کوئی فون آیا اور نہ ہی کوئی خبر...... دوپہر ظہر نماز کے بعد ان کا فون آیا اور انہوں نے آج رات نو بجے آنے کا وعدہ کیا تو کچھ امید بندھی اور جان میں جان آئی۔ جیسے تیسے وقت کٹا اور رات نو بجے کے بعد وہ آگئے اور کل نہ آنے پر معذرت کرنے لگے۔

''اختر بھائی......! کل بھی کسی کی جان پر بنی ہوئی تھی اسی لیے وہاں رات دو بج گئے تھے۔ ان حالات میں کام ادھورا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔''

''اب میرے لیے کیا حکم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس اب آپ ہی کا کام کرنا ہے' عمل کرنے سے پہلے آپ میری باتیں غور سے سنیں' جس بلا سے بچاؤ کے لیے ہم عمل کرنے جارہے ہیں' اس میں آپ کا نقصان بھی ہوسکتا ہے جب ہم اسے قابو کرنے اور مارنے کی کوشش کریں گے تو وہ یقیناً مزاحمت تو کرے گی ہی...... بس آپ ڈرنا نہیں اور جس حصار میں' میں آپ کو بٹھا دوں' اس میں سے نکلنا نہیں' آپ کو کوئی بھی ڈرائے دھمکائے یا گلہ بھی دبانے کی کوشش کرے' میری باتوں پر عمل کریں گے

تو انشاء اللہ' یہ اثر زائل ہوجائے گا ورنہ آپ کی جان جاسکتی ہے۔ آپ سمجھ گئے نا میں کیا کہہ رہا ہوں؟'' انہوں نے اپنی بات پر مزید زور دیتے ہوئے پوچھا۔

''میں ہر طرح سے آپ کے کہنے پر عمل کروں گا۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔

''تو ٹھیک ہے۔'' پھر انہوں نے بڑے سے برتن میں پانی منگوایا اور اس میں سات رنگی دھاگہ ڈال کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ دھاگہ پانی میں سے نکالا تو اس دھاگے کا رنگ پانی میں اتر چکا تھا پھر اس پانی کو انہوں نے گھر کے چاروں کونوں میں چھڑکا اور پانی سے کمرے میں دو حصار بنائے۔ اس کے بعد انہوں نے بکرے کی سری نکالی' چھری' چھڑی اور چند کیلیں نکال کر ایک بڑے برتن میں پانی ڈالا پھر ایک پاک کپڑا منگوا کر اسے اس پانی سے گیلا کیا پھر بچے کی نعش فرج میں سے نکال کر دوسرے حصار میں رکھی۔ باہر کا دروازہ انہوں نے پہلے ہی بند کروا دیا تھا اور پھر اندر کمرے کا دروازہ بھی بند کرنے کے بعد انہوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ابھی انہوں نے پڑھنا شروع کیا ہی تھا کہ لائٹ چلی گئی۔ اچانک دروازے پر دستک شروع ہوگئی۔ حافظ صاحب نے مجھے اشارے سے منع کرتے ہوئے موبائل کی لائٹ آن کرنے کا اشارہ کیا۔ ان کے اشارہ کرنے پر میں نے موبائل ٹارچ روشن کردی۔ دروازے پر ابھی تک دستک ہورہی تھی' میں بت بنا بیٹھا حافظ صاحب کو دیکھ رہا تھا پھر انہوں نے ماچس جلا کر پانی کے برتن میں ڈالی تو اس میں آگ لگ گئی' اسی آگ سے انہوں نے پہلے کیلیں گرم کیں پھر انہیں بکرے کی سری اور نومولود کے کفن میں ٹھونک دیں۔ میں نے دیکھا کہ اچانک ہی کمرے میں آگ لگ گئی پھر وہ آگ حافظ صاحب اور میری طرف بڑھنے لگی مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے تو میں بھی اس حصار میں جما بیٹھا رہا۔ حافظ صاحب پڑھتے رہے۔ اچانک مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی مجھے اس حصار میں سے باہر کھینچنے کی کوشش کررہا ہے۔ میں نے بہت زور لگا کر خود کو اس غیر مرئی قوت سے چھڑانے کی کوشش کی مگر وہ ہاتھی جیسی طاقت سے زور آزمائی کررہا تھا۔ اچانک ہی حافظ صاحب نے میری ٹانگ پکڑلی تو اس بلا نے مجھے چھوڑ دیا۔ اسی وقت انہوں نے اسی آگ لگے پانی میں ہاتھ ڈال کر ایک چلو پانی لے کر میرے منہ پر مارا تو میرے حواس بحال ہوئے۔ انہوں نے پھر دو کیلیں اسی آگ میں گرم کیں۔ ایک انہوں نے بکرے کی سری میں ٹھونکی اور دوسری پھر نومولود کفن میں لپٹے ہوئے بچے میں۔ اچانک مجھے کمرے میں کسی کے ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں مگر جیسے ہی انہوں نے دو کیلیں مزید ان دونوں یعنی سری اور بچے کی نعش میں ٹھونکیں تو کمرے میں چیخ و پکار شروع ہوگئی۔ اسی وقت حافظ صاحب خود کلامی کرتے ہوئے بولے۔

''بس بہت ہوا...... چل تو اپنے جسم میں واپس آ...... اب تیرا ہر اثر اور داؤ سب بے کار ہے...... پیرانِ پیر نے تیرے لیے بیڑیاں بھیجی ہیں' اب دیر نہ کر ورنہ...... تجھے جلا دوں گا اسی آگ میں......''

''میں نہیں جاؤں گی اور نہ ہی جسم میں واپس آؤں گی۔'' حافظ صاحب کے جواب میں مجھے ایک آواز سنائی دی۔

''تو ٹھیک ہے...... اب تو گئی......'' یہ کہتے ہی حافظ صاحب نے دو کیلیں اور مردار میں ٹھونکیں تو وہ بدروح چیخنے لگی۔

''مجھے جانے دو...... مجھے جانے دو......''

بدروح کی دل ہلا دینے والی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔

"تیرا رستہ بند ہے......چل، جسم میں اتر......"

حافظ صاحب نے دو کیلیں جیسے ہی اس مردار میں ٹھونکیں تو ایک بدبودار جسم ان کے سامنے ہی زمین پر آ گرا۔ حافظ صاحب نے فوراً ہی اس بکرے کی سری پر چھری سے وار کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس نومولود بچے پر اس چھری سے حصار بنا دیا۔ اب وہ بدبودار جسم جو کہ بے سدھ اوندھا منہ زمین پر پڑا ہوا تھا، بہت تیز تیز ہل رہا تھا۔ حافظ صاحب نے فوراً ہی آگ لگے برتن میں ہاتھ ڈال کر بدروح پر پانی چھڑکا تو اس جسم میں آگ لگ گئی۔ ایکا ایکی کمرے میں چیخ و پکار مچ گئی پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ جسم موم کی طرح پگھلنے لگا تو حافظ صاحب نے اس نومولود مردہ جسم کو اس بہتے ہوئی موم جیسے پانی کے درمیان رکھ دیا پھر ذرا ہی میں وہ پانی اس کفن کو گیلا کرنے لگا اور تھوڑی ہی دیر میں اس برتن میں لگی آگ بھی بجھ گئی اور کمرے میں پھر سے سکوت طاری ہو گیا۔ حافظ صاحب نے اس نومولود بچے کی نعش اٹھا کر واپس ٹوکری میں ڈالی پھر اس سری کو بھی اسی میں رکھا اور مجھ سے گویا ہوئے۔

"چلو بھی، جلدی چلو......جلد از جلد اس جسم کو دفن کرنا ہے......" ہم فوراً ہی گھر سے نکلے۔ قبرستان پہنچے تو کچھ کتے ہمارے پیچھے آنے لگے۔ حافظ صاحب نے اسی قبر کو اور گہرا کھودا اور اس میں بچے کی نعش رکھ کر گڑھے پر مٹی ڈال دی اور قبر پہلے جیسی بنا دی اور اس کے آس پاس اپنے ساتھ لایا ہوا پانی بھی ڈال دیا پھر وہاں سے نکلتے ہی وہ ایک ویران گوشے کی طرف آئے اور جیسے ہی اس سری پر پانی ڈالا تو اس میں بھی آگ لگ گئی جسے انہوں نے اٹھا کر نالے میں ڈال دیا۔ اس تمام سفر میں انہوں نے صرف قبر کے متعلق مجھ سے پوچھا، بس اس کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی۔

"لو میاں، جاؤ، شکرانے کے نوافل ادا کرو۔ وہ بلا تمہارے سامنے دفن کر دی گئی ہے، اب کوئی جانور اسے نہیں نکال سکتا، کل بے خوف و خطر اپنا سامان اس گھر سے نکال لینا اور صبح فیاض صاحب سے ضرور مل لینا۔"

وہاں سے فارغ ہوتے ہی میں جیسے ہی گھر پہنچا تو لائٹ آ گئی تھی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہوا کہ اس اندھیرے نے میرے گناہ کی لاج رکھ لی تھی، ایک بوجھ تھا جو اتر گیا تھا۔ آج مجھے زندگی کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ حافظ صاحب اگر یہ تمام عملیات میرے سامنے نہ کرتے تو مجھے کبھی بھی اس کی حقیقت کا اندازہ نہ ہوتا۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا، وہ ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ تو اللہ کی مہربانی ہوئی، اچھے لوگ مل گئے تھے۔ اُس رات میں ہی کیا، بیگم اور بچے بھی سکون سے سوئے تھے۔ دوسرے دن سائیں فیاض صاحب کا فون آیا اور انہوں نے حافظ صاحب کو مٹھائی دینے کا کہا جو کہ میں نے اپنی موٹر سائیکل بیچ کر ادا کر دی البتہ نومولود بچے کی نعش کا عبدالرحمان نے کچھ بھی معاوضہ نہیں لیا۔

مکان خالی کرتے وقت ہم نے آس پاس والوں کو بتا دیا تھا کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔ اس واقعے کو تین سال ہو گئے ہیں، آج تک کسی نے بھی اس مکان کو کرائے پر لینے کی ہمت نہیں کی۔ وہ مکان اب بھی خالی پڑا ہے البتہ ہم پھر سے پرسکون زندگی بسر کر رہے ہیں۔ شبانہ اب میرا بہت خیال رکھنے لگی ہے جبکہ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے بچے کی نعش کے ساتھ جو کیا، اس کا دکھ مجھے کھائے جاتا ہے۔ اگر حافظ صاحب ہماری مدد نہ کرتے تو نجانے آج کیا حالات ہوتے......

✲

شہید کی کہانی | ہمارے وطن کا دفاع کرنیوالے شہیدوں کے حوالے سے ایک دلگداز سوچ

منزہ سہام مرزا



علامہ اقبال کی پروازِ خیال

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

قوم کو حیات بخشنے والے شہیدوں کی سوچ پر مبنی ایک دل گداز سلسلہ

ساتھیو! پچھلی بار جب آپ سے رابطے میں آیا تھا تب دل بہت اداس تھا، غمگین تھا، ننھی پریوں کو زمین برد کرنے والوں سے بھی ناراض تھا اور ایسے اسباب پیدا کرنے والوں سے تو بہت ہی نالاں تھا، شاید اس لیے کہ مجھے بیٹوں سے بہت پیار تھا، مجھے یہ چہچہاتی چڑیاں اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری تھیں جب چھوٹا سا تھا تب اللہ سائیں سے روزانہ شکایت کرتا تھا کہ آپ نے مجھے بہن کیوں نہیں دی، چھوٹی سی بہن جن کو گود میں لے کر میں بھی کھلا سکوں جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا یہ خواہش بھی شدت اختیار کرتی گئی کہ کاش ایک بہن ہی ہوتی۔ چھٹی سے جب گھر آتا تو یہ کمی بہت کھلتی وہ گھر میں ہوتی تو اس کی چٹیا پکڑ کر ضرور کھینچتا...... سہیلی کی شادی پر جانے کے لیے میری منتیں کرتی...... ہمیشہ خط لکھ کر کانچ کی چوڑیاں، چنزی کے دوپٹے اور زری کے کھسے منگواتی۔ پھر اللہ نے میری یہ خواہش بھی پوری کر دی جب میری گود میں میری دھی رانی آئی۔ فاطمہ میری جان، میری آنکھوں کا تارا...... سچ ہے وہ مجھے اپنے شہر سے بھی بہت زیادہ عزیز تھی۔ حالانکہ میں اس کے ساتھ کچھ بھی وقت نہ گزار سکا وہ ماں کی گود ہی میں تھی جب میں دنیا سے چلا گیا پر خوش ہوں، بہت خوش ہوں، پچھلی بار میں نے پوچھا تھا کہ کیا میرے وطن میں کوئی ایک بھی گبرو نہیں بچا، کوئی ایک بھی ویر نہیں بچا تو مجھے ایک خط موصول ہوا۔ میری پیاری سی دھی جو کراچی میں رہتی ہے اس نے لکھا کہ حالات بے شک خراب ہیں، چاروں جانب اندھیرا ابھی ہے۔ اطراف کے منظر بھی واضح نہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ ایک معمولی سی روشنی کی کرن ہزاروں سال پر محیط اندھیرے کو نگل جاتی ہے۔ ایک اچھائی بہت سی برائیوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اے شہید وطن دکھی مت ہو۔ میرے شہر میں ایک گبرو ہے جس پر فخر کیا جا سکتا ہے...... جو سچ کا ساتھی ہے...... جو قائد کے قول کام کام اور صرف کام پر یقین رکھتا ہے۔ کمزور اور پریشان حال خواتین کی داد رسی کرنے والا...... کوئی اور نہیں کالی وردی پہننے والا محافظ ہے۔ وردی اس کی کالی ضرور ہے مگر دل اس کا بہت اُجلا ہے وہ حق کا ساتھی ہے اس کے دروازے ہر ضرورت مند کے لیے کھلے ہیں۔ وہ خاتون کو وہ عزت اور مرتبہ بھی دیتا ہے جو یقیناً ہمارے دین کا خاصہ ہے۔ ایک مومن ہی جان سکتا ہے کہ عورت کا ہمارے مذہب میں کیا درجہ ہے...... ایک مومن ماں ہی اپنی اولاد کی ایسی تربیت کر سکتی ہے...... یہ اٹل حقیقت ہے کہ ماں کی گود ہی اصل تربیت گاہ

ہوتی ہے۔اے شہیدِ وطن !اب تک تو میں سمجھتی تھی کہ صرف خاکی وردی ہی تحفظ کی علامت ہے مگر اس مردِ مومن، مردِ مجاہد سے مل کر مجھے اندازہ ہوا کہ ہماری پولیس بھی اچھی ہے اس میں بھی بہت اچھے لوگ ہیں، سوچ میں ڈوبی گہری آنکھیں...... چہرے پر تھکان مگر سب کچھ ٹھیک کر لینے کا یقین...... بائیں ہاتھ پر رکھی سبز چائے کی پیالی کو دائیں ہاتھ سے اُٹھا کر گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے مظلوم کو بھی مجرم کی طرح پرکھنا۔بار بار کہنا کہ میں سب کچھ Fair اور Impartial ہو کر کرتا ہوں اور شکریہ کے جواب میں سختی سے کہنا This just my duty۔ساڑھے تین منٹ تک سائل کی غور سے بات سننا اس عرصے میں ایک ہاتھ میں موبائل اور دوسرے میں ہاتھ میں فون کا ریسیور۔کوئی چاہے بھی تو آدھا منٹ بھی زیادہ نہ بیٹھ سکے۔ سیدھے سچے صاف لوگ......!ایک گندی مچھلی اگر سارے تالاب کو گندا کرتی ہے تو ایک چھوٹی سی کرن...... ہزاروں سال پر پھیلے اندھیرے کو نگل بھی جاتی ہے۔میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ ہم بیٹیاں آپ سے بہت پیار کرتے ہیں۔آپ ہمارے محسن ہیں جن آزاد فضاؤں میں ہم آج سانس لیتے ہیں وہ آپ کی مرہونِ منت ہیں۔ہم بیٹیاں آپ کو غمگین نہیں دیکھ سکتے۔ہم آپ کی خاطر ان لوگوں کا پتہ ضرور لگائیں گے جو چاند کی طرح چمکتے ہیں جن کے چہروں کے گرد نور کا ہالہ ہوتا ہے۔میرے ویر...... میرے وطن کے گبرو جوان بہت ہیں بس انہیں تلاشنا ہوگا۔ایک تو میں نے ڈھونڈ لیا باقی بھی مل جائیں گے بس آپ خوش رہیے۔

شہیدِ وطن !





مینا

قسمت بتانے والے

درمیانی عمر کا شخص بلڈنگ کی دیوار کے کونے میں چادر بچھائے بیٹھا تھا۔ اس کے آگے لفافوں کی قطار سجی ہوئی تھی۔ ساتھ میں ایک طوطا لفافہ چونچ میں دبائے......

دوسروں کی قسمت بتانے والے نجومی کی اپنی حالتِ زار کی تلخ اور سچی کہانی

امپریس مارکیٹ جہاں اشیائے خورونوش سے لے کر پرندوں تک وہ تمام اشیاء جن کا ملنا شہر کی دوسری مارکیٹ میں دشوار ہو' وہ باآسانی یہاں پر دستیاب ہوجاتی ہیں۔انگریز دور کی بنی یہ قدیم عمارت ماضی اور حال میں یکساں اہمیت کی حامل رہی ہے۔مجھے بچپن سے ہی اس مارکیٹ کی سیڑھیوں اور درودیوار سے اُنس رہا ہے۔جب بھی یہاں آتی ہوں تو 1935ء کا نقشہ ذہن پر ابھرتا ہے جب مارکیٹ کا ایڈمنسٹریٹر انگریز ہوا کرتا تھا جو گھوڑے پر سوار گشت کرتا تھا تاکہ کوئی بدنظمی نہ ہونے پائے۔اُس وقت بوہری' ہندو دکان دار ہوا کرتے تھے اور انگریزوں کی اکثریت یہاں شاپنگ کیا کرتی تھی۔

امپریس مارکیٹ کے ساتھ ہی ڈوسل سپر اسٹور ہوا کرتا تھا جو آج کے میکرو' آغا اور ناہید سپر اسٹور جیسے کئی دوسرے سپر اسٹور سے کہیں بڑھ کر تھا جہاں پر غیر ملکی پنیر' بسکٹ اور دیگر اشیاء کے علاوہ سوئی سے لے کر بندوق تک ملا کرتی تھی۔ڈوسل اسٹور تو کب کا ماضی کا حصہ بن کر حال کے سمندر میں غرق ہو چکا ہے۔

میں جب بھی امپریس مارکیٹ جاتی ہوں تو خریداری کے بعد اُس جگہ ضرور جاتی ہوں جہاں پر کبھی ڈوسل اسٹور ہوا کرتا تھا۔وہ جون کا گرم ترین دن تھا' لو اور حبس نے طبیعت میں بے زاری پیدا کر دی تھی مگر کچھ ضروری اشیاء کی خریداری کے لیے مجھے امپریس مارکیٹ کا رخ کرنا پڑا۔خریداری سے فارغ ہونے کے بعد گرمی کا عذاب جھیلنے کے باوجود معمول کے مطابق میرے قدم امپریس مارکیٹ کے عقب کی جانب بڑھ گئے کہ دیکھوں' وقت نے اور کتنے رنگوں سے کس نام سے ڈوسل اسٹور کو ہمکنار کیا ہے۔

ابھی موجودہ تصویر کو ماضی کے منظر میں فٹ کیے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ نظریں اُس جانب ٹھہر گئیں جہاں پر ایک درمیانی عمر کا شخص بلڈنگ کی دیوار کے کونے میں چادر بچھائے بیٹھا تھا۔اس کے آگے لفافوں کی قطار بچھی ہوئی تھی۔ساتھ میں ایک پر کٹا طوطا بڑی سرعت سے لفافہ چونچ میں دبائے چہل قدمی کرتا اُس شخص کے آگے کر دیتا جس کے بعد وہ شخص وہاں پر آنے والے شخص کو لفافے کا مضمون سناتا جاتا جس کے عوض کچھ رقم وصولتا۔ایک کے بعد دو پھر چار غرض وہاں ٹھہرنے والوں کا سلسلہ چلتا رہا۔اس دلچسپ نظارے نے میرے قدم اُس جانب بڑھا دیئے جہاں یہ سڑک کا کردار اپنے کاروبار میں مصروف تھا۔

"جی میڈم......!فرمایئے؟" فال والے نے نظریں اوپر کی جانب اٹھائیں۔اسے دیکھتے ہی مجھے جھٹکا سا لگا اور میری پلکیں جھپکنا بھول گئیں۔تاسف اور حیرت نے میری عقل گم کر دی تھی۔

"پپ......پا......مست......تم......" ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے لفظوں نے فال والے کو بھی چونکا دیا پھر اس کے چہرے پر شناسائی کے ساتھ کرب کی لہر نمایاں ہو گئی۔

"بی بی' آپ برا نہ مانیں تو پہلے میں فال نکال لوں' بڑی جلدی ہے۔آج کے آج معلوم ہو جائے' تب ہی کوئی فیصلہ کروں۔" تقریباً پچاس کے پیٹے والی عورت نے لجاجت سے مجھے مخاطب کیا جو کہ چہرے مہرے اور حلیے سے درمیانے طبقے کی غمازی کر رہی تھی۔

"جی......جی......ضرور' شوق سے۔" اور میں محترمہ کو راستہ دیتے پیچھے ہٹ گئی۔جب تک وہ خاتون فال نکلوانے اور اپنی قسمت کا حال سننے میں منہمک تھی' اس وقت تک دو اور آدمی پہنچ گئے جو کہ سر جھکائے اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔خاتون کے اٹھتے ہی عورت کا احترام کرتے ہوئے ایک صاحب نے مجھے مخاطب کیا۔

"آپ پہلے......"

"جی شکریہ' آپ لوگ پہلے اپنا کام کر لیں۔"

میرا جواب سنتے ہی وہ شخص جلدی سے بیٹھ گیا اور میں ماضی میں گم رہنے والی ایک بار پھر ماضی کے دریچے میں جھانکنے لگی۔

میرے سامنے بیٹھا فال نکالنے والا یہ شخص جس کا نام ناصر شیخ تھا جسے مجھ سمیت تمام دوست پامسٹ کے نام سے پکارتے تھے' وہ یونیورسٹی کا نیا تعلیمی دور تھا' کلاسیں شروع ہوئے دوسرا روز تھا جب ناصر شیخ سے ڈپارٹمنٹ کے کاریڈور میں میری ملاقات ہوئی تھی اور پھر اکثر وہ کلاس روم کے بجائے ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھا پایا جاتا جہاں کوئی نہ کوئی لڑکی اس کے سامنے اپنا ہاتھ آگے کیے بیٹھی ملتی اور وہ ان کے ہاتھوں کی لکیروں کو پڑھنے میں مشغول رہتا۔

شروع شروع میں تو یہ تفریح صرف ڈپارٹمنٹ کی لڑکیوں تک محدود تھی' پر کچھ عرصے بعد کینٹین میں' کبھی گارڈن ایریا میں لڑکیاں ناصر کے گرد نظر آنے لگیں۔پہلا سیمسٹر جب سر پر آیا تو ناصر کلاس فیلوز سے نوٹس مانگتا نظر آیا۔

بڑی مشکل سے نوٹس حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تو پھر فوٹو اسٹیٹ شاپ پر نوٹس کاپی کرواتے پایا جاتا مگر جب رزلٹ آتا تو ایک سبجیکٹ میں پاسنگ مارکس' ایک میں فیل اور باقی میں میڈیکل لگا کر بیٹھ گیا ہوتا تھا' بس اتنی ہی محنت تھی جو اس نے یونیورسٹی میں آنے کے بعد کی تھی۔رزلٹ کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اپنی غلطیوں سے سبق لیتے ہوئے اسے دہرایا نہ جائے' پر ناصر شیخ نے تو غلطیاں کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا پھر دوبارہ اس کی پرانی روٹین شروع ہو جاتی۔

ایک دن میں اپنی دوست کے ہمراہ ڈپارٹمنٹ سے نکل کر اپنے پوائنٹ کے انتظار میں کھڑی تھی کہ ناصر شیخ آن دھمکا۔

"ہیلو گرلز......!کیا حال چال ہیں؟"

"ارے پامسٹ' تم؟ بس گھر کی تیاری ہے۔"

میری دوست نے خوش دلی سے جواب دیا۔"اچھا ہوا' تم یہیں مل گئے۔ذرا بتاؤ تو ہارٹ لائن تم نے کون سی بتائی تھی اور لک لائن میں بھول گئی؟"

اور پھر پوائنٹ آنے تک وہی گھسا پٹا کھیل شروع ہو گیا جسے میں گزشتہ ڈیڑھ سالوں سے دیکھ رہی تھی۔میری دوست سے بات چیت کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔"کیا تمہیں اپنی ہاتھ کی لکیروں کے بارے میں نہیں جاننا؟"

"جو شخص اپنے بارے میں نہیں جان سکا کہ وہ کس مقصد کے لیے یہاں آیا ہے اور اسے زندگی میں کیا کرنا ہے' وہ بھلا کیسے دوسروں کے بارے میں جان سکتا ہے؟"

"ارے نہیں' یہ بالکل صحیح بتاتا ہے۔" میری دوست نے فوراً میری بات کاٹی۔"تم اپنا ہاتھ دکھاؤ پھر دیکھنا' یہ......"

"نہیں......میرے پاس ان فضولیات کے لیے وقت نہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں پوائنٹ پر سوار ہو گئی جبکہ پیچھے سے ناصر کی ہنسی کے ساتھ اس کے الفاظ میرے کانوں سے ٹکرائے تھے۔

"ایک دن ضرور تم میرے سامنے کھڑی ہو گی اپنی قسمت کا حال جاننے کے لیے......"

•......•......•

"ہونہہ......اچھا تو میرا کہا سچ ہوا نا؟" ہنکارہ بھرتی ہوئی ناصر کی آواز نے مجھے ماضی سے حال میں لا کھڑا کیا۔

"آں......ہاں......کیا کہا؟"

"یہی کہ ایک دن تم میرے سامنے کھڑی ہو گی اپنی قسمت کا حال جاننے کے لیے۔ہاتھ کی لکیروں

سے نہ سہی، فال کے ذریعے ہی، آخر تم نے بھی......"

"میں یہاں فال نکلوانے نہیں آئی، میں تو یہ تماشہ دیکھنے کی غرض سے ادھر آ نکلی تھی۔ کیا پتا تھا کہ...... خیر، تم پر مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی کیونکہ اس طرح کے تماشے برسوں پہلے میں یونیورسٹی میں دیکھ چکی ہوں، پر بہت افسوس ہوا یہ سب دیکھ کر......"

"ہش...... خاموش رہو، سامنے سے دو بندے ادھر ہی آ رہے ہیں، اب کوئی بات نہ کرنا۔"

آنے والا شخص فال نکلوانے کے بعد نہایت احترام سے ناصر کا ہاتھ عقیدت سے تھامے دعا کی التجا کر رہا تھا۔

"آپ کی دعا ضرور لگے گی، بس آپ دعاؤں میں یاد رکھیں بلکہ میرا نام لے کر دعا فرما دیں۔"

میں چپ سادھے کھڑی تھی۔ اس آدمی کے جاتے ہی میں پھر ناصر کے سر ہو گئی۔ جب بندہ یا خاتون آتی، ہم خاموش ہو جاتے۔

آخر تنگ آ کر ناصر نے سامنے پڑے لفافے سمیٹے، چادر تہہ کی اور طوطے کو کاندھے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "چلو، قریب ہی میرا گھر ہے۔ تم ایسے نہیں مانو گی، نہ جانے کس جنم کا مجھ سے بیر لیے بیٹھی ہو۔ چلو بھی اب، کھڑی کیوں ہو؟ ضروری ہے کہ جس طرح یونیورسٹی میں میرا مذاق اڑایا کرتی تھی، اب بھی وہی کرو؟ پر اُس وقت کی بات اور تھی جسے ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا، اب میری روزی کا معاملہ ہے، وہ روزی جس سے بمشکل اپنی بیوی اور دو بچوں کا پیٹ بھرتا ہوں۔"

"ک...... ک...... کیا کہہ رہے ہو؟"

"چلو، اب باقی سوال گھر پر کر لینا۔"

میں خاموشی کے ساتھ اس کے پیچھے چلتے ہوئے تقریباً تین چار پتلی پتلی گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک شکستہ حال کوارٹر کے آگے رک گئی۔ لکڑی کے کھلے پٹوں سے گھر کی اندرونی حالت واضح نظر آ رہی تھی جسے دیکھ کر میرے قدم چوکھٹ پر جم سے گئے تھے۔

"اندر آ جاؤ بھئی......!" مجھے اندر آنے کا کہتے ہوئے ناصر نے وہیں کھڑے اپنی بیوی کو آواز دی۔ "شکیلہ......! باہر آؤ، مہمان آئے ہیں۔"

ایک کمرے سے ملگجے کپڑے میں ملبوس ہڈیوں کا ڈھانچہ نما عورت برآمد ہوئی۔ قریب آنے کے بعد شناسائی کی چمک اس کی آنکھوں میں ابھری۔

"اوہ خدایا......! کیا ماضی اپنے تمام اوراق آج ہی پلٹنے پر تیار ہے؟ سامنے کھڑی عورت شکیلہ وہ لڑکی تھی جو آنرز کی طالبہ ہوا کرتی تھی اور ناصر شیخ کے ساتھ ہر دم نظر آتی تھی۔ مجھے یاد ہے، اس کا تعلق قدرے کھاتے پیتے گھرانے سے تھا اور شکل و صورت بھی کافی بہتر تھی مگر ماضی کی شکیلہ اور حال کی اس شکستہ حال شکیلہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

یونیورسٹی میں شکیلہ اور ناصر کو ایک ساتھ دیکھ کر سب کی مشترکہ رائے تھی کہ کچھ عرصے بعد ناصر کی پامسٹری سے انجوائے کرنے کے بعد وہ اپنی راہیں بدل لے گی۔

شکیلہ چونکہ آنرز کے پہلے سال میں تھی جبکہ ہم ایم اے فائنل میں اس لیے بعد میں کیا ہوا، اس کا علم نہیں تھا۔ رزلٹ کے بعد جاب تلاش کرنے کی فکر نے کسی کی خبر لینے کی فرصت ہی نہ دی اور آج اتنے سالوں بعد جو کچھ دیکھنے کو مل رہا تھا، اس پر آنکھیں یقین کرنے پر راضی نہ تھیں۔

"بیٹھو۔" ناصر نے صحن میں پڑی پلنگ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شکیلہ میرے برابر بیٹھ گئی۔

ایک کونے میں دس گیارہ سال کے لگ بھگ ایک لڑکی بیٹھی اپنے بھائی سے کھیل کود میں مشغول تھی۔

"یہ میرے بچے ہیں۔" میری نگاہوں کے تعاقب میں ناصر نے کہا۔

"بڑے پیارے ہیں۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

شکیلہ اٹھ کر چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔

"ناصر، یہ سب کیا ہے؟"

"کیا ہے، وہی ہے جو انسان بوتا ہے۔"

"میرا مطلب ہے، تم کوئی نوکری کرنے کے بجائے یہ کام؟ اس کے علاوہ......"

"اس کام کے علاوہ میں کچھ اور کرنے کے قابل ہی کہاں ہوں، میرا باپ ایک درزی تھا اور میں تین بہنوں کا اکلوتا بھائی۔ باپ نے بڑے چاؤ سے غربت جھیلتے ہوئے مجھے اسکول پھر کالج پڑھایا۔ کالج میں بھی بس تھرڈ کلاس نمبروں سے پاس ہوا۔ اُن نمبروں کے ساتھ یونیورسٹی میں ایڈمیشن ناممکن تھا پھر ابا نے ایک گاہک جو کہ یونیورسٹی میں جاب کرتے تھے، سفارش کروا کر یونیورسٹی میں ایڈمیشن دلوا دیا۔ ابا چاہتے تھے کہ میں پڑھ لکھ کر آفس میں لگ جاؤں، اچھی جاب کروں، اُن کی طرح درزی نہ بنوں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ابا کی محبت اور قربانی کا صلہ پڑھ لکھ کر دیتا، پر پڑھائی میں میرا دل کبھی نہ لگا لیکن ابا کی بس اتنی لاج رکھی کہ یونیورسٹی چلا آتا جس پر وہ بہت نہال ہوتے۔ کلاس میں لیکچر سمجھ نہ آتے، سب کے سامنے سبکی ہونے کے ڈر سے میں نے پامسٹری کا سوانگ رچایا، تفریح سے شروع ہونے والا یہ کھیل میری مجبوری بن گیا جس نے میری پڑھائی سے عدم دلچسپی پر پردہ ڈال دیا۔ میری کہی باتیں اتفاقاً پوری ہونے لگیں تو میری پامسٹری پر سب کا یقین پکا ہوتا گیا جبکہ اکثر وہ باتیں جو میں لڑکیوں کو بتاتا تھا، خود ان کے منہ سے کسی نہ کسی انداز میں ادا ہو چکی ہوتی تھیں۔

شکیلہ سے میری ملاقات ہاتھ کی لکیروں سے ہوتی دل کی لکیروں تک پہنچ گئی۔ میں نے تو امتحان میں نہ بیٹھنے کا ارادہ پہلے ہی کر لیا تھا کیونکہ پڑھا تو

عید...... خوف کے بِنا......

عید کی خوشیاں
چاندرات کے ہنگامے
مانا کہ سب ہیں
محبت کرنے والوں کے نام
مگر!!
بس اِک بات کا خوف ہے دل میں
کیا بچپن کی عیدوں کی طرح
بغیر کسی فائرنگ کے خوف کے
بغیر کسی خودکش حملے کے خوف کے
بغیر کسی ٹارگٹ کلنگ میں
نامعلوم مرنے والوں کے خوف کے
ہم کہیں بھی آ جا سکیں گے
کیا ہم اِس برس بھی
بغیر کسی خوف کے
عید منا سکیں گے
محبت کرنے والے
محبت پا سکیں گے......؟



شعبان کھوسہ

کچھ تھا نہیں، یہاں تک کہ لیکچرز بھی نہیں لیے تھے پھر شرمندگی سے بچنے کا یہی طریقہ میرے سامنے تھا اور ابا کو بھی جھوٹ بول دیا کہ یونیورسٹی کے پیپرز ملتوی ہوگئے ہیں۔ یہ الگ بات کہ کچھ عرصے بعد اُن کو ساری حقیقت بتادی جس کی بنا پر وہ مجھ سے ایسے ناراض ہوئے کہ مرتے دم تک مجھ سے بات نہیں کی۔ صد افسوس کہ میں نے ابا کی حق حلال کی کمائی جو وہ میری پڑھائی پر خرچ کر رہے تھے، برباد کر ڈالی جس کی سزا میں آج بھگت رہا ہوں۔ شکیلہ کو میں نے جب یونیورسٹی چھوڑنے اور امتحان نہ دینے کا بتایا تو یہ بھی اپنی پڑھائی ترک کر کے گھر بیٹھ گئی اور ایک روز اپنے گھر سے نکل آئی اور ہم نے کورٹ میرج کرلی۔ آج ہم دونوں اپنی سزائیں بھگت رہے ہیں۔

واجبی تعلیم کی بنا پر میں کوئی دفتری کام کرنے کے قابل نہیں تھا۔ یہاں اچھے پڑھے لکھے نوجوان نوکری کے لیے دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ دن بھر میں کوئی دس قسم کے لوگ اسی مقصد کے لیے میرے پاس فال نکلواتے ہیں۔

ایک بار مجھے چپراسی کی نوکری ملی، تنخواہ تو کم تھی ہی، عزت بھی مزید کم ہوگئی۔ ہر دم کوئی نہ کوئی جھڑکتا، بدتمیزی کرتا۔ چند دن بعد اسے بھی چھوڑ دی۔ دکان پر لگا تو وہاں بھی یہی حال تھا پھر سمجھ آیا کہ ابا کیوں چاہتے تھے کہ تعلیم حاصل کروں تاکہ عزت دار زندگی گزار سکوں کیونکہ عزت کے لیے عہدے کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے پھر مجبوراً یہی پیشہ مجھے اپنانا پڑا۔ شکیلہ کے میرے ساتھ شادی کرنے پر اس کے گھر والوں نے اس سے ہمیشہ کے لیے ناطہ توڑ لیا ہے۔ شکیلہ نے اسکول اور کالج سے پڑھا تھا، بے شک انٹر پاس ہی کیا تھا، پر اتنا ہوا کہ معمولی تنخواہ پر ایک اسکول میں اسے ٹیچری کی نوکری مل گئی۔ دونوں کی آمدنی ملا کر بھی مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ ابا کا یہ کوارٹر میسر ہے سر چھپانے کے لیے۔ بہنوں کی شادی بھی ابا نے اپنی زندگی میں خود کردی تھی۔ ابا نے تو اپنا سارا فرض ادا کردیا، پر ایک میں ہی اپنے حصے کا فرض نہ نبھا سکا۔"

شکیلہ کے ہاتھ کی بنی چائے پینے اور ناصر کی داستان سننے کے بعد میں نے بوجھل قدموں سے واپسی کی راہ لی۔ دل میں اٹھتے مزید ہزاروں سوالات کو زباں پر لائے بغیر کہ ایک گمراہ آدمی مزید لوگوں کی گمراہی پر گامزن تھا محض اس لیے کہ اس کی دال روٹی چل سکے۔

وہ شخص جو دوسروں کی فال نکال کر ان کا حال بیان کرتا ہے، کسی نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ اس شخص کا اپنا حال، بے حال ہے۔

نوکری اور بزنس کے لیے فال نکلوانے والے اس کے آگے عقیدت سے بیٹھے اس کی دعاؤں کے منتظر ہوتے ہیں جسے خود اچھے اور باعزت روزگار کی ضرورت ہے۔ تعلیم میں کامیابی کے لیے آنے والے طالب علم کیا جانیں جس نے کبھی علم حاصل کرنے اور اس کی اہمیت جاننے کی کوشش ہی نہ کی، وہ بھلا تعلیم کے بارے میں انہیں کیا آگاہی دے سکتا ہے؟

گھریلو خاندانی رشتے بہتر ہونے کی دعا کروانے والی خواتین کو کیا پتہ کہ تعلیم چھڑا کر گھر والوں سے باغی کر کے جس لڑکی کو بیوی بنانے کے جرم کی پاداش میں خاندان نے ناطہ توڑ لیا ہے، وہ بھلا کسی خاندان کے رشتے جوڑنے کی فال کیا نکال کر بتائے گا؟

اگر آئندہ کبھی آپ سڑک سے گزر رہے ہوں اور آپ کو سڑک کے اس کردار سے اپنا حال معلوم کرنے کا خیال آئے تو ایک لمحے کو میری باتوں پر غور ضرور کیجیے گا کہ قسمت بتانے والے نجومی کی اپنی قسمت ایسی کیوں پھوٹی ہوئی ہے کہ وہ سرِ راہ بیٹھ کر اپنی روزی روٹی کا بندوبست کرنے پر مجبور ہے؟

☆☆

سلسلہ خاص — ایک نامور لکھاری کا تہلکہ خیز سلسلہ، جسے پڑھنے والے مدتوں یاد رکھیں گے

سلیم فاروقی

آتشِ جنوں

شاعر کا خیال

سو پیکاں تھے پیوستِ گلو جب چھیڑی پیار کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت، اس کے دل میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا۔ قسط نمبر 5

خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں، ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے، نہایت جرأت مند اور اپنی عزت و انا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے...... ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان، راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران اُن کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غنی، راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلہ کار ہے۔ ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں، اس جرائم پیشہ گروہ کے کچھ افراد حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ پولیس کی آمد ہوتی ہے اور وہ ان مجرموں کے ساتھ عمران اور ارسلان کو بھی پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتی ہے۔ ان کے درمیان منہ ماری ہوتی ہے اور راشد کے ایک اعلیٰ پولیس افسر سے رابطے کے باعث پولیس انہیں تھانے میں بیان ریکارڈ کرانے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دن راشد کا مرڈر ہوجاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جا کر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔

تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آجاتا ہے اور آزاد کرا کے کسی نامعلوم مقام پر لے جاتا ہے۔ یہاں عمران کو ارسلان بتاتا ہے کہ ان کی بہن شائستہ کو مشہدی نے کراچی سے باہر کہیں منتقل کردیا ہے۔ عمران جب

گھر پہنچتا ہے تو اُس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران پولیس، عمران کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اُس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی ماں کی اس صورتِ حال میں طبیعت بگڑتی ہے اور اُن کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ستم یہ ہی نہیں ہوا کہ عمران کی والدہ کا انتقال ہوا، اُس کے والد بھی اِس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو گئے تھے۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں پتہ لگتا ہے، عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ ارسلان، بیرسٹر بخاری کو اغوا کر کے لے آتا ہے اور پھر ایک مقام سے اس کی لاش ملتی ہے۔ ایسے میں اُن کے پاس ان کی اغوا شدہ بہن شائستہ کا فون آتا ہے اور پھر انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے...... عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں......

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے۔)

''یہ سب کیا ہو رہا ہے ارسلان؟'' تیمور نے بے بسی سے کہا۔ ''کیا ہم اتنے ہی بے بس اور مجبور ہو گئے ہیں؟ تیمور کے آدمیوں نے ڈولی کا سراغ لگا لیا اور اسے وہاں سے نکال کر لے گئے؟''

''اسے معلوم کیسے ہوا کہ ڈولی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اسے ڈولی کا سراغ کہاں سے ملا؟'' تیمور نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''یہ تو مشہدی ہی بتائے گا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ ہماری صفوں میں کوئی غدار موجود ہے جس نے مشہدی کو یہ خبر پہنچائی ہے۔'' تیمور نے کہا۔

''ہاں، اس بات کے تو امکانات ہیں کہ کوئی گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھا رہا ہے۔ پہلے عبداللہ کا قتل پھر ڈولی کی رہائی، یہ کسی اندر ہی کے آدمی کا کام ہے۔''

''مجھے معلوم ہو جائے گا کہ یہ کام کون کر رہا ہے؟'' تیمور نے کہا۔ ''میں اسے اتنی کڑی سزا دوں گا کہ اسے عبرت کا نشان بنا دوں گا۔''

''ارسلان!'' میں نے کہا۔ ''اب بہتر یہ ہی ہے کہ تم عدنان کو لے کر ملک سے باہر چلے جاؤ۔ عدنان یہاں رہا تو اس کی زندگی بھی خراب ہو جائے گی۔''

''ناممکن بھیا!'' ارسلان نے کہا۔ ''میں ان حالات میں آپ کو چھوڑ کر کہیں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔''

''ایک صورت ہو سکتی ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''میرا ایک بہت قریبی دوست ساجد گزشتہ دس سال سے امریکا میں مقیم ہے۔''

میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

''مجھے یوں مت گھوریں بھیا!'' تیمور نے کہا۔ ''ساجد بہت شریف اور سلجھا ہوا سیلف میڈ آدمی ہے، وہ گیا تو تعلیم حاصل کرنے تھا پھر وہیں مستقل طور پہ رہنے لگا اور شادی بھی کر لی۔ وہاں اس کا بہت بڑا ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے۔ ہم عدنان کو تعلیم کے لیے فوری طور پہ وہاں بھیج سکتے ہیں۔ ساجد خاصا ذمے دار آدمی ہے، وہ عدنان کا ہر طرح خیال رکھے گا۔''

تیمور کی تجویز میرے دل کو لگی اور میں نے فوراً ہامی بھر لی۔ عدنان کا پاسپورٹ بھی تیار تھا۔ ہم گزشتہ سال سیر و تفریح کے لیے یورپ اور امریکا گئے تھے تو وہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ میں کیا' ہماری پوری فیملی تھی' امی' ابو' شائستہ' میں' ارسلان اور عدنان!''

مجھے وہ سفر یاد آیا تو میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ ہم سب کتنے خوش تھے۔ ابو میری فرمائش پہ پہلی دفعہ اٹلی گئے تھے۔ مجھے وہاں کے پہاڑ دیکھنے کا شوق تھا۔ ہم لوگوں نے وہاں خوب انجوائے کیا تھا پھر وہاں سے واپسی پر سوئٹزرلینڈ اور لندن ہوتے ہوئے واپس آ گئے تھے۔

میں نے ارسلان سے کہا۔ ''عدنان کا پاسپورٹ تو موجود ہے' اس پہ صرف امریکا کا ویزہ لگوانا ہوگا۔''

''وہ سب کچھ ہو جائے گا۔'' تیمور نے کہا۔

''میں اپنی بہن اور ماں باپ کو تو کھو چکا ہوں' اب مزید کسی کو کھونا نہیں چاہتا۔'' میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

''ارسلان تو اپنی حفاظت خود کر سکتا ہے لیکن عدنان تو ابھی چھوٹا ہے؟''

''آپ فکر کیوں کرتے ہیں بھیا؟'' تیمور نے کہا۔ ''بس یہ سمجھیں کہ عدنان کا ایڈمیشن وہاں ہو گیا۔ ساجد کی بیگم جینی بھابھی کے وہاں بہت تعلقات ہیں۔ وہ امریکا کی ایک اعلیٰ فیملی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے ایک چچا سینیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ وہاں عدنان کو بہت آسانی سے کسی بھی یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جائے گا۔''

اسی وقت چوکیدار نے آ کر بتایا کہ کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔

''کون ہے؟'' میں نے کہا۔ ''تم نے اس کا نام پوچھا؟''

''صاحب! وہ اپنا نام ہاشم بتا رہا ہے۔'' چوکیدار نے جواب دیا۔ ''ہاشم!'' میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ ''یہ کون ہو سکتا ہے؟ اچھا تم اسے اندر بھیج دو۔''

تھوڑی دیر بعد ایک خوش شکل اور خوش پوش نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔

تیمور اسے دیکھ کر جھٹ کھڑا ہو گیا اور پلک جھپکتے میں ریوالور نکال لیا اور بولا۔ ''تمہاری جرات کیسے ہوئی یہاں تک آنے کی؟'' اس نے بپھر کر پوچھا۔

''تیمور صاحب! آپ پہلے اطمینان سے میری بات سن لیں پھر آپ چاہیں تو مجھے گولی مار دیجیے گا۔'' ہاشم نے کہا۔ ''میں نے مشہدی کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔''

''یہ کوئی نئی چال ہے؟'' تیمور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ میرے بھائی وسیم سے تو واقف ہوں گے؟'' ہاشم نے کہا۔ ''ایک ذرا سی بھول پہ مشہدی نے اسے میری آنکھوں کے سامنے گولی مار دی اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔''

''کیا؟'' تیمور نے حیرت سے کہا۔ ''مشہدی نے وسیم کو مار دیا؟ وہ تو اس کا خاص آدمی تھا؟''

''وہ مشہدی انتہائی ذلیل اور گھٹیا آدمی ہے' وہ اپنے کسی بھی خاص یا عام آدمی کا خیال نہیں رکھتا۔''

''پھر...... ڈولی کا سراغ اسے کیسے ملا؟'' تیمور نے پوچھا۔

''آپ کا ایک بہت سینئر آدمی ہے بابر خان۔'' ہاشم نے کہا۔

''ہاں' بابر خان صاحب تو ہمارے بہت سینئر ساتھی ہیں۔ وہ عبداللہ بھائی کے رائٹ ہینڈ تھے۔'' تیمور نے کہا۔

''اس بابر خان نے عبداللہ کو گولی ماری ہے اور مشہدی کو ڈولی کے بارے میں بتایا ہے۔'' ہاشم نے کہا۔

''صرف وہی جانتا تھا کہ ڈولی کہاں ہے؟''

''تم کیا ہمیں یہ ہی بتانے آئے ہو؟'' ارسلان نے خشک لہجے میں کہا۔

''نہیں' میں آپ کو ایک اور اہم بات بتانے آیا ہوں۔ آپ کی بہن شائستہ نے خودکشی نہیں کی ہے۔'' اس نے کہا۔

''مجھے تو پہلے ہی اندازہ تھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔'' ارسلان نے کہا۔ ''مشہدی نے اسے بھی اپنے ہاتھ سے گولی ماری ہوگی۔''

''جی نہیں۔'' ہاشم نے کہا۔ ''وہ ابھی زندہ ہیں اور مشہدی کی قید میں ہیں۔''

''کیا......؟'' ارسلان اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ''وہ تو ابھی شائستہ کی ڈیڈ باڈی بھیجنے کی بات کر رہا تھا؟'' ارسلان کے لہجے میں اب مجھے زندگی کی رمق محسوس ہو رہی تھی۔ خود میرا دل بھی خوشیوں سے بھر گیا تھا۔ میری لاڈلی بہن ابھی زندہ تھی۔

وہ وعدہ مشہدی نے اس وقت کیا تھا جب تک اسے ڈولی نہیں ملی تھی۔ اب وہ کہہ دے گا کہ میں نے تمہاری بہن کی تدفین خود ہی کر دی۔''

''شائستہ ہے کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اس وقت کراچی میں ہی ہیں۔'' ہاشم نے جواب دیا۔

''اسے کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟'' میں نے یوں پوچھا جیسے شائستہ کسی دوسرے شہر میں پڑھائی کے سلسلے میں مقیم ہو۔

''وہ بہت آرام سے ہیں۔'' ہاشم نے جواب دیا۔ ''اصل میں مشہدی' بابر خان کی طرح ارسلان اور تیمور کو بھی اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہے۔ وہ ان دونوں سے بہت متاثر ہے۔ اب تو وہ آپ سے بھی متاثر ہو گیا ہے۔ وہ شائستہ کو اپنے پاس رکھ کر آپ لوگوں پر پریشر ڈالے گا کہ آپ بھی اس کے لیے کام کریں۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ تیمور اور ارسلان میں بہت دوستی ہے' ان کے ذریعے وہ اس قاتل تک پہنچنا چاہتا ہے جو تیمور صاحب کے والد اور پھر اُن کی والدہ اور بہن کے قتل کا سبب بنا۔''

''ہاشم!'' میں نے کہا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ شائستہ زندہ ہے؟''

''مجھے اس کا اتنا ہی یقین ہے جتنا خود اپنے زندہ ہونے پر۔'' ہاشم نے جواب دیا۔

''بابر خان نے عبداللہ سے غداری کیوں کی؟'' ارسلان نے پوچھا۔ ''عبداللہ بھائی تو اس پہ بہت اعتبار کرتے تھے؟''

''گزشتہ دنوں ان دونوں میں معمولی سا ایک اختلاف ہو گیا تھا۔ اصل میں مشہدی نے عبداللہ کو خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ عبداللہ اس وقت شدید غصے میں تھا۔ وہ فوری طور پہ مشہدی کے خلاف کارروائی کرنا چاہتا تھا لیکن بابر خان فوری طور پہ کارروائی کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

عبداللہ نے غصے میں کہا۔ ''تم میرے حکم سے سرتابی کرو گے؟''

"دیکھو عبداللہ!" بابر خان نے کہا۔ "ہم دونوں آپس میں دوست ہیں۔ تم نے کبھی مجھے اپنا ماتحت نہیں سمجھا، ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کیا تو پھر اب تم میری رائے کو اہمیت کیوں نہیں دے رہے ہو؟"

"یہ ساری باتیں مجھے اُس وقت معلوم ہوئیں جب میں مشہدی کے ساتھ تھا۔" ہاشم نے کہا۔ "اصل میں مشہدی نے بابر خان کو عبداللہ سے پہلے ہی بدظن کر دیا تھا کہ عبداللہ محض اسے مطلب کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ جب اس کی اہمیت ختم ہو جائے گی تو وہ اسے استعمال شدہ ٹشو پیپر کی طرح پھینک دے گا۔

عبداللہ کا موڈ بھی کچھ دن سے خراب تھا۔ وہ بات بات پر جھنجلایا رہتا تھا۔ اسے سب سے زیادہ پریشانی آپ کی بہن شائستہ کی تھی۔ وہ اکثر بابر خان کو بھی جھڑک دیتا تھا۔

ان ہی دنوں مشہدی نے بابر خان کو کروڑوں روپے کی آفر کی کہ اگر وہ ڈولی کا پتا بتا دے تو اسے دس کروڑ روپے دے گا پھر اس نے نہ صرف بابر خان کو ایڈوانس کے طور پر دو کروڑ روپے دے بھی دیئے بلکہ اسے یہ آفر بھی کی کہ اگر وہ مشہدی کے ساتھ مل کر کام کرے تو اس سے کئی گنا زیادہ رقم ملے گی جتنی عبداللہ اسے دیتا ہے۔

آپ سب جانتے ہیں کہ عبداللہ بھائی کس قسم کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ بنیادی طور پہ جرائم پیشہ نہیں تھا۔ وہ تو بس پرانی کہانیوں کے کرداروں کی طرح ظلم اور زیادتی کے خلاف کارروائی کرتا تھا۔ وہ بڑے بڑے رشوت خور افسروں، ذخیرہ اندوزوں اور کرپٹ سیاست دانوں کا دشمن تھا۔ ان سے لاکھوں روپے مہینہ وصول بھی کرتا تھا لیکن اس رقم کا آدھے سے زیادہ حصہ غریبوں اور ناداروں کے کام آتا تھا۔ مشہدی طنز میں اسے سلطانہ ڈاکو اور رابن ہڈ کے نام سے یاد کرتا تھا۔ یہ لوگ بھی امیروں کو لوٹتے تھے اور غریبوں کی مدد کرتے تھے۔ عبداللہ اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ مشہدی نے خطیر رقم خرچ کر کے یہ رکاوٹ ہٹا دی کیونکہ وہ ہر ہر قدم پہ اس کا راستہ روکتا تھا۔"

"یہ باتیں تمہیں کسی نے بتائی ہیں یا تم اپنے اندازے سے کہہ رہے ہو؟" تیمور نے پوچھا۔

"کون سی باتیں؟" ہاشم خان نے پوچھا۔ "عبداللہ کے بارے میں یا......"

"میں بابر خان کی غداری کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" تیمور نے کہا۔

"یہ باتیں خود مجھے مشہدی نے بتائی ہیں۔" ہاشم نے کہا۔ "اس وقت تو وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتا تھا۔" ہاشم نے کہا۔

"لیکن ہم کیسے یقین کر لیں کہ تم اب بھی مشہدی کے ساتھ نہیں ہو؟"

"میرے پاس مشہدی کی ایک نہایت اہم مائیکرو فلم ہے، یہ فلم ممکن ہے اس فائل سے بھی زیادہ اہم ہو جو تیمور کے پاس ہے، میں وہ مائیکرو فلم لے آیا ہوں۔"

"ایک طریقہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس مائیکرو فلم کی ایک کاپی بنا کر ہمارے حوالے کرو اور تم خود دوبارہ مشہدی کے پاس چلے جاؤ۔"

"میں دوبارہ مشہدی کے پاس چلا جاؤں؟" ہاشم خان نے حیرت سے کہا۔ "تاکہ وہ مجھے قتل کر کے کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دے؟"

"کیوں بھئی؟" تیمور نے کہا۔ "تم تو اس کے خاص آدمی ہو، وہ تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرے گا؟"

"وہ ایسا اس لیے کرے گا کہ اس کے علاوہ صرف مجھے علم تھا کہ مشہدی نے وہ مائیکرو فلم کہاں رکھی ہے۔" ہاشم

امن

امن جو انسانی زندگی اور اس زندگی کے حسن و خوبی کی شرط اول ہے، مجھے اپنی تحریر و عمل میں ایسا کوئی نام نظر نہیں آتا جو اس عظیم اعزاز کے شایانِ شان ہو لیکن اس عزت بخشی کی ایک وجہ ضرور ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس تمنا اور آدرش کے ساتھ مجھے اور میرے ساتھیوں کو وابستگی رہی ہے، یعنی امن اور آزادی کی تمنا، وہ بجائے خود اتنی عظیم ہے کہ اس واسطے سے ان کے حقیر اور ادنیٰ کارکن بھی عزت اور اکرام کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ یوں تو ذہنی طور سے مجنوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سب ہی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور یہ سب ہی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے، جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے۔ یعنی شعور اور ذہانت، انصاف اور صداقت، وفا اور شجاعت، نیکی اور رواداری۔ اس لیے بظاہر امن کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوش مند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔

(فیض احمد فیض کی "دست تہ سنگ" سے اقتباس)

خان نے کہا۔ "ہاں، اگر آپ کو مجھ پہ اعتماد نہیں ہے تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں لیکن مشہدی کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں ملک سے باہر جانے کی کوشش کروں گا۔ یہاں تو مشہدی مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولا۔ "زندہ تو وہ خیر، مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں، وہ دنیا کے دوسرے سرے پر بھی تلاش کر کے مجھے مار ڈالے گا۔" پھر وہ افسردگی سے بولا۔ "ہاں، یہ مائیکرو فلم آپ لوگ رکھ لیں، آپ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

"تم تو برا مان گئے۔" میں نے کہا۔ "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس مائیکرو فلم کی ایک کاپی بنا کر ہم اپنے پاس رکھ لیں اور اصل فلم تم دوبارہ وہیں رکھ دو جہاں سے اٹھائی تھی۔ مشہدی کو تم پر شک بھی نہیں ہوگا۔"

"یہ آپ کا خیال ہے۔" ہاشم خان نے کہا۔ "میں کئی گھنٹے سے غائب ہوں، مشہدی سب سے پہلے میرے سامان کی تلاشی لے گا۔ وہ ایسا ہی بدگمان ہے کیونکہ اس کے دل میں چور ہے پھر وہ ان چیزوں کو تلاش کرے گا جو اس نے مجھے رکھنے کو دی تھیں۔ میں وہ تمام چیزیں بھی لے آیا ہوں۔ ان چیزوں کو غائب پا کر وہ فوری طور پہ اس مائیکرو فلم کو تلاش کرے گا۔ جب وہ بھی غائب ہو گی تو وہ سمجھ جائے گا کہ میں نے اس کے ساتھ غداری کی ہے اور وہاں سے فرار ہو گیا ہوں۔"

"لیکن کیا ضروری ہے کہ اس نے وہ مائیکرو فلم تلاش کی ہو؟" ارسلان نے کہا۔ "کیا اس سے پہلے تم کبھی وہاں سے کہیں نہیں گئے؟"

"میں وہاں سے متعدد بار آیا ہوں لیکن مشہدی کے علم میں ہوتا ہے کہ میں کہاں ہوں۔ زیادہ تر ندیم ہی کے کام سے باہر نکلتا ہوں۔ ممکن ہے، اسے اب تک مجھ پر شبہ نہ ہوا ہو لیکن اس کے امکانات ففٹی ففٹی ہیں۔"

"ہاشم ٹھیک کہہ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "مشہدی نے اس کے بھائی کو ہلاک کیا ہے۔ اس کے دل میں پہلا خیال یہی آئے گا کہ ہاشم خان یہاں سے فرار ہو گیا ہے۔ وہ فوراً ہی ان تمام چیزوں کو چیک کرے گا جو ہاشم کے قبضے میں تھیں۔"

”شکر ہے عمران صاحب! آپ کو میری بات کا یقین تو آیا۔“

”یقین تو اس وقت آئے گا ہاشم خان!“ تیمور نے کہا۔ ”جب مشہدی کھل کر تمہارے سامنے آئے گا۔“

”ایسا بھی ہوگا۔“ ہاشم خان نے کہا۔ ”وہ ایک آدھ روز میں معلوم کرے گا کہ میں کہاں ہوں؟ میری وجہ سے تو آپ بھی مصیبت میں پڑ جائیں گے اس لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ یہ مائیکرو فلم اپنے پاس رکھیں اور مجھے جانے دیں۔ جب آپ لوگ مجھ پر اعتماد نہیں کر رہے ہیں تو پھر میرے یہاں رہنے کا فائدہ کیا ہے؟“

”یہ بات نہیں ہے ہاشم خان!“ ارسلان نے کہا۔ ”اصل میں دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ تم فی الحال کہیں روپوش ہو جاؤ۔“

”میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔“ ہاشم نے کہا۔

”تو پھر فکر کی کوئی بات نہیں ہے، میرے پاس ایسے کئی ٹھکانے ہیں جن کا علم مشہدی تو مشہدی، عبداللہ بھائی کو بھی نہیں تھا۔ تم وہاں محفوظ رہو گے۔“

”فی الحال تو تم یہیں رہو۔“ میں نے کہا۔ ”مشہدی کے فرشتوں کو بھی یہ علم نہیں ہوگا کہ تم ہمارے پاس آ گئے ہو۔ ارسلان اور تیمور تمہیں جانتے ہیں، وہ تو مشہدی کے آدمی سمجھ کر تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”کم سے کم مشہدی یہی سوچے گا۔“

”اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس مشہدی سے ہی دو دو ہاتھ کر لیں۔“ تیمور نے کہا۔ ”میرے قبضے میں وہ فائل نہ سہی، ہاشم کی لائی ہوئی مائیکرو فلم تو ہے۔ ہم اس کے ذریعے اسے بلیک میل کر سکتے ہیں۔“

”آپ پہلے بابر خان کی فکر کریں۔“ ہاشم نے کہا۔ ”وہ آستین کا سانپ ہے اور آپ کی بہت سی باتوں سے واقف بھی ہے۔ اس کے علم میں آپ کے مختلف ٹھکانے بھی ہوں گے۔“

”ہاشم خان کی یہ بات درست ہے۔“ ارسلان نے کہا۔ ”واقعی بابر خان ہمارے لیے مشہدی سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ گھر کا بھیدی کسی بھی وقت لنکا ڈھا سکتا ہے۔“

”بابر خان کہاں ملے گا؟“ میں نے ہاشم سے پوچھا۔

”وہ کل تک تو مشہدی کے ساتھ تھا۔“ ہاشم نے جواب دیا۔ ”پھر شاید مشہدی ہی نے اسے کسی جگہ بھیجا تھا۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مشہدی کے ساتھ ہے یا کہیں اور ہے؟“

”اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ تیمور نے کہا۔ ”اسے ابھی تک یہ علم نہیں ہوگا کہ اس کا بھانڈہ پھوٹ چکا ہے۔ ہم خود بھی اس سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ ہمارے لیے تو وہ اب بھی ایک طرح سے عبداللہ بھائی کا جانشین ہے، اب ہم اسی سے رابطہ کریں گے۔“

”ہاں، تیمور کی یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ بابر خان کو ٹیلی فون کر کے یہاں بلا لو۔“ میں نے کہا۔

تیمور نے اسی وقت سیل فون جیب سے نکالا اور بابر خان کا نمبر ڈائل کیا لیکن اس کا سیل فون آف تھا۔

”اس کا سیل فون بند ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”ایسا اکثر ہوتا ہے۔ وہ جب کسی مشن میں مصروف ہوتا ہے تو اپنا سیل فون آف کر دیتا ہے۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں اسے پھر ٹیلی فون کروں گا۔“

میں ٹہلتا ہوا باہر لان میں آ گیا۔ باؤنڈری وال دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اسے مزید بلند ہونا چاہیے اور اس پہ خاردار تار بھی ہونا چاہئیں۔

جس وقت یہ بنگلہ تعمیر ہوا تھا تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کبھی ایسے حالات سے بھی سابقہ پڑے گا۔ اب ہماری کھلی جنگ ایک بین الاقوامی دہشت گرد سے تھی اس لیے انتظامات بھی اسی لحاظ سے کرنا تھے۔ میں نے سوچا کہ موقع ملتے ہی یہ باؤنڈری وال نہ صرف بلند کراؤں گا بلکہ اس پہ خاردار تار بھی لگاؤں گا۔

تیمور اور ارسلان بھی باتیں کرتے ہوئے لان میں آ گئے۔ ہاشم نے ہمارے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ارسلان نے آہستہ سے کہا۔ ''بھیا......! میں ابھی ہاشم کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ یہ مشہدی کی کوئی چال بھی ہو سکتی ہے۔'' ارسلان نے کہا۔

''بھیا......! میرا بھی یہ ہی خیال ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''مجھے بھی ابھی اس پہ پوری طرح اعتبار نہیں ہے۔''

''ممکن ہے' تمہارا خیال درست ہو لیکن مجھے اس کے الفاظ اور لہجے میں سچائی محسوس ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اندازے کی غلطی تو آپ سے بھی ہو سکتی ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''میں فی الحال گارڈ کو یہ ہدیت دے دیتا ہوں کہ ہاشم کو بنگلے سے باہر نہ جانے دیا جائے۔''

''اس طرح تو وہ ہم سے بھی برگشتہ ہو جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''پھر تم بھول رہے ہو کہ وہ مشہدی کی ایک انتہائی اور خفیہ مائیکرو فلم لے کر آیا ہے۔''

''وہ فلم تو ابھی ہم میں سے کسی نے بھی نہیں دیکھی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس میں کیا ہے؟'' ارسلان نے کہا۔

''تو پھر ایسا کرو کہ پہلے وہ فلم دیکھ لو۔'' میں نے کہا۔ ''اس سے ہاشم خان کی حقیقت سامنے آ جائے گی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں لیکن اس وقت تک میں چاہتا ہوں کہ ہاشم خان کی نگرانی کی جائے اور اسے اس بنگلے تک محدود کر دیا جائے۔'' ارسلان نے کہا۔ ''ہم اس سے یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس کی حفاظت کے خیال سے ایسا کر رہے ہیں؟''

''پہلے تم بابر خان سے بات کرو۔ دیکھو وہ کیا کہتا ہے؟'' میں نے ارسلان سے کہا۔

اس نے سیل فون نکال کر بابر خان کا نمبر ملایا پھر آہستہ سے بولا۔ ''بیل جا رہی ہے۔'' دوسرے ہی لمحے وہ بولا۔ ''السلام علیکم! بابر بھائی......! آپ کہاں ہیں؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آپ نے عبداللہ بھائی کے بارے میں تو...... میں فوری طور پہ آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' ارسلان نے کہا۔ ''کیا آپ میرے گھر آ سکتے ہیں؟ کہاں......؟ اچھا' لاہور میں ہیں۔ ٹھیک ہے' میں آپ کی فون کال کا انتظار کروں گا۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر کے مجھ سے کہا۔ ''بھیا......! وہ اس وقت لاہور میں ہے۔''

''بکواس کر رہا ہے وہ......'' تیمور نے کہا۔ ''وہ لاہور کیوں جائے گا؟''

''کہہ رہا تھا کہ عبداللہ کے کسی کام سے میں لاہور آیا تھا۔ میرے پیچھے یہ سب کچھ ہو گیا۔''

اسی وقت ہاشم بھی ٹہلتا ہوا وہاں آ گیا۔ اس نے شاید میرا آخری جملہ سن لیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کون لاہور میں ہے؟''

''بابر خان اس وقت لاہور میں ہے۔'' ارسلان نے بتایا۔ ''ابھی سیل فون پر اس سے بات ہوئی ہے۔''

''وہ جھوٹ بول رہا ہے......'' ہاشم نے کہا۔ ''میں نے آنے سے پہلے خود اسے مشہدی کے بنگلے پر دیکھا تھا۔

اس نے کہا ہے کہ وہ کراچی پہنچ کر ہمیں ٹیلی فون کرے گا۔ وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے اسے عبداللہ کی موت کی خبر لاہور میں ملی ہو۔''

''وہ انتہائی جھوٹا اور خود غرض شخص ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ عبداللہ جیسا ذہین اور محتاط آدمی اس سے کیسے دھوکہ کھا گیا؟''

ہاشم نے کہیں باہر جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے خود ہی کہا۔ ''ارسلان! میں تو ابھی کچھ دن گھر سے باہر نہیں نکل سکوں گا۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ہاشم خان خود ہی گھر میں رہنا چاہتا تھا۔

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ملازم افضل بابا نے بتایا۔ ''صاحب جی! گھر میں راشن ختم ہو گیا ہے۔ میں راشن لینے جا رہا ہوں۔''

''ٹھہرو' تم پہلے سامان کی لسٹ تو بنا لو۔'' پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ ''میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔ مجھے اپنی بھی کچھ چیزیں خریدنا ہیں۔ چلیے' میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' ارسلان نے کہا۔

''نہیں ارسلان! تمہارا گھر پہ رہنا بہت ضروری ہے۔ پولیس یہاں پھر آ سکتی ہے۔''

میں نے افضل ہی کو ساتھ لے لیا' وہ ڈرائیونگ بھی جانتا تھا۔

پہلے ہم نے راشن کی خریداری کی' اس میں آٹے' دال وغیرہ کے علاوہ میں نے شیونگ ریزر' ٹوتھ پیسٹ' کافی' انڈے' مکھن' دودھ کے ٹیٹرا پیک کے دو کارٹن بھی خرید لیے۔

مجھے اصل میں ریوالورز اور پسٹل کے لیے ایکسٹرا راؤنڈز اور میگزینز کی خریداری کرنا تھی۔ اسلحے کے ڈیلر' ایمونیشن بہت محتاط ہو کر دیتے ہیں۔ جب میں نے اس سے مزید دو راؤنڈز کی فرمائش کی تو اس نے کہا۔ ''عمران صاحب! میرے پاس تو جو کچھ ہے' وہ آن ریکارڈ ہے۔ میں نے اگر آپ کو مقررہ تعداد سے زیادہ میگزین اور راؤنڈز دے دیئے تو مجھے اس کا حساب دینا پڑے گا اور آپ کو بھی۔ میں نے سنا ہے کہ آپ پر تو یوں بھی پولیس کیس چل رہا ہے؟''

''لیکن موجودہ حالات میں مجھے شدید ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس کا ایک طریقہ ہے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کو شامل خان کا سیل نمبر دے دیتا ہوں' آپ میرے حوالے سے بات کیجیے گا۔ وہ معقول رقم کے عوض آپ کو میگزین تو کیا' ہر قسم کا جدید اسلحہ فراہم کر دے گا۔''

''یہ شامل خان مجھے کہاں ملے گا؟''

''یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔'' ڈیلر نے کہا۔ ''ایسے لوگ اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ آپ سیل نمبر پر اس سے رابطہ کر کے وقت اور جگہ طے کر لیں۔''

''چلو پھر اسی کا سیل نمبر دے دو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن آدمی تو قابل بھروسہ ہے؟''

''اس قسم کے لوگ عام آدمی کے مقابلے میں زیادہ قابل بھروسہ اور قابل اعتبار ہوتے ہیں۔'' اس نے ایک پرچی پر شامل خان کا نمبر لکھ دیا۔

میں نے گاڑی میں بیٹھ کر شامل خان کا نمبر ملایا تو کسی پشتو گانے کی رنگ ٹون بجنے لگی پھر فوراً ہی کسی نے

کال ریسیو کرلی۔ ''السلام علیکم!'' اس نے کہا۔

''وعلیکم السلام!'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے شامل خان صاحب سے بات کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''شامل خان بول رہا ہے۔ آپ کون؟''

''خان صاحب' میرا نام عمران ہے۔'' میں نے اسے اپنا اصلی نام بتا دیا کہ ممکن ہے' وہ اسلحے کے ڈیلر آفتاب سے اس کی تصدیق کرے۔ ''مجھے آفتاب صاحب نے آپ کا نمبر دیا ہے۔''

''اچھا' اچھا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اگر آفتاب صاحب نے آپ کو نمبر دیا ہے تو پھر خطرے والا کوئی بات نہیں ہے۔ آپ ام کو بتاؤ صاب' آپ کو کیا چاہیے؟'' اس کا لہجہ قبائلی علاقوں والا تھا لیکن اردو بہت حد تک صاف بول رہا تھا۔

''خان صاحب! مجھے مشین پسٹل کے کچھ میگزین اور پوائنٹ تھری ایٹ ریوالورز کے کچھ راؤنڈز چاہئیں۔''

''بس عمران صاحب' اتنا سا کام؟'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں تو سمجھا تھا کہ آپ کو کے کے یا بڑے بور کا اسلحہ چاہیے ہوگا؟''

''مجھے اس کی بھی ضرورت پڑے گی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن فی الحال......''

''کوئی پروا نہیں صاحب......'' اس نے پھر ہنس کر کہا۔ ''آپ جب چاہو' یہ سامان ہم سے لے لو۔''

''لیکن کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''جہاں آپ بولو۔'' اس نے کہا۔

''اچھا' میں بعد میں آپ کو ٹیلی فون کرتا ہوں' ابھی تو میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔''

''جب آپ کے پاس ٹائم ہو صاحب......'' اس نے کہا۔ ''ہم تو ہر وقت حاضر ہے۔''

''شکریہ خان صاحب' اللہ حافظ!''

''فی امان اللہ!'' اس نے جواب دیا۔

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں پہلے ارسلان اور تیمور سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے افضل سے کہا۔ ''اب سیدھے گھر چلو۔''

ڈرائیونگ کرتے ہوئے افضل نے کہا۔ ''صاحب جی' ایک سوزوکی ہائی روف' بہت دیر سے ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔''

میں چونک اٹھا۔ ''تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' میں نے کہا۔ ''وہ گاڑی کب سے ہمارے پیچھے ہے؟''

''جب آپ آفتاب صاحب کے مکان سے نکلے تھے تو میں نے اس گاڑی کو پیچھے آتے دیکھا تھا۔'' افضل نے کہا۔

اس وقت ہم ایف ٹی سی پر تھے۔ میں نے افضل سے کہا۔ ''گاڑی ایک سائیڈ میں روک لو۔''

افضل نے گاڑی کی رفتار کم کی اور اسے سائیڈ پر روک لیا پھر اس نے گاڑی کا بونٹ کھولا اور گاڑی سے اتر کر اس میں یوں جھانکنے لگا جیسے انجن میں کوئی خرابی واقع ہو گئی ہو۔

گاڑی رکتے ہی ایک آف وہائٹ سوزوکی بولان ہماری گاڑی کے پاس سے گزری۔ مجھے اس میں بیٹھے ہوئے افراد کی صرف ایک جھلک دکھائی دی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ یہ پولیس کے آدمی ہوں گے لیکن ان کی گاڑی

اور حلیوں کی جو ایک جھلک مجھے نظر آئی تھی' اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کا تعلق پولیس سے نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے' وہ گاڑی شروع ہی سے ہمارے پیچھے رہی ہو اور افضل نے نوٹس نہ لیا ہو۔ افضل بے چارہ سیدھا سادہ گھریلو ملازم تھا' مزید پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ سوزوکی ہم سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔

میں نے افضل سے کہا۔ ''افضل' ایسا کرو' تم ڈرائیونگ سیٹ سے پسنجر سیٹ پر آ جاؤ۔ گاڑی اب میں ڈرائیو کروں گا۔''

''خیریت تو ہے صاحب جی؟'' افضل نے پوچھا۔ ''کیا میری ڈرائیونگ میں کوئی خامی ہے؟''

''نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن جو سوزوکی ہمارے پیچھے تھی' وہ اب' ہم سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ ہمیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔''

افضل نے بونٹ بند کیا اور پسنجر سیٹ پر آ گیا۔ میں گاڑی کے اندر ہی سے کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

افضل کے بیٹھتے ہی میں نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسے جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بائیں طرف کا انڈی کیٹر بھی روشن کر دیا تا کہ سوزوکی والے یہ سمجھیں کہ میں کالے پل کے راستے سے جانا چاہتا ہوں۔

میری توقع کے عین مطابق سوزوکی بھی آگے بڑھی اور ہم سے پہلے اس طرف مڑ گئی جس طرف جانے کا اشارہ میں نے کیا تھا۔

اس موڑ تک پہنچتے ہی میں نے دائیں طرف کا انڈی کیٹر دے دیا اور گاڑی کو بائیں طرف موڑنے کی بجائے سیدھا ہی لے گیا۔ اس کوشش میں پیچھے سے آنے والی گاڑی سے تصادم ہوتے ہوتے بچا۔ اس گاڑی کے ڈرائیور نے بلند آواز میں مجھے گالی دی اور چیخ کر بولا۔ ''او بھائی......! نشے میں ہے کیا؟''

میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے گاڑی کو انتہائی تیز رفتاری سے دوڑانا شروع کر دیا۔

سوزوکی والوں کو اس بات کا احساس اس وقت ہوا ہو گا جب انہوں نے مجھے سیدھا جاتے دیکھا ہو گا۔ اب وہ واپس مڑ بھی نہیں سکتے تھے۔

میں تیز رفتاری سے ہوٹل ریجنٹ پلازہ تک پہنچا اور گاڑی کو تیز رفتاری سے جناح اسپتال کی طرف جانے والی سڑک پہ موڑ دیا۔ میں کینٹ اسٹیشن کے راستے سے ہوتا ہوا انتہائی برق رفتاری سے گھر پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ سوزوکی والے ہمیں آگے کسی راستے سے گھیرنے کی کوشش کریں گے لیکن دور دور تک اس سوزوکی کا نام و نشان نہیں تھا۔

میں گاڑی سے اتر کر لاؤنج میں چلا گیا اور افضل گاڑی سے سامان اتارنے لگا۔

ارسلان میرے چہرے سے پریشانی بھانپ گیا اور بولا۔ ''بھیا! خیریت تو ہے؟ آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟''

تیمور بھی تشویش سے مجھے دیکھ رہا تھا اور ہاشم بھی۔

میں نے مختصراً انہیں سوزوکی کے بارے میں بتایا۔

''یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟'' تیمور نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ مشہدی کے آدمی

تھے۔"

"لیکن وہ ہمارا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟"

"ممکن ہے، وہ لوگ آپ کو اغوا کرنا چاہتے ہوں۔" ارسلان نے کہا۔ "یہ بات تو طے ہے کہ وہ آپ کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ گاڑی پر اس وقت اندھا دھند فائرنگ کر سکتے تھے جب ان لوگوں نے آپ کو اوورٹیک کیا تھا۔"

"پھر آپ نے بتایا ہے کہ آپ کچھ دیر وہاں کھڑے بھی رہے۔" تیمور نے کہا۔ "اگر انہیں نقصان ہی پہنچانا ہوتا تو وہ گاڑی کو ریورس کر کے آپ کے نزدیک آ کے فائر کھول دیتے۔"

"اور تمہارے خیال میں وہ مجھے مارنے میں کامیاب ہو جاتے؟" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"یہ تو بعد کا مرحلہ ہوتا بھیا......!" تیمور نے کہا۔ "لیکن ان کا ارادہ ہرگز آپ کو نقصان پہنچانے کا نہیں تھا۔ میں اگر ان لوگوں کو دیکھ لیتا تو پہچان بھی لیتا۔" ہاشم نے کہا۔ "آپ نے اچھا کیا کہ مقابلہ کرنے کی بجائے آپ سیدھے گھر آ گئے۔"

"بھیا......!" ارسلان نے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے بابر خان کا ٹیلی فون آیا تھا کہ وہ کراچی پہنچ چکا ہے۔ بہ قول اس کے، عبداللہ کے بعد اس کی جان بھی خطرے میں ہے اس لیے وہ ابھی ہمیں بھی یہ نہیں بتانا چاہ رہا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔"

"فلائٹ انکوائری سے معلوم کرو کہ لاہور کی فلائٹ کب آئی تھی؟" تیمور نے کہا۔

"اس سے فائدہ کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "ہم تو جانتے ہیں کہ وہ کراچی ہی میں ہے اور جھوٹ بول رہا ہے......" میں نے کہا۔ "اب کسی طرح اس سے ملنے کی کوشش کرو۔"

"اس سے ملنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔" تیمور نے کہا۔ "ہم اس سے یہ کہیں گے کہ عبداللہ نے ہمارے پاس تنظیم کی کچھ امانتیں رکھوائی تھیں، اس میں کچھ فائلیں ہیں اور ایک کروڑ روپے نقد ہیں۔ اب چونکہ تنظیم کے سربراہ آپ ہیں تو آپ ہی یہ امانتیں سنبھالیں اور یہ بھاری ذمے داری اٹھائیں۔"

"وہ فوراً شک میں پڑ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ عبداللہ کے اتنے ہی نزدیک تھا تو اسے ضرور معلوم ہوگا کہ عبداللہ نے ہمارے پاس کچھ فائلیں رکھوائی تھیں۔ اسے کیش کا بھی علم ہوگا۔"

"بات تو آپ کی درست ہے۔" تیمور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "وہ تو عبداللہ کی ایک ایک بات سے واقف تھا۔ ہمیں کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔"

•......•......•......•

رات کے کھانے کے بعد اچانک بابر خان کا ٹیلی فون آ گیا۔ اس نے ارسلان کے سیل فون پر کال کی تھی۔

"بابر صاحب، آپ کہاں ہیں؟" ارسلان نے پوچھا۔ "مجھے آپ سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

"میں نے اس لیے ٹیلی فون کیا تھا۔" بابر خان نے کہا۔ "ڈیفنس فیز فائیو میں ایک بنگلہ ہے، تم تیمور کو لے کر آج رات ساڑھے بارہ بجے تک پہنچو۔"

"تیمور کو لے کر؟" میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ "تیمور آج کل نہ جانے کہاں غائب ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ کبھی کبھار مجھ سے ٹیلی فون پر رابطہ کر لیتا ہے۔ ہماری ملاقات شاید گزشتہ کئی ہفتے سے نہیں ہوئی۔"

"جھوٹ مت بولو ارسلان!" بابر خان نے کہا۔ "تیمور گزشتہ ہفتے ہی تم سے ملا ہے۔"

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے بابر خان صاحب!" میں نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کراچی میں ہے یا کراچی سے باہر ہے؟ ہاں، اس کا ٹیلی فون اکثر آ جاتا ہے۔"

"تم اسے ٹیلی فون کرو اور معلوم کرو کہ وہاں کہاں ہے؟"

"اوکے باس......" میں نے چاپلوسی سے کہا پھر میں نے تیمور کو ساری بات تفصیل سے بتا دی۔

"تم تھوڑی دیر میں بابر خان کو کال کرو، اس سے کہنا کہ تیمور کراچی میں ہے۔ آپ مجھے پتا سمجھا دیں، میں اسے بتا دوں گا، وہ خود ہی وہاں پہنچ جائے گا یا آپ براہ راست اس سے بات کر لیں۔ وہ تو خود آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے، میں نے بابر خان کو ٹیلی فون کیا۔

اس نے میری آواز سنتے ہی کہا۔ "ہاں، تیمور سے بات ہوئی؟"

"جی ہاں، ہوئی۔ وہ اس وقت محمد علی سوسائٹی کے کسی بنگلے میں ہے لیکن آپ تک پہنچ جائے گا۔" میں نے کہا۔

"تم وہاں کا پتا سمجھ لو۔" بابر خان نے کہا۔ "کالے پل سے اترتے ہی جو سگنل ہے، اس کے ساتھ ہی سڑک کی دونوں جانب پیٹرول پمپس ہیں۔ تم اس پیٹرول پمپ کے پاس پہنچ کر میرا انتظار کرو۔"

"میں اگر شاہراہ فیصل سے آؤں گا تو ایک پیٹرول پمپ میرے بائیں جانب پڑے گا اور اگر کورنگی روڈ کی طرف سے آؤں گا تو دوسرا پیٹرول پمپ دائیں جانب ہوگا۔ آپ کون سے پمپ کی بات کر رہے ہیں؟"

"ظاہر ہے، تم شاہراہ فیصل سے تو نہیں آؤ گے۔" بابر خان نے جھنجھلا کر کہا۔ "اس لیے تمہیں اس پیٹرول پمپ پر ٹھہرنا ہوگا جو کورنگی روڈ سے آتے ہوئے بائیں جانب ہے۔ میں تیمور کو کال کر کے اسے بھی ایڈریس سمجھا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں ابھی تیمور کو اپنی گفتگو کی تفصیل سنا ہی رہا تھا کہ اس کے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔

اس نے ٹیلی فون کے اسکرین پر نظر ڈالی پھر آہستہ سے بولا۔ "خاموش ہو جائیں، بابر خان کا ٹیلی فون ہے۔"

ہم سب خاموش ہو گئے۔ تیمور نے سیل فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔ "ہیلو باس...... کیسے ہیں آپ؟ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں...... آج کل محمد علی سوسائٹی میں ایک دوست کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ نہیں باس، میں نے تو آپ کو کئی دفعہ کال کرنے کی کوشش کی لیکن آپ کا سیل فون ہی آف تھا۔ نہیں باس، ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس کی حرکت ہے؟ مجھے اگر معلوم ہوتا تو میں اپنے ہاتھوں سے اس کی گردن مروڑ دیتا...... جی باس، یہ تو مجھے یقین ہے کہ اس میں مشہدی ہی کے کسی آدمی کا ہاتھ ہے۔ جی کون......؟ ہاں، یہ اس کا کام ہو سکتا ہے۔ مجھے بھی اس پر شبہ ہے کیونکہ عبداللہ پر کوئی چھوٹا موٹا یا اناڑی ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ میں خود آپ سے ملنے کو بے چین ہوں باس۔ جی بتایئے۔" وہ چند لمحے خاموشی سے بابر خان کی باتیں سنتا رہا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے باس، میں پہنچ جاؤں گا۔ جی ہاں، شارپ بارہ بج کر تیس منٹ پر۔ جی باس، ارسلان نے وعدہ تو کیا ہے کہ وہ آپ کے بتائے ہوئے پمپ کے پاس پہنچ جائے گا۔ جی سر، میرا سیل فون تو کبھی آف ہی نہیں ہوتا۔ اوکے باس، میں وہاں پہنچ کر آپ کو کال کر دوں گا۔ ٹھیک ہے باس......" تیمور بھی پوری طرح اس کی خوشامد پر تلا ہوا تھا ورنہ تو اس نے آج

تک کبھی عبداللہ کو باس نہیں کہا تھا' کم سے کم میں نے نہیں سنا تھا۔
پھر شاید دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔
''وہ مجھے ڈیفنس کے ایک پیٹرول پمپ کے پاس بلا رہا ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''تمہیں بھی اس نے وہیں ٹھہرنے کو کہا ہو گا؟''
''ہاں۔'' میں نے مختصر جواب دیا پھر تیمور سے بولا۔ ''یار' یہ بابر خان کی کوئی چال نہ ہو؟''
''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' تیمور نے کہا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔ ''اس وقت پونے گیارہ بجے ہیں۔ بابر خان نے ہمیں ساڑھے بارہ کا وقت دیا ہے۔ ہمارے پاس پینتالیس منٹ ہیں۔ ہم اس وقت میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔'' پھر اس نے سیل فون پر کوئی نمبر ملایا اور بولا۔ ''نعیم' تم مزید تین آدمیوں کو لے کر ارسلان کے بنگلے پر آ جاؤ' ابھی فوراً' ہاں' ایمرجنسی ہے اور پوری تیاری سے آنا۔'' اس نے سیل فون آف کر کے کہا۔ ''میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ بابر خان بھی کیا یاد کرے گا جب اس کی چال ہم اس پر الٹ دیں گے۔''
''تم دونوں اکیلے نہیں جاؤ گے۔'' میں نے کہا۔ ''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔''
''آپ فکر مند مت ہوں بھیا!'' ارسلان نے کہا۔ ''ہم اکیلے کب ہیں' تیمور بھی تو میرے ساتھ ہے اور اس کے دوسرے آدمی......''
''تو......'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں تم لوگوں کے ساتھ جاؤں گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
میرے تیور دیکھ کر تیمور اور ارسلان دونوں خاموش ہو گئے۔
پندرہ منٹ کے اندر اندر تیمور کے ساتھی وہاں پہنچ گئے لیکن انہوں نے ایک عقل مندی یہ کی تھی کہ وہ براہ راست بنگلے کے گیٹ پر نہیں آئے تھے بلکہ وہاں سے کچھ فاصلے پر رک کر تیمور کو کال کی تھی۔
''میں انہیں سمجھا کر آتا ہوں۔'' تیمور نے کہا۔ ''اس وقت تک آپ لوگ بھی تیاری کر لیں۔'' یہ کہہ کر تیمور باہر نکل گیا۔
''بھیا' میں گاڑی کی بجائے بائیک پر جاؤں گا۔'' ارسلان نے کہا۔ ''ایسے موقعوں پر بائیک زیادہ کارآمد ہوتی ہے۔''
''نہیں ارسلان!'' میں نے کہا۔ ''بائیک خاصی غیر محفوظ ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے اگر اچانک ہی فائرنگ شروع کر دی تو......''
''بھیا! بابر خان مجھے اور تیمور کو ہلاک نہیں کرے گا۔'' ارسلان نے کہا۔ ''اگر اس نے ہمیں ہلاک کر دیا تو پھر وہ اس فائل تک کیسے پہنچے گا جو تیمور کی تحویل میں ہے؟''
''وہ صرف تیمور کے ساتھ یہ رعایت کرے گا۔ تمہیں کس خوشی میں زندہ چھوڑے گا؟'' میں نے کہا۔ ''تم میرے ساتھ گاڑی میں چلو گے۔ میں اس انداز سے گاڑی میں بیٹھوں گا کہ باہر والوں کو معلوم بھی نہیں ہو گا کہ تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟'' یہ کہہ کر میں اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ میں نے جینز جیکٹ اور جوگرز پہنے' دونوں بغلی ہولسٹر لگائے اور ریوالورز کے کئی میگزین اپنی جیب میں بھی ڈال لیے۔

تیمور واپس آیا تو ہم لوگ بالکل تیار تھے۔
پہلے میں ارسلان کے ساتھ ایک گاڑی میں نکلا۔ میں نے پسنجر سیٹ کی پشت کھول کر اسے بالکل بیک سیٹ سے ملا دیا تھا۔ اب میں گاڑی میں بیٹھا نہیں بلکہ لیٹا تھا۔
ارسلان بھی پوری طرح مسلح تھا' بس مجھے ایک خطرہ تھا کہ اگر پولیس کی موبائل وین نے روک لیا تو فضول کی پریشانی کھڑی ہو جائے گی۔ میں نے ارسلان سے کہا کہ گاڑی کو شریف آدمیوں کی طرح چلانا' جیٹ فائٹر کی اسپیڈ مت دکھانا۔''
''آپ فکر مت کریں بھیا!'' اس نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ اس وقت پولیس پارٹیاں گشت پر ہوتی ہیں' عوام کی جان و مال کی حفاظت کے لیے نہیں بلکہ شریف شہریوں کو پریشان کر کے انہیں لوٹنے کے لیے......''
ارسلان بہت احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ گاڑی رکی تو اس وقت میری گھڑی بارہ بج کر ستائیس منٹ بتا رہی تھی۔
''بھیا! یہاں تو دور دور تک کوئی گاڑی یا آدمی نہیں ہے۔'' ارسلان نے کہا۔
اچانک ارسلان کے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اس نے سیل فون نکال کر کہا۔ ''ہیلو...... ہاں' میں اس جگہ پہنچ گیا ہوں' تیمور...... نہیں' وہ تو میرے ساتھ نہیں ہے' شاید آنے والا ہو۔''
اسی وقت کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی نظر آئی۔
ارسلان نے کہا۔ ''ابھی ابھی ایک گاڑی آئی ہے' شاید تیمور آ گیا ہے۔ او کے باس۔'' اس نے کہا پھر مجھ سے بولا۔ ''وہ کہہ رہا ہے کہ تم تیمور کو بھی اپنی گاڑی میں بلا لو۔ میں تمہیں گھر کا پتا سمجھاتا ہوں۔'' اس نے تیمور کا نمبر ملایا اور بولا۔ ''تیمور' تم کہاں ہو؟ اچھا...... بابر خان نے کہا ہے کہ تم اپنی گاڑی یہیں چھوڑو اور میری گاڑی میں آ جاؤ۔'' اس نے سیل فون آف کر کے جیب میں ڈال لیا۔
چند منٹ بعد تیمور نے ارسلان کو آہستہ سے آواز دی اور پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔
میں بہت پھرتی سے عقبی نشست پر چلا گیا اور سیٹ سیدھی کر کے دروازے کا لاک کھول دیا۔
تیمور گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے خطرے کی بو محسوس ہو رہی ہے ارسلان!'' پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ''بھیا...... آپ بیک سیٹ پر لیٹ جائیں۔ میرے آدمی بھی نزدیک ہی موجود ہیں اور سیکنڈوں میں یہاں پہنچ جائیں گے اس لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بابر خان کو ٹیلی فون کر کے بتا دیتا ہوں کہ میں ارسلان کی گاڑی میں بیٹھ گیا ہوں۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''بابر خان' مجھ سے ڈائریکٹ بات کیوں نہیں کر رہا ہے؟''
''یہ بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔''
اچانک ایک گاڑی ہماری گاڑی کے ساتھ آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس میں چار آدمی باہر نکلے۔ اندھیرے کی وجہ سے مجھے صرف ان کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔
''تم دونوں گاڑی سے باہر آ جاؤ اور ہماری گاڑی میں بیٹھو۔'' ان میں سے ایک کرخت لہجے میں بولا۔
''کون ہو تم لوگ؟'' ارسلان نے درشت لہجے میں پوچھا۔
''ہمیں بابر خان صاحب نے بھیجا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

"اچھا' اچھا' باس نے بھیجا ہے۔" تیمور نے کہا۔ "لیکن ہم اپنی گاڑی کا کیا کریں؟"

"اسے یہیں چھوڑ دو' بعد میں گاڑی تمہیں یہیں سے لے جائے گی۔"

"گاڑی نہیں ہے بلکہ گاڑیاں ہیں۔" تیمور نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"جلدی کرو' ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

"ذرا بابر صاحب سے مجھے بات کرنے دو۔" تیمور نے کہا۔

"ان سے کیا بات کرنا ہے؟" وہ آدمی درشت لہجے میں بولا۔

"ان سے یہ معلوم کرنا ہے کہ تمہیں واقعی باس نے بھیجا ہے یا تم مشہدی یا کسی اور کے آدمی ہو؟" تیمور نے بھی سرد لہجے میں کہا۔ "ہمارے دشمن تو بہت سے ہیں' کوئی بھی آ سکتا ہے۔"

"تمہیں میری بات پر اعتبار نہیں ہے؟"

"نہیں......" تیمور نے صاف گوئی سے کہا۔ "میں تمہیں جانتا نہیں ہوں پھر تمہاری بات پر اعتبار کیسے کر سکتا ہوں؟ میں پہلے باس سے بات کروں گا۔"

"باس کا سیل فون اس وقت آف ہوگا۔" اس نے کہا۔

"تو پھر جب آن ہوگا تو میں اس سے بات کروں گا۔" تیمور نے درشت لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے؟" اس کا لہجہ مزید کرخت ہوگیا۔

"نہیں......" تیمور نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ادھر دیکھو' میری طرف۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "یہ تمہیں نظر آ رہا ہے کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے؟" اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "میرے خیال میں ابھی تمہاری نظر اتنی کمزور نہیں ہوئی ہے کہ......"

"مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے۔" تیمور نے کہا۔ "تمہارے ہاتھ میں ایک کھلونا نما ریوالور ہے' تمہیں شاید علم نہیں ہے کہ میں ان کھلونوں سے برسوں سے کھیل رہا ہوں اس لیے مجھے مت بتاؤ کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

بولنے والا ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کھڑا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی پسنجر سیٹ کی طرف تھا۔ اس نے اچانک ریوالور نکالا اور تیمور کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

"کیا کر رہے ہو جانو......؟" پہلا آدمی درشت لہجے میں بولا پھر تیمور سے مخاطب ہوا۔ "جانو صرف اور صرف اسلحے کی زبان سمجھتا ہے۔ اگر میں ابھی اسے اشارہ کر دوں تو وہ گولی تمہاری کھوپڑی میں اتار دے گا۔"

"تو پھر کر دو اشارہ......" تیمور نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں روز روز کی اس مارا ماری سے تنگ آ گیا ہوں۔"

"مجھے باس سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ ہمیں گن پوائنٹ پر اپنے پاس بلائے گا۔" ارسلان نے کہا۔ "اسے ایسی آخر کیا مجبوری ہے؟"

"ارے یہ تو تیمور صاحب کی وجہ سے میرا موڈ خراب ہوگیا۔ آپ لوگ ہمارے دشمن نہیں ہیں۔" پھر وہ درشت لہجے میں بولا۔ "جانو' اپنا ریوالور جیب میں رکھ لو......"

"ویسے تم لوگ ہو کون؟" تیمور نے پوچھا۔ "میں نے کبھی تمہیں باس کے ساتھ یا اپنے کسی دوسرے سینئر کے ساتھ نہیں دیکھا۔"

"بھئی' اتفاق ہے۔" وہ جبراً مسکرایا۔ "اب جلدی کریں' باس انتظار کر رہے ہوں گے۔"

اب چونکہ بات خیر سگالی کی فضا میں ہو رہی تھی اس لیے اس نے اپنا ریوالور بھی جیب میں رکھ لیا تھا اور اس کے بقیہ آدمی بھی کچھ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

تیمور دروازہ کھول کر نیچے اترا تو دوسری طرف سے ارسلان بھی اترا۔ تیمور نے پلک جھپکتے میں اپنا ریوالور نکال کر اس شخص کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ ارسلان نے بھی اپنی طرف والے آدمی کے ساتھ یہ ہی کیا۔

"اپنے ساتھیوں سے کہو کہ اپنے ہاتھ اٹھا لیں......" تیمور درشت لہجے میں بولا۔ "جلدی کرو ورنہ میں واقعی تمہیں ڈھیر کر دوں گا۔"

"یہ...... یہ...... تم کیا کر رہے ہو؟" وہ بوکھلا کر بولا۔

"جلدی کرو ورنہ یہاں تم سب کی لاشیں پڑی ہوں گی اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔ میرا ریوالور بے آواز چلتا ہے۔"

"اپنے ہاتھ اٹھا لو......" اس شخص نے شکستہ لہجے میں اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

ان تینوں نے مشینی انداز میں ہاتھ اٹھا لیے۔

اس وقت تیمور نے کہا۔ "نعیم' آ جاؤ۔"

تب مجھے احساس ہوا کہ تیمور نے اپنا سیل فون آن کر رکھا ہے اور اس کے ساتھی تمام باتیں سن رہے ہیں۔

وہ سب آدھے منٹ سے بھی کم عرصے میں یہاں پہنچ گئے۔ وہ لوگ ایک ڈبل کیبن پک اپ میں سوار تھے جس کے ہیڈ لیمپس آن تھے۔

"نعیم......!" تیمور نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "پہلے ان سب کی اچھی طرح تلاشی لو۔"

نعیم نے بہت ماہرانہ انداز میں اور نہایت عجلت میں ان سب کی تلاشی لی اور ان کی جیبوں سے سب کچھ نکال لیا۔

"ان لوگوں کو وہیں لے جاؤ۔" تیمور نے نعیم سے کہا۔ "صرف اس سورما کو چھوڑ دو۔" اس نے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو اب تک تیمور سے گفتگو کرتا رہا تھا۔

نعیم نے بقیہ تینوں آدمیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا اور ڈبل کیبن پک اپ میں بٹھا دیا پھر تیمور کے اشارے پر وہ انہیں لے کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔

ارسلان نے ان سب کا اسلحہ اپنی گاڑی کی ڈگی میں ڈال لیا۔

"تت...... تم...... اچھا...... نہیں کر رہے ہو؟" وہاں رہ جانے والا شخص بوکھلا کر بولا۔

"میں تمہیں بابر خان ہی کے پاس لے کر جاؤں گا۔" تیمور نے کہا پھر وہ ارسلان سے مخاطب ہوا۔ "اس کی گاڑی کسی ایسی جگہ پارک کر دو کہ فوری طور پہ کسی کو شبہ نہ ہو۔"

"گاڑی کو یہیں سڑک کنارے چھوڑ دیتے ہیں۔" ارسلان نے کہا۔ "کسی کو شبہ ہوتا ہے تو ہو' ہمارا کیا نقصان ہے؟"

ارسلان نے ان لوگوں کی گاڑی کچے میں اتار کر ایک طرف کھڑی کر دی۔ اس دوران میں تیمور اس شخص کو اپنی گاڑی میں بٹھا چکا تھا جو تھوڑی دیر پہلے شیر کی طرح دہاڑ رہا تھا اور اب کسی بھیگی ہوئی بلی کی طرح اس کے حکم کی

تعمیل کر رہا تھا۔

''بھیا......! آپ بھی میری گاڑی میں آ جائیں۔'' تیمور نے بلند آواز میں کہا۔ ''ورنہ یہ الو کا پٹھا کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کرے گا۔''

''بھیا......!'' وہ شخص تھوک نگل کر بولا۔ ''کیا تم دونوں کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟''

''خاموشی سے بیٹھا رہ......'' تیمور نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ ''تو نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں؟''

''مم...... میرا نام شیر علی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''واہ......'' تیمور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''والدین نے تیرا نام تو بہت چھانٹ کر رکھا ہے لیکن تو شیر کیا' گیدڑ بھی نہیں ہے۔''

میں گاڑی سے اترا اور تیمور کی گاڑی کی بیک سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اچانک ارسلان کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھا پھر بولا۔ ''جی باس'...... باس' بس ہم پہنچ رہے ہیں لیکن آپ نے یہ کن جنگلی لوگوں کو بھیج دیا تھا؟ انہیں تو بات کرنے کی تمیز بھی نہیں ہے اور یہ لوگ ہیں کون؟ جی ہاں...... موجود ہے...... باس' وہ اس وقت تیمور کی گاڑی میں ہے۔ آپ تیمور کے سیل فون پر بات کریں یا پھر براہ راست شیر علی ہی سے بات کر لیں۔''

ارسلان کی بات چیت تیمور نے بھی سنی تھی۔ اس نے ریوالور پھر شیر علی کی کنپٹی پر رکھ دیا اور بولا۔ ''اگر بابر خان کا ٹیلی فون آئے تو اس سے یہ کہنا کہ ہم تیمور اور ارسلان کو لے کر آ رہے ہیں۔ کوئی فالتو بات کرنے کی کوشش کی یا کوئی ہوشیاری دکھائی تو میں گولی مارنے میں بالکل دیر نہیں کروں گا۔''

خلافِ معمول تیمور کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے چونک کر سیل فون کے اسکرین پر دیکھا پھر بولا۔ ''بابر خان کا ٹیلی فون ہے۔'' اس نے سیل فون آن کر کے کان سے لگا لیا اور بولا۔ ''لیس باس......''

''تم لوگ ابھی تک آئے کیوں نہیں؟'' اسپیکر فون سے بابر خان کی آواز ابھری۔ تیمور نے بات کرنے سے پہلے سیل فون کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔

''ہم ابھی پہنچ رہے ہیں باس......'' تیمور نے کہا۔ ''یہ دیر آپ کے آدمیوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ شیر علی تو کچھ زیادہ ہی سخت گیر آدمی ہے باس۔''

بابر خان ہنسنے لگا اور بولا۔ ''وہ ایسا ہی خر دماغ ہے تیمور! وہ ہے کہاں؟''

''کہاں ہوگا باس' وہ میرے ساتھ ہی بیٹھا ہے۔ کیا بات کراؤں؟'' پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''شیر علی' باس سے بات کرو۔'' اس نے سیل فون شیر علی کے نزدیک کر دیا اور ریوالور کی نال اس کی کنپٹی میں مزید سختی سے اڑا دی۔ شیر علی کو خوف زدہ کرنے کے لیے تیمور نے ریوالور کا سیفٹی کیچ بھی ہٹا دیا تھا۔

''شیر علی......!'' سیل فون سے بابر خان کی آواز ابھری۔ ''میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ تیمور اور ارسلان میرے بہت قریبی ساتھی ہیں اور ہماری تنظیم میں بہت سینئر ہیں لیکن تم اپنی عادت سے باز نہیں آئے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو تیمور اور ارسلان تمہاری خوب خبر لیتے۔''

''سوری باس......'' وہ جلدی سے بولا۔ ''غلطی ہو گئی۔''

''تم اس وقت ہو کہاں؟''

یہ پرتجسس اور سنسنی خیز داستان ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں



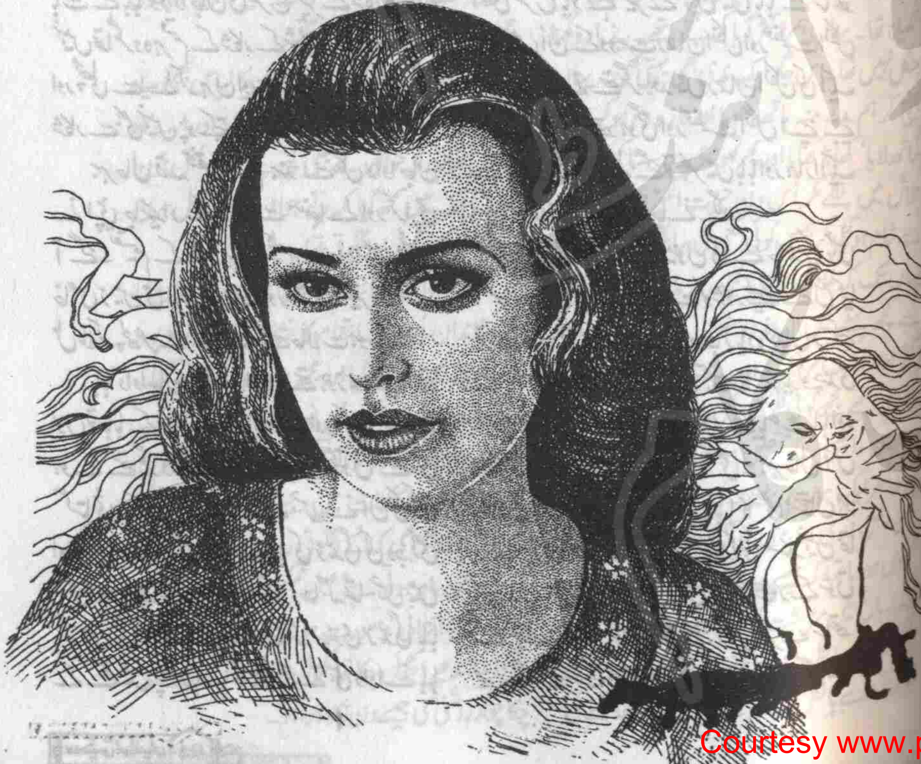
سُنبل



بھیروی کا انتقام

وہ وقت ہی ایسا تھا اور اس پر اس کا قیامت خیز حُسن اگر اس وقت وہ جان بھی مانگتی تو میں دے دیتا، یہ تو پھر ایک تعویذ اتارنے کی بات تھی اور تعویذ بھی ایسا......

ایک جن زادی کے انتقام کا لرزا دینے والا عبرت اثر قصہء حیرت



ہمارا تعلق کلکتہ سے ہے۔ ہماری وہاں زمینداری تھی، بڑے بڑے آم کے باغات تھے ایک بڑی سی حویلی تھی، پیسے کی ریل پیل تھی۔ میرے والد صاحب کو شکار کا بہت شوق تھا اور یہ شوق انہیں دادا سے ورثے میں ملا تھا۔ میرے دادا بھی بہت اچھے شکاری تھے۔ اکثر دادا جان کلکتہ کے گردونواح میں شکار کھیلا کرتے تھے۔ وہ بڑے نڈر اور بہادر انسان تھے۔ سنا ہے ان کے ڈرائنگ روم کی دیواروں اور داخلی دروازے کے سامنے شیر کی کھال بچھی ہوتی تھی۔ دیواروں پر شیر کے سر لگے ہوئے تھے۔ وہ شیر کے شکار کے شوقین تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے حویلی میں ہرن کی کھال میں بھس بھروا کر رکھی ہوئی تھی۔ بہرحال یہ برملا تذکرہ نکل آیا تو میں نے بتا دیا۔ دادا جان سے یہ شوق بابا میں منتقل ہوا۔ یہ قیامِ پاکستان سے قبل کی بات ہے، بابا کو دادا جان کی طرح شیر کے شکار کا شوق نہیں تھا مگر وہ ہر قسم کے شکار کے شوقین تھے، وہ تیتر، بٹیر اور مچھلی سے لے کر ہرن اور بوقتِ ضرورت شیر کے شکار سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

بہرحال قصہ مختصر، تقسیمِ ہند سے قبل دادا جان نے اپنی جائیداد کے کاغذات سنبھالے اور کراچی آگئے۔ تقسیم کے بعد یہاں کلیم (claim) میں انہیں خاصی زمین ملی اور زیورات اور نقد رقم وغیرہ یہ سب مل ملا کر کچھ عرصے میں پہلے جیسے حالات ہوگئے۔

بابا، دادا جان کی واحد اولاد تھے جو زندہ بچے تھے، یوں تو بابا کے علاوہ دادا جان کے اور بھی آٹھ بچے ہوئے تھے مگر دادا جان کسی غیر مرئی مخلوق سے کسی گستاخی کے مرتکب ہوئے تھے جس نے اُن کی کسی اولاد کو زندہ نہیں رہنے دیا۔ بابا کی زندگی کی وجہ بھی کسی ہندو پنڈت کا دیا ہوا کالا دھاگہ تھا جس میں گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ دھاگہ ساری زندگی بابا کے گلے میں پڑا رہا۔ پاکستان آتے ہی دادا نے بابا کی شادی کر دی تھی۔ بابا کے ساتھ بھی وہی مسئلہ رہا جو دادا کے ساتھ تھا۔ ان کی بھی کوئی اولاد زندہ نہیں رہی سوائے میرے حالانکہ میرے چار بھائی اور دو بہنیں ہوئی تھیں مگر وہ سب کے سب تھوڑے تھوڑے دنوں میں ہی دنیا سے چل بسے۔ جب میں پیدا ہوا تو بابا نے میرے لیے ایک بزرگ سے تعویذ لیا، وہ آج تک میرے گلے میں موجود ہے۔

بابا کی شادی کے کچھ ہی عرصے بعد دادا جان اور پھر دادی جان کا انتقال ہوگیا اور جب میں سات سال کا تھا تو امی جان کا بھی انتقال ہوگیا۔ یوں میرا ایک طویل وقت صرف بابا کی سنگت میں گزرا اس لیے میری شخصیت پر بابا کا بڑا گہرا اثر ہے۔ شکار کا شوق بابا سے مجھ میں بھی منتقل ہوا۔ ابھی میں چھوٹا ہی تھا کہ بابا کے ساتھ اکثر شکار پر جانے لگا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میرے بچپن میں بابا کے ساتھ شکار میں اُن کے دوست رحمان انکل اور عظمت انکل بھی ہوا کرتے تھے مگر بعد میں رحمان انکل کی ایک حادثے میں ڈیتھ ہوگئی اور عظمت انکل اپنے بیٹے کے پاس انگلینڈ چلے گئے تو پھر میں، بابا اور ہمارا ایک گھریلو ملازم شنکر شکار پر جانے لگے۔

بابا نے ہمیشہ ہجری مہینوں کی نئے چاند کی پہلی جمعرات یعنی نوچندی جمعرات کو شکار کھیلنے سے منع کیا تھا۔ وہ خود بھی اس بات کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اس کی وجہ میں کبھی نہیں سمجھ سکا، شاید نوچندی جمعرات کو ہی وہ حادثہ ہوا تھا جس کے باعث بابا اور دادا جان کی اولاد مر جایا کرتی تھی۔ بہرحال اُس وقت میری عمر 24 سال تھی جب بابا کا بھی انتقال ہو گیا۔ میرے ساتھ روپے پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لیے میں اب بھی کبھی کبھی اپنے شکار کے شوق سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ اکثر میرے ساتھ میرے دو دوست وقار اور سلیم ہوتے تھے اور کبھی میں اکیلا بھی نکل جاتا تھا۔ خطرناک جانوروں کے شکار کا نہ مجھے شوق تھا اور نہ ہی کوئی خواہش۔ میں کبھی مچھلی، کبھی تیتر، بٹیر اور کبھی کبھار ہرن کے شکار سے مستفید ہوتا رہتا تھا۔ ہرن میرا مرغوب جانور رہا ہے۔ ہرن کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے۔ جس کسی نے بھی زندگی میں ایک بار اس کا گوشت چکھا ہے، وہ یقیناً میری بات کی تائید کرے گا۔

اُن دنوں میں فارغ تھا۔ میرا دل شکار کے لیے بری طرح مچلا جا رہا تھا۔ میں نے وقار اور سلیم کے ساتھ مل کر شکار کا پروگرام بنایا۔ ہمارا ارادہ فجر کی نماز کے بعد نکلنے کا تھا۔ ہم لوگوں نے رات میں ہی تمام تیاری کر لی تھی، تمام ضروری سامان جیپ میں رکھا جا چکا تھا پھر صبح سویرے ہی ہم شکار پر روانہ ہوگئے اور وقت سے پہلے اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں ہمیں شکار کھیلنا تھا۔ یہاں ہم اکثر آیا کرتے تھے۔ یہ زیادہ گھنا جنگل نہیں تھا۔ اس جگہ ایک ندی بھی بہتی تھی۔ یہاں پہنچ کر ہم نے منہ ہاتھ دھویا اور تازہ دم ہو کر اپنے ساتھ لایا، کھانا کھایا اور پھر تھوڑی دیر سستا کر شکار کی تلاش میں نکلے مگر اُس دن حیرت انگیز طور پر دوپہر سے شام ہوگئی مگر ہمیں کوئی معمولی سا بھی شکار نہیں ملا یہاں تک کہ ہم کوئی چڑیا تک نہ مار سکے۔ مغرب سے کچھ پہلے میں اپنے دوستوں سے بچھڑ گیا۔ ایسا اکثر ہوتا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے تھے اس لیے مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔

میں واپسی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک ہرن پر پڑی۔ وہ ہرن اپنی دُھن میں مگن چہل قدمی اور کبھی چوکڑی بھر رہا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ جنگل میں نہیں، کسی بہت بڑے باغ میں مٹرگشت کر رہا ہو۔ میں اُس کا نشانہ لینے کے لیے بالکل اُس کے قریب آ گیا۔ لگتا تھا، وہ میری آمد سے بالکل بے خبر ہے۔ اُس نے بھاگنے کی قطعی کوشش نہیں کی تھی۔ حیرت انگیز طور پر ہرن کا رنگ سیاہ تھا۔ میں نے اچھی طرح جائزہ لے کر گن سیدھی کر کے اُس کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا، گولی ہرن کے پیر میں لگی اور وہ چوکڑیاں بھرتا میری نظروں کے سامنے سے غائب ہوگیا۔ میں نے تھوڑی دیر اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کی پھر سوچا کہ چلو، ندی پر چل کر تازہ دم ہوا جائے پھر دیکھیں گے کہ ہرن کہاں گیا ہے؟ میں ابھی درختوں کی اوٹ میں تھا، تب میں نے شام کی ملگجی روشنی میں ندی پر ایک نوجوان کو دیکھا جو کہ سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا اور اُس کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا اور وہ اپنا پیر چشمے کے پانی میں دھو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے فوراً حساب کتاب لگایا تو وہ ہجری مہینے کی پہلی جمعرات تھی یعنی نوچندی جمعرات......اور میں سُن ہوگیا۔

ہرن کا رنگ سیاہ تھا اور نوجوان کا لباس بھی سیاہ تھا۔ ہرن کے بھی پیر میں گولی لگی تھی اور اب وہ غائب تھا اور نوجوان کے بھی پیر سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ نوجوان ہی دراصل ہرن کے بھیس میں کوئی اور مخلوق تھا۔

اُن لوگوں کے انتقام کا مجھے اندازہ تھا کیونکہ میرا پورا خاندان اُن کے انتقام کا نشانہ بنا تھا۔ میرا پورا وجود پسینے میں بھیگ گیا اور مجھ پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اُسی وقت بالکل اچانک اُس نوجوان کے سامنے ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ وہ لڑکی کتنی حسین تھی، اسے لفظوں میں بیان کرنا ناممکنات میں سے ہے مگر میرے علم میں یہ بات بھی تھی کہ ایسی مخلوق روپ بدلنے یا بھیس بدلنے میں ماہر ہوتی ہے، عین ممکن تھا، وہ لڑکی اصل روپ میں انتہائی بدصورت ہو۔ بہرحال جنگل میں ملگجا سا اندھیرا پھیل چکا تھا مگر اُن دونوں کے اطراف چکاچوند روشنی تھی جیسے دن نکلا ہوا ہو۔

وہ لڑکی شدید غصے میں تھی' اس نے ظاہر ہوتے ہی غصے سے کہا۔ ''طاموس......''

نوجوان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ہولے سے ہنس دیا۔ اس کے بعد وہ لڑکی کسی نامعلوم زبان میں شروع ہوگئی۔ زبان میری سمجھ میں نہیں آسکی مگر ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ لڑکی غصے میں ہے اور نوجوان اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا ہے پھر اچانک وہ بیٹھی اور اس نے زخم پر انگلی رکھ دی اور جب انگلی ہٹائی تو اس پر بلٹ (bullet) تھی پھر اس نے دوبارہ اُس لڑکے کے زخم پر ہاتھ پھیرا تو وہاں کوئی نشان تک موجود نہیں رہا۔ اس کے بعد اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے فضا میں کچھ سونگھا اور پھر ڈائریکٹ اُسی درخت کی جانب دیکھا جس کی اوٹ میں' میں تھا۔ میں جلدی سے پیچھے ہوگیا۔ وہ ایک دم کھڑی ہوئی اور میری طرف آنے لگی بالکل غیر ارادی طور پر میرے منہ سے آیت الکرسی کا وِرد شروع ہوگیا۔ اسے مجھ تک پہنچنے میں ایک منٹ لگا اور اُس وقت تک میں آیت الکرسی کا دَم سینے پر کر کے اپنے گرد اُس کا حصار کر چکا تھا۔ میرے قریب آ کر وہ حیرت سے پہلے درخت کے اطراف گھوم پھر کر دیکھتی رہی پھر اس نے جنگل میں اُس جگہ سے ہٹ کر چاروں سمتوں میں گھوم گھوم کر دیکھنا شروع کیا۔ اُس وقت اُس کے چہرے پر شدید حیرت سی تھی' ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں اُسے دکھائی نہیں دے رہا ہوں۔ وہ بار بار رک کر فضا میں کچھ سونگھتی اور پھر مڑ کر اُسی درخت کی جانب دیکھتی جہاں میں موجود تھا اور پھر اُس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگتی۔ بہت دیر تک مجھے ڈھونڈنے کے بعد آخر کار اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سامنے لہرایا اور وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی مگر میں نے وہ پوری رات وہیں دبکے ہوئے گزار دی۔ رات میں ایک چوڑے پھن والا سیاہ ناگ بھی میرے سینے پر چڑھ کر کافی دیر بغور میرا جائزہ لیتا رہا مگر میں دم سادھے پڑا رہا اور وہ ناگ بڑے سکون سے میرے اوپر چہل قدمی کر کے چلا گیا۔ غالباً یہ آیت الکرسی کا اعجاز تھا کہ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچائے بغیر گزر گیا۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں اپنی جگہ سے اٹھا اور گھسٹ گھسٹ کر ندی تک آیا۔ وہاں ہاتھ منہ دھو کر ندی کنارے ہی لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر میں وقار اور سلیم مجھے ڈھونڈتے ہوئے آگئے۔ میرا بدن بری طرح تپ رہا تھا اور مجھ پر لرزہ طاری تھا۔ وقار اور سلیم مجھے جیپ تک لائے پھر انہوں نے گھر لا کر ڈاکٹر کو فون کیا مگر میرا بخار پورے ہفتے میری جان سے چمٹا رہا۔ سلیم اور وقار میری تیمارداری میں لگے رہے حالانکہ دونوں گھربار والے تھے جبکہ میں ہی بیچلر تھا۔

یہ اُس واقعے کے پندرہ دن بعد کا ذکر ہے' میں اپنی زمینوں کے حساب کتاب اور دوسری دیکھ بھال وغیرہ کے لیے گیا ہوا تھا۔ میرا پورا دن مصروف گزرا۔ زمینوں کے ساتھ ہی ہماری حویلی تھی جس کی دیکھ بھال کے لیے میں نے ملازمین رکھے ہوئے تھے۔ رات کو میں مکمل اندھیرا کر کے سونے کا عادی تھا' نائٹ بلب تک نہیں جلاتا تھا۔ اُس رات کسی وقت بڑی تیز روشنی سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اٹھ کر دروازے کی جانب دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ دروازے میں جنگل والی وہی لڑکی کسی شہزادی کی سی آن بان کے ساتھ موجود تھی۔ میں ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گیا مگر اس کے چہرے پر غصہ نہیں' ایک محویت سی تھی۔ وہ اُس وقت اسکائی بلیو نیچے گھاگرے اور اونچی چولی میں ملبوس تھی اور ساتھ ہی بڑا سا دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔ میں نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''کک......کو......کون ہو تم؟'' مجھے اپنی آواز کی لرزش خود محسوس ہو رہی تھی۔

''میں میرت ہوں۔'' بڑی شُستہ اُردو میں جواب آیا حالانکہ اُس سے پہلے میں نے اُسے کسی عجیب سی زبان میں بولتے سنا تھا۔

''یہاں کیوں اور کیسے آئی ہو؟'' میں نے ایک ساتھ دو سوال کیے۔

''ہم اپنا انتقام کبھی نہیں چھوڑتے' یہ تم سے ملنے سے پہلے میرا خیال تھا۔ یہ تمہارے کیوں کا جواب ہے اور رہی بات کیسے کی تو ہمارے لیے کہیں بھی آنا جانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' اس کا جواب سن کر میں نے تھوک نگلا۔

''اب مجھ سے کیا چاہتی ہو اور کیسے کا سوال میرے لیے اب بھی تشنہ ہے؟'' میں بڑی حد تک اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا۔

''تم سے' تمہیں چاہتی ہوں اور رہ گئی بات کیسے کی وہ دن میرے بھائی طاموس کی شادی کا تھا جب وہ تمہارے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔ وہ اپنے کسی خاص دوست سے ملنے نکلا تھا جس کا تعلق انسانوں سے تھا۔ ساری تیاریاں مکمل تھیں' صرف طاموس کا انتظار تھا مگر وہ آ ہی نہیں رہا تھا' تب میں اُس کی تلاش میں نکلی اور وہ مجھے زخمی حالت میں مل گیا۔ میرے مقابلے میں طاموس کو غصہ بہت کم آتا ہے مگر میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُسے زخمی کرنے والے کا خون پی جاؤں......اسے بھسم کر ڈالوں مگر وہ میرا غصہ ختم کرنے کی کوشش کرتا رہا' تب ہی فضا میں مجھے کسی انسانی وجود کی بو محسوس ہوئی اور میں نے بو والی سمت دیکھا تو پیڑ کے پیچھے تم نظر آئے مگر جب میں اُس درخت کے پاس پہنچی تو تم غائب تھے۔ میں نے کافی دیر تمہیں ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر تم نظر نہیں آئے۔ میں تمہیں ڈھونڈ سکتی تھی مگر میرے پاس وقت نہیں تھا۔ وہاں شادی میں سب طاموس کا اور میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں تمہاری خوشبو محسوس کر چکی تھی لہٰذا میں نے تمہیں بعد میں ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے حیرت سی رہی کہ تم نظر آتے آتے اچانک کہاں غائب ہوگئے تھے؟ تب میں نے یہ بات اپنے بابا جان کو بتائی' انہوں نے ایک بڑے سے پیالے کو کسی محلول سے بھرا اور اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا تو اس میں اس شام کا تمام منظر واضح ہوگیا اور اس میں تم کچھ پڑھ کر اپنے اوپر پھونکتے نظر آئے۔ تب بابا جان نے بتایا کہ تم انسانوں کی قوم مسلمانوں سے ہو اور تم نے اپنے کلام کا خود پر دَم کیا تھا اور اسی وجہ سے تم مجھے نظر نہیں آئے تھے اور تب سے ہی میں تمہیں تمہاری خوشبو کے ذریعے ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی۔ تم مجھے فوراً ہی مل گئے مگر تمہاری حالت ایسی تھی کہ اگر اُس وقت میں خود کو ظاہر کر دیتی تو تمہارا بچنا محال تھا لہٰذا اب میں تمہارے سامنے ہوں۔'' اس نے ساری کہانی میرے گوش گزار دی۔

''پھر اب کیا مسئلہ ہے؟'' میرا ڈر کافی حد تک ختم ہو چکا تھا۔ ''اور میں تو انسانوں کی قوم سے ہوں۔ تم کس قوم سے ہو؟'' میں نے دوبارہ کہا۔

''میں جن زادی ہوں اور ہم مسلمان نہیں ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ جب سے تمہیں دیکھا ہے' سب کچھ بھلائے بیٹھی ہوں یہاں تک کہ اپنے منگیتر کو بھی......اور تمہیں اپنانے کی خواہاں ہوں۔'' اس نے بڑے آرام سے کہا۔

''مگر ایک انسان اور جنی کا کیا میل؟ انسان کا خمیر مٹی سے اٹھا ہے اور جن آگ سے بنے ہیں' آگ اور مٹی کا کیا ملاپ اور پھر تمہارا منگیتر اور تمہاری قوم تمہاری اتنی بڑی غلطی کو معاف کر دے گی' تمہارا تو جو حشر ہوگا' سو ہوگا' مجھے تو وہ زندہ بھی نہیں چھوڑیں گے۔'' میں نے کہا تو وہ ہنس دی۔

''وہ میرا مسئلہ ہے' تمہیں ڈرنے کی کوئی

ضرورت نہیں، میں تمہارے ساتھ رہنے کے لیے کچھ وقت لے لوں گی اور ہمیں اس کی اجازت مل جاتی ہے، تم اپنی کہو۔'' اس نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔

''اور اگر میں انکار کردوں تو؟'' میں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی، کسی کا بھی ایمان ڈگمگا سکتی تھی اور میں کوئی ایسا عابد و زاہد بھی نہیں تھا مگر پتہ نہیں کیوں مجھے اس سے محبت محسوس نہیں ہو رہی تھی، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے پہلی ہی بار میں اس کے کمالات دیکھ لیے تھے اور دوسری ملاقات میں اس نے اپنے جن زادی ہونے کا اعتراف کرلیا تھا۔

''تو......تو ابھی صرف تم نے میرا اُما کا روپ دیکھا ہے، جب بھیروی کا روپ دیکھو گے تو کبھی ایسا نہیں کرو گے۔'' اس کی آواز اور لہجے میں کسی جنگلی جانور کی سی غراہٹ در آئی اور آنکھوں میں پتلیوں کی جگہ آگ جلنے لگی، ماتھے کے درمیان سے سینگ بلند ہونے لگا، ہونٹوں سے دو دانت جھانکنے لگے، رنگت سیاہی مائل ہونے لگی اور اس پر کسی جنگلی جانور کی طرح بال نکل آئے اور میں ایک دم سہم گیا۔

''اور ہاں، آج مجھے دیر ہوگئی ہے، میں جا رہی ہوں، کل تیار رہنا، میں تمہیں لینے آؤں گی، میں تمہیں اپنے قبیلے والوں سے ملواؤں گی۔ اب میں چلتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے سامنے ہاتھ لہرائے اور نظروں سے اوجھل ہوگئی اور میں دیکھتا رہ گیا۔

دوسرے دن وہ پھر رات میں موجود تھی۔ آج وہ سیاہ کُرتے اور چُوڑی دار پاجامے اور بڑے سے دوپٹے میں ملبوس تھی جس پر کسی چمک دار ٹرانسپیرنٹ پتھر کے زیورات پہنے ہوئے تھے۔ وہ لباس اور زیورات اس کی دودھیا رنگت کو کل سے بھی زیادہ دو آتشہ کر رہے تھے۔ زیورات میرے حساب سے ڈائمنڈ کے تھے مگر پوچھنے کی گستاخی کون کرتا؟ کیا پتہ وہ کب اُما کے روپ سے بھیروی کے روپ پر اتر آتی۔

بہر حال وہ اُسی دن مجھے سب سے ملانے لے گئی۔ بقول اس کے، اس سے پہلے وہ لوگ کہیں اور رہا کرتے تھے، اب ٹھکانہ بدل دیا ہے۔ وہ بدلا ہوا ٹھکانہ اس نے بھی بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور مجھے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

وہ جس جگہ مجھے لے کر پہنچی تھی، وہ کسی پہاڑ کی چوٹی تھی اور اس جگہ پہنچنے میں ہمیں پلک جھپکنے کی دیر لگی۔ بس میں کمرے سے نکل کر اس کے ساتھ لان میں آیا تھا اور دوسرے ہی لمحے ہم اس پہاڑ کی چوٹی پر تھے جہاں وہ رہائش پذیر تھے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر دن نکلا ہوا تھا اور وہاں بہت زیادہ سبزہ تھا۔ وہاں کئی بچے کھیل رہے تھے۔ ایک بچہ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دو ڈھائی من پتھر کو ایسے لڑھکا رہا تھا جیسے وہ ربر کی بال ہو۔ میں وہ بچہ محض سات آٹھ سال کا دِکھتا تھا۔ سامنے ایک محل کھڑا تھا۔ اس محل کے بلند و بالا دروازے سے اندر داخل ہوئے تو ایک بڑا سا لان تھا جس میں قسم قسم کے درخت لگے تھے جو کہ پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ پورے لان میں تراشیدہ گھاس اُگی ہوئی تھی۔ پودے لگے ہوئے تھے۔ پودوں کے ساتھ ساتھ پھولوں کے تخت تھے اور ان پر پھولوں کی ایسی ایسی نایاب اقسام کھلی ہوئی تھیں جو کہ میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ دو تخت تو صرف سیاہ مخملی گلابوں کے تھے۔ درختوں پر عجیب الخلقت اور خوش گلو پرندوں کا ڈیرہ تھا۔ تین حوض بنے ہوئے تھے۔ ایک دودھ کا، دوسرا شہد کا اور تیسرا پانی کا۔ لان سے گزر کر ہم اندر رہائشی حصے میں آ گئے جہاں بڑا سا ہال تھا جس کا فرش آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر بہت خوبصورت اور نفیس جالی کے استر لگے پردے تھے۔ تین اطراف میں بڑی بڑی منقش، مضبوط کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سامنے والی چوتھی سائیڈ پر ایک تخت بچھا تھا جس پر ایک نفیس سا قالین بچھا تھا۔

اس تخت پر ایک پیچھے اور دو سائیڈوں میں بڑے خوبصورت غلاف والے گاؤ تکیے تھے۔ تخت کے اطراف میں پردے لگے ہوئے تھے اور انہیں خوبصورت جھالروں والی ڈوریوں سے باندھا گیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہاں دربار لگایا جاتا ہے۔ یہاں پر دو ملازم مور چھل لیے ہوئے کھڑے تھے۔

اُس کمرے سے نکل کر وہ ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کمرے میں بھی بہت قیمتی، منقش فرنیچر تھا۔ درمیان میں بیڈ پڑا ہوا تھا، اس پر بھی جالی کے نفیس دیدہ زیب پردے پڑے ہوئے تھے۔ بیڈ پر ایک سرخ و سپید، لحیم شحیم اور انتہائی خوبصورت خاتون براجمان تھیں۔ میرت نے اُن کا تعارف اپنی والدہ کی حیثیت سے کروایا۔ وہ مجھ سے مل تو لیں مگر اُن کے چہرے پر ایک ناگواری سی تھی اور پھر اس نے مجھے اپنے منگیتر سمیت سب سے ملوایا۔ سب کے ہی چہروں پر علاوہ طاموس کے، ایک محسوس کی جانے والی ناگواری تھی۔

سب سے ملوا کر وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئی اور تالی بجا کر خادمہ کو بلوایا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں بادشاہوں کے زمانے میں ہوں۔ ملازمہ نے ہمارے سامنے انواع و اقسام کے لوازمات چُن دیئے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں، زندگی میں اُس سے پہلے اور اُس کے بعد کبھی اتنا عمدہ اور مزے دار کھانا نہیں کھایا۔ اُس مشروب سے زیادہ خوش ذائقہ اور ٹھنڈا میٹھا مشروب نہیں چکھا۔ کھانا کھا کر مجھے غنودگی آ گئی اور جب میری آنکھ کھلی تو میں اپنے بیڈ پر تھا۔ اب میرا ڈر بہت حد تک نکل چکا تھا۔

وہ تقریباً روز ہی یا کبھی کبھار ایک آدھ دن چھوڑ کر میرے پاس آنے لگی اور اس طرح دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس تمام عرصے میں اس نے میری ہر خواہش پوری کی۔ جو میرے منہ سے نکلا، اس نے حاضر کیا۔ میں نے جس جگہ جانے کی خواہش کی، وہ مجھے اُس جگہ لے گئی اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ مجھے واقعی اُس سے محبت ہوگئی۔ مجھے اُس کا انتظار رہنے لگا لیکن اچانک اس کے بھیروی والے روپ کا خیال آتا تو میرا دل نفرت اور کراہیت سے بھر جاتا مگر یہ خیال بس چند لمحوں کا ہوتا اور پھر میرے دل میں اس کے لیے محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔ میں اس سے سچی، بے غرض و ریا محبت کرنے لگا تھا۔ اب صرف مجھے اس کا اُما کا روپ یاد تھا۔

ایک دن اس نے بتایا کہ اس کے بابا اور اماں نے اسے کچھ عرصہ میری دنیا میں میرے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی ہے اور وہ اس کی شادی میرے ساتھ کرنے پر تیار ہیں مگر ساتھ ہی اس کی شرط تھی کہ ہماری شادی سادگی سے ہو اور اس میں اس کے اور میرے علاوہ کوئی اور شریک نہ ہو۔

''مگر ہمارے ہاں نکاح میں گواہوں کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے بغیر شادی نہیں ہوتی؟'' میں نے اعتراض کیا۔

''مگر ہم تو......خیر چھوڑو، تم جس انداز میں شادی کرتے ہو، کرلو مگر لوگ زیادہ نہ ہوں، جھمکٹا نہ لگانا۔'' اسے زیادہ لوگوں پر اعتراض ہنوز تھا۔

''نہیں، میرے دو دوست ہیں، اُن کی بیویاں اور بچے۔'' میں نے بتایا۔

''وہی دونوں جو اُس دن جنگل میں تمہارے ساتھ تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، وہی دونوں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر کل میں آجاؤں گی، تم بلوا لینا جس کو بلانا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے چہرے کے سامنے دونوں ہاتھ لہرائے اور نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اُس سے اگلے دن ہمارا نکاح ہوگیا۔ رات کو جب میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا تو وہ سجی

سچائی اپنے ہوشربا حسن کے ساتھ سامنے بیڈ پر براجمان تھی مگر میرے بیڈ پر بیٹھتے ہی وہ پیچھے سرک گئی اور بڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔

''میرت' کیا ہوا' اتنی عجیب طرح سے کیا دیکھ رہی ہو اور یوں دور کیوں ہو رہی ہو؟'' میں نے الجھن آمیز انداز میں پوچھا۔

''شایان' تمہارے نزدیک آنے سے مجھے ہمیشہ کسی چیز نے روکا ہے اور وہ چیز یقیناً تمہارے گلے میں پڑا ہوا یہ تعویذ ہے۔'' اس نے عجیب خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''مگر یہ تعویذ تمہارے لیے نہیں ہے۔'' میں نے اسے تسلی دینا چاہی۔

''ہاں مگر ہے تو قوم اجناء کے لیے اور میں اسی قوم سے تعلق رکھتی ہوں اور یہ تعویذ تمہیں قوم اجناء کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے ہی ہے' یقیناً تمہاری زندگی میں کسی شرارتی جن کی وجہ سے یا اپنی ہی کسی غلطی کی وجہ سے کوئی مسئلہ رہا ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں' کوئی مسئلہ تھا تو مگر مجھے پتہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور یہ حقیقت بھی تھی' میرے لیے تمام باتیں سنی سنائی تھیں۔

''بہر حال اپنے اور میرے درمیان کی دوری کو دور کرنے کے لیے تمہیں یہ تعویذ اتارنا پڑے گا۔'' اس نے میری مزید پیش قدمی پر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

وہ وقت ہی ایسا تھا اور اس پر اس کا قیامت خیز حسن کہ اگر اس وقت وہ جان بھی مانگ لیتی تو میں دے دیتا' یہ تو پھر ایک تعویذ اتارنے کی بات تھی اور تعویذ بھی ایسا کہ جس سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

میں اس وقت یہ بات قطعی طور پر بھول گیا تھا کہ انسان مٹی سے بنا ہے اور جن آگ سے بنے ہیں اور ان کا ملاپ ناممکنات میں سے ہے۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی کہ اس نے میرے لیے اتنی بڑی قربانی دی ہے' اپنی قوم چھوڑ دی اور اس سے بڑھ کر اس کی وفا کا اور کیا ثبوت تھا کہ اس نے مجھ سے شادی کر لی تھی۔

میں نے صرف ایک لمحے کے لیے سوچا اور تعویذ اتار کر کارنس پر رکھ دیا۔ ابھی تعویذ رکھ کر ہاتھ واپس کھینچا ہی تھا کہ ایک دم سے کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ میں نے گھبرا کر ادھر اُدھر ہاتھ پیر مارے' تب اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے کوئی گرم گرم کھولتی ہوئی چیز میرے پورے چہرے اور جسم پر ڈال دی ہو' میرے جسم کے دائیں طرف ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی چیز باہر نکل رہی ہے اور بائیں طرف ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ کوئی کسی تیز دھار آلے سے مجھے گود رہا ہو پھر کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی اور میرے سامنے میرت' بھیروی کے روپ میں کھڑی قہقہے لگا رہی تھی اور میں شدید تکلیف سے دہرا ہو رہا تھا۔

''تم کیا سمجھے تھے' تم نے طاموس کے ساتھ جو کیا تھا' وہ میں بھول جاؤں گی جبکہ ہمارا تو انتقام مشہور ہے اور اب میرا انتقام یہ ہے کہ تم تازندگی بے نام ونسب رہو گے' تمہاری ہم قوم بھی تمہارے نزدیک آنے سے ڈرے گی اور پھر تم تو اُس قوم سے ہو جو کہ قوم اجناء میں بھی ہمارے لیے قابلِ نفرین ہے۔ ہم آگ اور تم مٹی...... ہمارا' تمہارا کیا میل کیسا ملاپ؟ میں چاہتی تو تمہیں بہت پہلے بھسم کر دیتی مگر جب میں تمہارے پاس پہنچی تو تمہارے گلے میں یہ تعویذ موجود تھا اور تب میں نے اپنا بھیروی کا روپ تبدیل کر کے اُما کا روپ اپنا لیا مگر تم خاصے مشکل ثابت ہوئے اور دیر سے رام ہوئے۔ میرے منصوبے میں سوائے طاموس کے' سب شریک تھے' جب تم رام ہو گئے تو میں نے تم سے شادی کا کہا اور تم مان گئے۔ سب میرے منصوبے کے عین مطابق ہوتا رہا اور شادی کے بعد کا بھی تمہارے سامنے ہے اور

یوں میں نے تم سے اپنا انتقام لے لیا۔ اب میں چلتی ہوں ہمیشہ کے لیے۔'' یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ اپنے سامنے لہرائے اور غائب ہو گئی۔

صبح اذانوں کے وقت اٹھ کر میں نے ڈریسنگ کے سامنے خود کو دیکھا' میرا جسم' چہرے سمیت جھلسا ہوا تھا' جسم کے دائیں حصے اور آدھے چہرے پر گھنے بال کسی جانور کی مانند اگ آئے تھے اور آدھے چہرے اور جسم کے بائیں حصے پر تیز دھار آلے سے کاٹنے کے گہرے شگاف پڑے ہوئے تھے۔ میں انتہا سے زیادہ بدصورت ہو چکا تھا یہاں تک کہ میرے ملازمین نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا اور مجھے دھکے مار کر میرے ہی گھر سے بے دخل کر دیا۔ میری جائیداد میرے غائب ہونے پر لوٹ کا مال بن گئی۔ میرے رشتے دار پتہ نہیں کہاں کہاں سے اور کن کن رشتوں سے ابل پڑے تھے۔

میری ظاہری حالت کے پیش نظر ملازمت کا حصول خام خیالی تھا اور میں بھیک مانگنے پر مجبور ہو گیا۔ لوگ ڈر کے مارے میرے قریب نہیں آتے تھے' مجھے بھیک کیا دیتے۔ تب میں نے اس درگاہ کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنا لیا۔ لنگر سے پیٹ بھرتا ہوں۔ پھٹے پرانے کپڑوں پر لوگوں کی اترنوں پر گزارہ کرتا ہوں اور اپنا جسم اور چہرہ ایک بڑی سی چادر سے چھپا کر رکھتا ہوں۔ یوں اس درگاہ پر آ کر کھانے کا بھی آسرا ہو گیا ہے اور یہیں کہیں نہ کہیں پڑ کر راتیں بھی کٹ جاتی ہیں۔''

یہ کہہ کر اس بوڑھے فقیر نے اپنے چہرے سے چادر ہٹا دی اور میں سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی کہ اس نے جو بتایا تھا' وہ قطعی غلط نہیں تھا۔ اس کا چہرہ واقعی اس قدر بھیانک تھا کہ رونگٹے کھڑے کرنے کو کافی تھا اور تب میں اجازت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ہر برائی کے شر سے اس رحمٰن الرحیم کی پناہ مانگتی واپس آ گئی۔

غزل

خدا جانے وہ کہاں ہو گا
بہار ہو گا یا خزاں ہو گا

مجھے پتہ نہ تھا اس بات کا
میرے حالِ دل پہ یوں وہ حیراں ہو گا

سوچتا ہوں جدائی دینے والا
اپنی بات پہ پشیماں ہو گا

یہ سوچ کے آیا ہوں اُس کی گلی
شاید اُس کا کوئی نشاں ہو گا

میں نے کب سوچا تھا فرہاد
وہ مجھ سے اتنا بدگماں ہو گا



محمد راشد فرہاد

آصفہ اقبال بلوچ



میٹھا میٹھا گھر

اب میں یہ بات اچھی طرح جان اور مان گئی تھی کہ کوئی نادیدہ ہستی مجھ پر مہربان ہوگئی ہے، مجھے خود بھی اس ہستی سے ایک اُنسیت ہوگئی تھی لیکن......

ایک فلیٹ کا قصہ جو شام ہوتے ہی خوشبوؤں سے مہک جاتا تھا

میں جب سے اُس نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوئی تھی، عجیب سے واقعات رونما ہورہے تھے۔ ہمارا فلیٹ اپارٹمنٹ کی آخری یعنی چوتھی منزل پر تھا۔ روز شام ہوتے ہی ہمارا فلیٹ نت نئے پھولوں کی خوشبو سے مہک جاتا اور اکثر آدھی رات کو پورے فلیٹ میں عطر کی اتنی تیز خوشبو پھیل جاتی کہ ہماری آنکھ کھل جاتی۔ زیب (میرے شوہر) تو کبھی اِن باتوں پر زیادہ دھیان نہ دیتے تھے البتہ مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ ضرور کوئی نہ کوئی خاص بات ہے، یہ خوشبو وغیرہ کا سلسلہ محض اتفاق تو نہیں ہوسکتا!!

ہمارا گھرانہ کچھ عرصے پہلے تک کافی خوشحال تھا۔ ہم لوگ گلشن اقبال میں اپنے ایک چھوٹے مگر نہایت خوبصورت گھر میں اپنے دو بچوں کے ساتھ بہت ہی آسودہ زندگی گزار رہے تھے مگر پھر گزشتہ دو تین سال میں رفتہ رفتہ ہمارے کاروباری حالات نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ ہم اپنا گھر چھوڑ کر فیڈرل بی ایریا کے علاقے کریم آباد میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ یہاں زیادہ تر فلیٹس ہی تھے جو کہ ہماری رینج میں آتے تھے۔

متوسط طبقے کے زیادہ تر لوگ فلیٹس میں ہی ر... ہیں۔ شروع شروع میں ہمیں یہاں ایڈجسٹ ہو... میں مسئلہ ضرور ہوا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ ہم ی... کے ماحول میں رچ بس گئے تھے۔

جب ہمارے بہت اچھے دن تھے، اُس و... زیب بزنس کیا کرتے تھے لیکن پھر ہوا یوں کہ زی... اُن کے پارٹنر نے ایسا چونا لگایا تھا کہ وہ بزنس چھو... نوکری کرنے لگے تھے، یوں ہماری گزر بسر پہلے ... طرح بہت اچھی نہ سہی لیکن ٹھیک ٹھاک ہو رہی تھی۔

اِس اپارٹمنٹ کی ایک بات بہت ہی اچھی ... کہ یہاں لوگ ایک دوسرے کا بڑا خیال ک... تھے، ہر خوشی، غم اور تہوار پر ایک دوسرے کو یاد... رکھتے تھے۔ یوں میرا بھی اپنے آس پڑوس کے ... دوسرے فلورز کے فلیٹس میں بھی آنا جانا ہوگیا ...

جیسے کہ میں نے اس کہانی کے آغاز میں ... ہمارا فلیٹ، اپارٹمنٹ کی آخری منزل پر تھا۔ اس ... بعد چھت تھی جس کی چابی ہمارے پاس تھی ... اپارٹمنٹ کے ہر زینے پر دو فلیٹس تھے۔ ہمارے ... ساتھ والے فلیٹ میں ایک انکل اور آنٹی رہ...

جن کے بچے ملک سے باہر تھے، یوں انہیں تو چھت کی کبھی ضرورت نہ پڑتی البتہ جب لائٹ چلی جاتی تو ہم چھت پر بڑے مزے سے ہوا کھاتے جہاں اتنا سکون تھا کہ دل چاہتا، بس وہیں سو جائیں۔ اُن دنوں میں کبھی کبھار وقت یا موقع ملنے پر قریبی ایک پارک میں واک کرلیا کرتی تھی۔ ایک دن ہم چھت پر موجود تھے تو مجھے اچانک ہی یہ خیال آیا کہ کیوں نہ میں روز رات کو کچھ دیر اس چھت پر ہی واک کرلیا کروں، ویسے بھی شہر کے حالات ایسے تھے کہ واک کے لیے پارک تک جانا مناسب نظر نہیں آتا تھا، سو اس طرح میں نے چھت پر واک شروع کردی تھی۔

کراچی میں لوڈشیڈنگ اپنے عروج پر تھی اور لائٹ جانے کے اوقات بار بار تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ میرے لیے چھت پر واک کا مناسب وقت مغرب اور عشاء کے درمیان یعنی مغرب کے فوراً بعد کا تھا۔ ابھی مجھے چھت پر واک کرتے ہوئے تیسرا دن ہی تھا کہ اچانک مجھے وہی پھولوں کی خاص خوشبو چھت پر بھی محسوس ہوئی تھی اور یہ خوشبو تو اس قدر تیز تھی کہ ایک لمحے کو میرا سر چکرا گیا تھا۔ خیر اُس روز کے بعد مجھے یہ خوشبو چھت پر واک کے دوران روزانہ ہی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں روزانہ تقریباً آدھا گھنٹہ چھت پر واک کرتی اور پھر جب میں نیچے فلیٹ میں آتی تو پسینے کے باوجود مجھ میں پھولوں کی وہی خوشبو رچی بسی ہوتی تھی۔

ایک دن میں حسبِ معمول واک کر رہی تھی کہ



اچانک مجھے لگا' کوئی بڑا ہی مزے دار حلوہ بنا رہا ہو۔ پہلے تو خیال آیا' فلیٹوں میں اکثر ایک دوسرے کے کچن سے کھانے پکانے کی خوشبو آتی رہتی ہے مگر یہ خوشبو تو ایسی تھی جیسے کوئی میرے پاس چھت پر ہی حلوہ بنا رہا ہو۔ اچانک ہی میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ جو بھی کوئی ایسا مزے دار حلوہ بنا رہا ہے' وہ تھوڑا سا مجھے بھی بھجوا دے' نہ جانے کیوں اُس حلوے کی خوشبو سے میرا دل للچا رہا تھا۔

میں واک سے فارغ ہو کر نیچے فلیٹ میں آئی تھی تو زیب نے بتایا تھا کہ ''کوئی بچہ یہ ٹرے دے کر گیا ہے کہ باجی کو دے دیجیے گا۔'' میں نے اُس ڈھکی ہوئی ٹرے کو کھول کر دیکھا تو بھاپ اڑاتا حلوہ اُسی خوشبو کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔ یقین جانیے کہ وہ حلوہ اس قدر لذیذ تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ کھایا تھا۔

زیب سے جب میں نے چھت پر حلوے کی خوشبو والی بات کا ذکر کیا تھا تو وہ پھر میرا مذاق اڑانے لگے تھے۔ ''بے وقوف وہمی عورت! ارے' آس پڑوس میں کتنے فلیٹ اور دوسرے بلاک ہیں' کسی کے گھر سے بھی یہ نیاز آ گئی ہوگی۔ تم بس آم کھاؤ' پیڑ نہ گنو۔''

کیا آپ میری اس بات پر یقین کریں گے کہ اس کے بعد اکثر ایسا ہوتا کہ میں صرف کھانے کی نہیں' جس چیز کی بھی خواہش کرتی' وہ کسی نہ کسی صورت پوری ہو جاتی تھی۔

مجھے اکثر ایسا لگتا کہ مختلف لذیذ ترین کھانوں کی خوشبوئیں میرے لیے صرف مجھے ہی آ رہی ہیں' کوئی صرف میرے لیے ہی اتنا اہتمام کر رہا ہے پھر وہ کھانا کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچ جاتا تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ میں اپنے میاں جی سے کسی خاص ڈریس کی فرمائش کرتی یا بازار میں پسند کرتی مگر زیب کی محدود آمدنی کی وجہ سے نہ خرید سکتی تو پھر وہ ڈریس کسی نہ کسی طرف سے مجھے تحفے کی صورت مل جاتا۔ اب میں یہ بات بہت اچھی طرح سے جان اور مان چکی تھی کہ کوئی نادیدہ ہستی مجھ پر مہربان ہو گئی ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود بھی اُس نادیدہ ہستی سے ایک اُنسیت سی ہو چکی تھی لیکن یہ بات میں نے خود اپنے تک محدود رکھی ہوئی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں اس معاملے میں محتاط سے محتاط ہوتی چلی گئی تھی' شاید میری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو جانے اُس ہستی سے کتنا فائدہ اٹھاتی مگر میں نے کبھی ایسا نہ کیا' اپنی خواہشات کو کبھی بے لگام نہیں ہونے دیا تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر سوچتی اور بولتی تھی کہ میرے منہ سے ایسا ویسا کچھ نہ نکلے کہ کہیں پوری نہ ہو جائے۔

ایک روز زیب آفس سے بہت جلدی گھر آ گئے تھے اور پھر یہ خبر کسی بم کی صورت ہی مجھ پر گرا دی تھی کہ انہیں نوکری سے نکال دیا گیا ہے' کمپنی بہت خسارے میں چل رہی تھی' سو کافی سارے لوگ فارغ کیے گئے' اُن میں سے ایک زیب بھی تھے۔

اس صورتِ حال کے بعد ایک طرف میں پریشان تھی تو دوسری جانب زیب بھی اپ سیٹ تھے۔ نوکری تو خیر' کوئی اور مل ہی جاتی تھی مگر اس میں کتنا عرصہ لگے گا اور اس عرصے میں ہم کس طرح گزارہ کریں گے؟ یہ فکر ہم دونوں کو کھائے جا رہی تھی۔

ملک اور شہر کے حالات خراب ہونے کے باعث تمام تر کوشش کے باوجود زیب کسی اچھی نوکری سے محروم تھے اور پھر ایک دن آخر کار حالات سے مجبور ہو کر میں نے اس اَن دیکھی ہستی سے مدد لینے کا سوچا تھا۔

میں چھت پر واک کرتے ہوئے مسلسل یہ کلمات ادا کرتی جا رہی تھی۔ ''اے اَن دیکھی مہربان ہستی' ہمیں کوئی راستہ دکھاؤ کہ خدا کے حکم سے ہمیں ہمارا رزق ملنا شروع ہو جائے۔'' میں یہ کلمات کہتے کہتے رو پڑی تھی کیونکہ اب زیب کی پریشانی مجھ سے

دیکھی نہ جا رہی تھی۔ وہ روز نوکری کے لیے جاتے مگر بات نہ بنتی یا بنتی تو تنخواہ بے حد معمولی ہوتی۔

اگلے دن صبح ہی صبح لندن سے ارشد ماموں کی کال آ گئی تھی۔ میرے یہ ماموں دس سال ہوئے پاکستان سے لندن شفٹ ہو چکے تھے۔ کسی زمانے میں یہاں کراچی میں طارق روڈ پر ماموں کی مٹھائی کی مشہور دکان تھی۔ وہ اُس زمانے میں نہایت ماڈرن اور آزاد خیال ہوا کرتے تھے مگر جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا' انہیں چہرے پر داڑھی سجائے' چوڑے ماتھے پر سجدے کا نشان لیے ایک نہایت عبادت گزار انسان کے روپ میں دیکھا تھا۔ خیر' بات ہو رہی تھی ماموں کی مٹھائی کی دکان کی تو وہ اپنا سارا کاروبار سمیٹ کر اپنے بچوں کے پاس لندن شفٹ ہو گئے تھے اور اب اچانک اتنے عرصے بعد اُن کی کال آنا میرے لیے کافی حیران کن تھا مگر اُس سے بھی زیادہ حیران کن بات انہوں نے مجھے یہ بتائی تھی کہ وہ دو روز پہلے پاکستان پہنچ چکے تھے اور اُسی شام ہمارے گھر بھی آ رہے تھے۔

ماموں ہم سے بڑی محبت سے ملے تھے اور جب کسی کام سے زیب تھوڑی دیر کے لیے باہر گئے تھے تو میں نے انہیں زیب کی نوکری اور اپنے حالات کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ میری باتیں سن کر وہ بس بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے رہے تھے جو مجھے بہت عجیب لگا تھا اور پھر اچانک وہ اپنی جگہ سے یہ کہتے ہوئے اٹھے تھے کہ ''چلو چھت پر' وہاں اُن کے سامنے معاملہ کرتے ہیں۔''

ماموں کی یہ بات سن کر میں بری طرح چونکی تھی اور پھر چھت پر ماموں ٹھیک اُسی جگہ جا کھڑے ہوئے تھے جہاں سے مجھے وہ اشتہا انگیز خوشبوئیں آیا کرتی تھیں۔ میں وہ سب کچھ بہت حیرانی سے دیکھ رہی تھی کہ اچانک ماموں نے کہا تھا۔ ''بیٹا! آج ایک وعدہ کرو کہ زندگی بھر کوئی نماز قضا نہ کرو گی۔''

''جی ماموں جان! میں وعدہ کرتی ہوں۔'' میں روانی میں یوں بول رہی تھی جیسے کوئی معمول جواب دیتا ہے۔

''شاباش بیٹا! اب نیچے چلو۔'' میں فوراً ہی ماموں کے ساتھ نیچے آ گئی تھی۔ اتنے میں زیب بھی آ گئے تھے اور پھر کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر ماموں نے زیب کو بزنس کی اتنی اچھی آفر دی تھی کہ خوشی سے میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔

''بیٹا! اب میرا وہاں دل نہیں لگتا' میں یہاں اب دوبارہ اپنا مٹھائی کا کاروبار شروع کرنا چاہتا ہوں' سرمایہ سارا میرا ہوگا' بس تم جیسے ایمان دار اور محنتی آدمی کی مجھے ضرورت ہے' تمہاری محنت کے ساتھ جب میرا تجربہ بھی شامل ہوگا تو مجھے یقین ہے کہ میرا یہ کاروبار اب پہلے سے زیادہ عروج پر ہوگا۔''

قصہ مختصر یہ کہ ماموں نے کاروبار شروع کیا اور زیب نے واقعی اس میں جان لگا دی تو پھر جیسا ماموں نے کہا تھا' ویسا ہی ہوا۔ دکان ایسی چلنے لگی کہ شام سے رات تک بے پناہ رش لگا رہتا تھا۔ ماموں نے زیب کو ففٹی ففٹی کا پارٹنر بنایا تھا' یوں ہمارے حالات بہتر سے بہتر اور پھر بہترین ہو گئے تھے۔ ماموں کے کہنے پر میں نے نماز کی پابندی شروع کر دی تھی۔ یہی نہیں' ماموں کے ساتھ دکان پر جو لوگ کام کرتے تھے' وہ سب کے سب پنج وقتہ نمازی اور ایمان دار لوگ تھے۔ نہ جانے ماموں کی باتوں میں کیا اثر تھا کہ لوگ اُن کی ہر بات مان لیتے تھے۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا اور دو سال کے عرصے میں کراچی کے کئی علاقوں میں ماموں کے مٹھائی والے کاروبار کی برانچز بھی کھل گئیں اور پھر ایک روز ماموں نے مجھے اور زیب کو اپنی ذات سے جڑی یہ کہانی سنائی تھی۔

''جب میں جوان تھا تو اپنی دنیا میں مست تھا' میری مٹھائی کی دکان بہت زبردست انداز میں چل

رہی تھی، پیسے کی ریل پیل تھی، سو شوق کے نام پر بہت سی برائیوں کو گلے لگایا ہوا تھا کہ ایسے میں اچانک میری دکان خسارے کی طرف جانے لگی تھی۔ اس بات نے مجھے بہت پریشان کر دیا تھا۔ ایک روز میں اسی پریشانی میں دکان بند کر رہا تھا تو سفید کپڑے سے اپنا منہ ڈھانپے ایک شخص میرے پاس آیا تھا اور بولا تھا۔

''برخوردار......! جن راستوں پر تم چل رہے ہو، یہ سب تباہی کے راستے ہیں۔ یہ سب خرافات چھوڑ کر دین کا راستہ اختیار کرو، نماز قائم کرو، صبح قرآنِ پاک کی تلاوت سے اپنے کاروبار کا آغاز کرو پھر دیکھو، تمہاری دکان کیسے چلتی ہے۔'' یہ سب کہہ کر وہ شخص تو چلا گیا تھا لیکن نہ جانے اُس کی باتوں میں کیا تھا کہ میں نے اُس کے بتائے ہوئے راستوں کو اپنا لیا تھا۔ میرے جاننے والے میری اس کایا پلٹ پر حیران تھے۔ میری مٹھائی کی دکان کی آمدنی بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔ اب میں نے اس حوالے سے کچھ خاص باتیں نوٹ کرنا شروع کر دی تھیں، ایک تو مغرب اور عشاء کے درمیان کچھ خاص قسم کے گاہک آنے لگے تھے جو بہت بڑی مقدار میں مٹھائی خریدتے تھے اور قیمت کی ادائیگی کی صورت اُن کی جانب سے دیئے گئے نوٹ ایسے ہوتے تھے جیسے ابھی چھپ کر سیدھے اُن کے ہاتھ میں آئے ہوں، صاف ستھرے نوٹ جن پر ایک نشان بھی نہ ہوتا تھا۔ میں اس سارے سلسلے پر حیران تھا کہ ایک روز پھر وہی حضرت میری دکان پر تشریف لائے جن کی باتوں نے میری دنیا بدل دی تھی۔ وہ میری زندگی میں بدلاؤ اور کامیابی پر بہت خوش تھے اور خوشی سے سرشار لہجے میں ہی بولے تھے۔

''بیٹا! ہمارا قبیلہ تم سے بہت خوش ہے، ہم جنات مٹھائیاں بہت شوق سے کھاتے ہیں مگر ہر کسی کی دکان پر نہیں جاتے۔ ہم لوگ اُسی دکان پر جاتے ہیں جہاں اللہ اور رسولؐ کا حکم اور احکام ماننے والے موجود ہوں۔'' اُن کی بات سن کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ جنات کے قبیلے سے تھے لیکن ذرا دیر میں ہی میرا خوف دور ہو گیا تھا اور میں اپنے رَب کے حضور سجدے میں پڑا روتا، گڑگڑاتا اس کا شکر ادا کرتا رہا تھا۔ اس کے بعد تو میں نے اپنی دکان کا نقشہ ہی بدل ڈالا تھا۔ سارے نوکروں کو خاص ہدایت کی تھی کہ وہ گاہکوں کے ساتھ ایمانداری اور خوش اخلاقی سے پیش آیا کریں۔ تمام ملازمین کے لیے سروں پر ٹوپی اور نماز کی پابندی لازمی تھی اور پھر میں دولت میں کھیلنے لگا تھا کہ ایک روز اُن حضرت کی پھر آمد ہوئی تھی اور انہوں نے مجھے یہ مٹھائی والا کاروبار کہیں اور کسی ملک میں کرنے کا مشورہ دیا تھا، سو میں لندن چلا گیا تھا۔ وہاں سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ ایک رات وہی بزرگ میرے خواب میں آئے تھے اور بتایا تھا کہ تم لوگ پریشان ہو اور مجھے یہاں آنے کی ہدایت کی تھی، سو میں یہاں چلا آیا اور یہ جو اس فلیٹ میں خوشبو والے معاملات اور دوسرے سلسلے چل رہے ہیں تو بس یوں سمجھ لو کہ اُن کے قبیلے کے کچھ افراد کا یہاں قیام ہے۔ میرا تم لوگوں کو یہ مشورہ ہے کہ یہ فلیٹ تم لوگ کبھی نہ بیچنا۔ کہیں اور جانا چاہو تو یہاں کرائے دار کو رکھ لو یا تالہ ڈال دو۔ یہ فلیٹ تم لوگوں کے لیے ہمیشہ خوش بختی کا باعث رہے گا۔''

یہ تمام باتیں بتا کر ماموں تو خاموش ہو گئے تھے مگر زیب پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی مجھے اور کبھی ماموں کو دیکھ رہے تھے۔

اس کے بعد کی کہانی یہ ہے کہ زیب، ماموں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں، نہ صرف وہ بلکہ ہمارا پورا گھرانہ پنج وقتہ نمازی بن چکا ہے۔ ہم اب بھی اسی فلیٹ میں رہتے ہیں حالانکہ آج ہم اتنے دولت مند ہیں کہ ڈیفنس کے بڑے سے بنگلے میں رہ سکتے ہیں مگر اُس بیٹھے بیٹھے گھر سے کہیں اور جانے کو جی بھی نہیں چاہتا!!

☆ ☆

نیلم الماس جبین مغل

ایک رات کی بات

گھڑی رات کے ڈھائی بجا رہی تھی۔ ان کی آنکھ فجر کی اذان پر کھلی تھی اور وہ دربار چلی گئی تھیں مگر گھڑی کے مطابق ابھی تہجد کا وقت بھی ختم نہیں ہوا تھا۔

ایک عورت کا قصہ، وہ ایک جن زادے کی تنہائی میں مخل ہوئی تھی

میرا نام زویا ہے۔ میرا تعلق جہلم کے قریبی گاؤں سے ہے۔ ہمارے گاؤں میں ایک بہت بڑے اور پہنچے ہوئے بزرگ کا دربار ہے جہاں بہت دور دور سے لوگ حاضری دینے اور اپنے من کی مرادیں مانگنے آتے ہیں۔

میں ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں جہاں درباروں وغیرہ پہ جانا تو دور کی بات، ایسا سوچنا بھی جرم سمجھا جاتا تھا مگر میری خالہ رضیہ کے خیالات ہم سے بالکل مختلف تھے، وہ نہ صرف خود گاؤں کے اِس دربار پر جاتی تھیں بلکہ ہمیں بھی



دعوت دیتی تھیں۔

ہر صبح فجر کے بعد ابھی ملگجا اندھیرا ہوتا تھا، اُس وقت وہ نہ صرف دربار جاتیں بلکہ اُس سے ملحقہ قبرستان میں اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لیے بھی جاتی تھیں۔ اُن کی یہ عادت پرانی تھی اور کبھی بھی اُن کی روٹین میں فرق نہیں آیا تھا مگر ایک خطرناک واقعے سے انہیں ایسا سبق حاصل ہوا کہ انہوں نے صبح ہی صبح مزار یا قبرستان وغیرہ جانے سے توبہ کرلی۔ اپنے ساتھ پیش آنے والے اس پراسرار واقعے میں وہ مرتے مرتے بچی تھیں۔

اُس روز بھی وہ معمول کے مطابق منہ اندھیرے اٹھی تھیں۔ دور کہیں سے آنے والی اذان کی آواز پہ رضیہ خالہ کی آنکھ کھلی تو انہوں نے کروٹ بدل کر بے خبر سوئے ہوئے اپنے دونوں بیٹوں شامیل اور عباد کو دیکھا پھر نماز پڑھنے کی غرض سے اپنے بستر سے اتریں۔ وہ آتی سردیوں کے دن تھے اس لیے موسم معتدل تھا نہ تو گرمی تھی اور نہ ہی سردی۔ اُس وقت بجلی گئی ہوئی تھی۔ چونکہ موسم گرم نہ تھا اس لیے بجلی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ خالہ نے لالٹین جلا کے نماز پڑھی پھر حسبِ معمول تسبیح اور لالٹین اٹھا کے دربار کی طرف چل دیں مگر جانے سے پہلے اپنے بیٹے عباد کو جگا کر اندر سے دروازہ بند کرنے کی ہدایت کرنا نہیں بھولی تھیں۔

گھر سے باہر قدم نکالے تو سردی کی ایک تیز لہر نے اُن کا استقبال کیا۔ انہیں ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ آسمان پر بدلی چھائی ہوئی تھی اس لیے لالٹین کی مدھم لَو میں راستہ واضح نظر نہیں آ رہا تھا مگر خالہ اس کے باوجود بے خوفی سے آگے کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ انہیں نہ تو اندھیرے سے ڈر لگتا تھا اور نہ ہی جنوں، بھوتوں، بدروحوں سے بلکہ وہ تو ان تمام مخلوقات کے وجود کو ماننے سے ہی یکسر انکاری تھیں۔

وہ جب دربار کے دروازے کے قریب پہنچیں تو حیران رہ گئیں۔ دروازے پر جوتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، اس ڈھیر میں ہر سائز کے جوتے اور چپلیں تھیں۔ وہ حیران تھیں کہ صبح صبح اتنے سارے لوگ کون ہیں جو دربار میں موجود ہیں؟ اسی حیرانی کی کیفیت میں وہ اندر داخل ہوگئیں۔ اندر کا منظر دیکھ کر اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دربار میں رونق سی لگی ہوئی تھی۔ قمقموں، جھنڈیوں سے دربار سجا ہوا تھا اور اگر بتیوں، عطر اور نہ جانے کون کون سی خوشبوؤں سے فضا معطر تھی۔

''آج نہ تو عرس ہے اور نہ ہی میلاد یا کوئی اور محفل پھر دربار کو اتنا سجایا کیوں گیا ہے؟'' انہوں نے ایک چھوٹے سے بچے کو پاس بلا کر پوچھا۔ اس بچے کو انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بچہ کچھ کہنے کی بجائے ایک عورت کی طرف اشارہ کر کے باہر کی طرف بھاگ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُس عورت کی طرف بڑھتیں، ایک سمت سے آتے مردوں کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گئیں۔ وہاں موجود سب مرد، عورتیں اور بچے ٹکٹکی باندھے خالہ کو دیکھنے لگے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اُن میں سے کوئی بھی خالہ کی جان پہچان کا نہ تھا، دوسرے یہ کہ ان سب کی ایک جیسی سیاہ بھنورا سی آنکھیں تھیں جن میں عجیب سا اسرار تھا البتہ سب کی شکلیں اور قد کاٹھ ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ اس کے علاوہ ان میں کچھ ایسا عجیب ضرور تھا جو رضیہ خالہ کو حیران کر رہا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ رضیہ خالہ دربار آئی ہوں اور پیر صاحب کی تربت پر فاتحہ خوانی نہ کرتی ہوں مگر آج اتنے مردوں کی موجودگی نے انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ وہ الٹے قدموں واپس پلٹیں تو دیکھا کہ چند قدموں کے فاصلے پر ماسی

سلطانہ کھڑی تھیں۔ اتنے اجنبی چہروں میں کسی اپنے کو پا کر وہ کھِل سی گئیں۔

''ماسی، کیا حال ہے آپ کا؟ اور آپ اتنی کمزور کیوں ہوگئی ہیں؟'' ماسی سلطانہ کی زرد پڑتی رنگت اور آنکھوں کے نیچے پھیلے حلقوں کو دیکھتے ہوئے خالہ تشویش سے بولیں۔

''پتر...... کیا بتاؤں، شوگر نے برا حال کیا ہوا ہے، نہ تو ٹھیک طرح سے کچھ کھا سکتی ہوں اور نہ ہی پی سکتی ہوں پھر یہ حال تو ہونا ہی ہے ناں۔'' ماسی سلطانہ کی حالت کی طرح آواز بھی نقاہت زدہ تھی۔

''بس ماسی، اللہ سے سب خیر کی دُعا کرتے ہیں اور اچھے کی امید رکھتے ہیں۔''

''ہاں پتر ٹھیک کہہ رہی ہو تم، تمہاری باتیں مجھے من کو لگتی ہیں۔ اللہ تمہیں سلامت اور اپنے گھر میں ہنستا بستا رکھے۔'' وہ اُن کے سر پہ ہاتھ رکھ کر دُعائیں دیتے ہوئے بولیں۔

''آپ ایسی ہی اچھی اچھی دُعائیں دیتی رہا کریں، باقی سب اللہ مالک ہے۔''

خالہ دربار سے نکلنے کے بعد نانا، نانی کی قبروں پہ فاتحہ خوانی کے لیے چلی گئیں۔ اُن کے دل پر ایک عجیب سا بوجھ آن پڑا تھا۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مسلسل کسی کی نظروں کے حصار میں ہیں مگر وہ آنکھیں انہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ اس اندھیرے میں لالٹین کی روشنی مزید مدھم ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ اس کی روشنی بالکل ہی ختم ہو جاتی، وہ جلد از جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتی تھیں۔

گھر پہنچیں تو کافی دیر تک انہیں دروازہ کھٹکھٹانا پڑا تھا کیونکہ اُن کے دونوں بیٹوں کی نیند بہت پکی تھی۔ خالہ کے شوہر دو سال سے ملازمت کے سلسلے میں سعودیہ میں مقیم تھے اور خالہ یہاں اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ ہمارے اور خالہ کے گھر کی دیواریں ملی ہوئی تھیں، تاہم امی کو ہمیشہ خالہ کی فکر لگی رہتی تھی۔

ہنر

اپنا ''حال'' اوروں سے چھپانا
ایک ہنر ٹھہرا
کچھ لوگ!
اِس ہنر میں کمال رکھتے ہیں
وہ ''حال'' یوں چھپاتے ہیں
جیسے کھال ہڈی کو!

شبانہ۔ کراچی

قرآن پاک کی تلاوت کرنے کی غرض سے انہوں نے کمرے کی لائٹ آن کی تو نظر وال کلاک پہ پڑی۔ ٹائم دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رہ گئیں کیونکہ گھڑی رات کے ڈھائی بجا رہی تھی۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہے؟ ان کی آنکھ فجر کی اذان پر کھلی تھی اور وہ دربار چلی گئی تھیں مگر گھڑی کے مطابق تو ابھی تہجد کا وقت بھی ختم نہیں ہوا تھا۔

'اتنی رات کو ماسی سلطانہ کیا کر رہی تھیں؟ دربار میں ماسی سلطانہ کا خیال آتے ہی وہ لرز کر رہ گئیں کیونکہ ماسی سلطانہ کو مرے ہوئے تو ایک سال بیت گیا تھا۔ وہ جنوں، بھوتوں وغیرہ پر یقین نہیں رکھتی تھیں مگر اس وقت وہ خوف سے بری طرح کانپ رہی تھیں۔

خالہ نے اپنے ساتھ پیش آئے اس واقعے کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا مگر ان میں واضح طور پر تبدیلی آ گئی تھی۔ پہلے وہ صرف فجر کے وقت دربار جاتی تھیں مگر اب ہر وقت وہاں جانے کو بے تاب نظر آتیں۔ ایک عجیب سی بے چینی اُن کے اندر

سرایت کر گئی تھی۔ ایک انجانا سا خوف اُن کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ جانے کیا بات انہیں تنگ کر رہی تھی؟

اُس رات زوردار انداز میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز پر ہم سب کی آنکھ کھل گئی تھی۔

''اس وقت کون آ گیا ہے؟'' ابو زیرلب بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولنے چلے گئے۔

''خدا خیر کرے، اس وقت کیا مصیبت آ گئی ہے؟'' امی بھی دہل کر بیٹھ گئیں۔ اگلے لمحے ابو جب واپس آئے تو اُن کے ساتھ خالہ کا بیٹا عباد بھی تھا۔ وہ کافی گھبرایا ہوا اور پریشان لگ رہا تھا۔

''خالہ، جلدی چلیں، امی کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے؟'' وہ سخت گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔

یہ سن کر امی اور بھی پریشان ہو گئیں۔ ''آئے ہائے..... کیا ہو گیا ہے اسے؟'' گھبراہٹ کے مارے ان کے منہ سے الفاظ بھی نہیں نکل رہے تھے۔

''پتا نہیں خالہ، وہ بہت عجیب باتیں کر رہی ہیں۔ ان کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ آپ بس پلیز، جلدی چلیں۔'' وہ ایسے التجائیہ انداز میں بول رہا تھا جیسے ہم اگر نہ اٹھے تو وہ ہمارے قدموں میں پڑ جائے گا۔

ہم فوراً خالہ کے گھر پہنچے۔ خالہ کی حالت واقعی عجیب ہو رہی تھی۔ آنکھیں پوری کی پوری کھلی ہوئی اور باہر کو ابلی ہوئی تھیں۔ باتیں بھی وہ نامانوس زبان میں کر رہی تھیں جو سمجھ سے بالاتر تھیں۔ ان کی حالت دیکھ کر تو امی رونے لگیں جبکہ ابو فوراً سمجھ گئے کہ ان پہ کسی چیز کا اثر ہو گیا ہے۔ وہ عباد اور شامیل کو ہمارے پاس چھوڑ کے خود گاؤں کے مولوی صاحب کو بلانے چلے گئے۔ گاؤں کے مولوی صاحب بہت پہنچے ہوئے تو نہیں تھے مگر دَم دُرود کر لیتے تھے۔ امی مسلسل رو رہی تھیں اور میں خالہ پر وہ سورتیں جو مجھے یاد تھیں، پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہی۔

تھوڑی دیر میں ابو، مولوی صاحب کو لے کر آ گئے۔ مولوی صاحب اُن پہ دَم کرتے رہے جس سے خالہ کی حالت قدرے بہتر ہو گئی پھر انہوں نے کچھ تعویذ پانی میں گھول کر خالہ کو دیئے جنہیں پینے کے فوراً بعد خالہ کی طبیعت سنبھل گئی۔

مگر یہ افاقہ وقتی تھا۔ رفتہ رفتہ خالہ کی حالت روز بہ روز عجیب سی ہوتی چلی گئی جس سے سارا گھر پریشان ہو گیا تھا۔ خالہ روز رات کو سب کے سونے کے بعد قبرستان چلی جاتیں اور صبح بے ہوشی کی حالت میں پائی جاتی تھیں۔ اس صورتِ حال سے ہم سب فکرمند ہو گئے تھے اسی لیے ہم خالہ کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان ہی کے گھر میں سوتے تھے۔

ابو کے ایک دوست جہلم میں رہتے تھے۔ جب ابو نے اُن سے یہ مسئلہ ڈسکس کیا تو انہوں نے ابو کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور ساتھ ہی بتایا کہ وہ ایک بہت پہنچے ہوئے عامل کو جانتے ہیں جن کے قبضے میں بہت سے جنات ہیں۔ وہ ضرور اس معاملے میں آپ کی مدد کریں گے۔ ابو نے گھر آ کر یہ بات ہمیں بتائی تو ہمارے دل کو حوصلہ سا ملا کہ چلو، اب خالہ ٹھیک ہو جائیں گی پھر ہم لوگ دن گن گن کر ان عامل بابا کا انتظار کرنے لگے۔ یہ عامل بابا کے آنے سے ایک رات پہلے کا ذکر ہے، اُس رات خالہ کے ساتھ کیا ہوا تھا، خود اُن کی زبانی سنیں۔

•......•......•......•

جب میں گھر سے نکلی تو میرا دل خوف سے لرز رہا تھا مگر نہ جانے کون سی قوت مجھے آگے کی جانب کھینچ رہی تھی۔ وہ رات بھی بہت خوفناک تھی، بجلی کی کڑک،

طوفانی بارش، تیز ہوا کی سرسراہٹ..... غرض ہر چیز اس رات کی پراسراریت میں اضافہ کر رہی تھی حالانکہ میں جن، بھوتوں وغیرہ کو نہیں مانتی تھی مگر اب ان کے وجود کی قائل ہو گئی تھی۔ جب میں قبرستان میں پہنچی تو قبرستان کے ساتھ والے میدان میں بہت سے مرد، عورتیں، بچے سفید کپڑوں میں ملبوس ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سارے مُردے اپنی قبروں سے نکل کر ٹھنڈی ہوا کھانے باہر بیٹھے ہوئے ہوں۔ جب بجلی چمکتی تو یہ منظر اور بھی خوفناک لگتا تھا۔ مجھے قبرستان میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ سب اپنی جگہ سے اٹھ کر میری جانب بڑھنے لگے۔ خوف کی شدید لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ میں تھر تھر کانپنے لگی۔ میں کسی غیرمرئی قوت کے زیراثر غیرارادی طور پر ایک طرف چل دی اور ایک قبر کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ میں آگے بڑھنا چاہتی تھی مگر کسی اَن دیکھی قوت نے میرے پاؤں جیسے جکڑ لیے تھے پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ قبر پھٹ کے دو حصوں میں بٹ گئی اور یکا یک اس میں سے دھواں اٹھنے لگا، ساتھ ہی بدبو کے ایسے بھبکے اٹھے کہ مجھے سانس لینا محال ہو گیا۔ اسی وقت مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے دھکا دیا ہو اور میں ایک جھٹکے کے ساتھ منہ کے بل اس قبر میں گر گئی۔

زوردار بجلی کڑکی اور مجھے جو منظر نظر آیا، اس نے میرے اوسان خطا کر دیئے۔ بہت ہی خوفناک چڑیل جس کے پورے چہرے اور جسم پر بال تھے، اس کے تانبے جیسے ناخن اور لمبے لمبے دانت تھے، اس نے اپنے ناخن میرے دونوں بازوؤں میں پیوست کر دیئے۔

''اف..... اللہ.....!'' درد سے بے ساختہ میری چیخ نکل گئی۔ منہ سے ''اللہ'' کا نام نکلتے ہی اس

غزل

رہا متفق وہ ہر اک بات سے
مگر تھا مخالف میری ذات سے

کرچیاں اپنی چننے میں مصروف ہوں
کوئی کھیلا تھا یوں میرے جذبات سے

دیا وہ ہواؤں سے کیسے بجھے
جو لڑتا رہے ہجر کی رات سے

جن میں خود سے بھی چہرہ چھپانا پڑے
دور ہی میں رہا ایسے لمحات سے

جس قدر بھی مشقت ہو تھکتے نہیں
کرتے ہیں جنگ جو اپنے حالات سے

جس کے پیچھے ہوس ہو بڑے نام کی
کس کا ہو گا بھلا ایسی خیرات سے

چاہے کچھ بھی کرو سوچ لینا غیاث
بچ نہ پایا کوئی بھی مکافات سے



غیاث الدین غیاث

چڑیل نے ایک جھٹکے سے مجھے چھوڑ دیا۔ بس اسی لمحے میں نے اپنا تمام تر حوصلہ یکجا کیا اور قبر سے باہر آ گئی۔ میرے بازوؤں سے خون بہہ رہا تھا‘ بے پناہ درد اور خوف سے میری حالت عجیب سی تھی۔ میں نے ہمت کر کے ایک جانب بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ مخلوق بھی میرے پیچھے بھاگنے لگی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا‘ وہ سب میرے سر پر پہنچ چکے تھے۔ اسی وقت مجھے ٹھوکر لگی۔ میرا سر کسی پتھر سے ٹکرایا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔

●......●......●

اس سے آگے کا قصہ یوں ہے کہ ابو ہم سب کو دروازہ اندر سے بند کرنے کی تاکید کر کے گاؤں سے کچھ لوگوں اور مولوی صاحب کو لے کر خالہ کی تلاش میں دربار کی سمت چل دیئے۔ ابھی وہ دربار سے چند قدموں کے فاصلے پر تھے کہ انہیں قبرستان میں کسی کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ابو ٹارچ اٹھائے اس سمت بڑھے۔ اسی وقت کسی کے گرنے کی آواز سنی۔ چند قدموں کی دوری پر انہیں ایک عورت نظر آئی جو زمین پر اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی۔ ابو نے اسے سیدھا کیا تو پریشان ہو گئے کیونکہ وہ عورت کوئی اور نہیں‘ خالہ تھیں۔ خالہ کا چہرہ خون سے تر تھا۔

اگلے دن عامل بابا بھی آ گئے۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک کمرہ بند کر کے اپنے گرد حصار کیے بیٹھے رہے اور جب باہر آئے تو ان کا چہرہ پرسکون تھا۔

”پریشانی والی کوئی بات نہیں‘ خطرہ ٹل چکا ہے۔ آپ لوگوں کو بس اتنا کرنا ہوگا کہ اپنی بہن رضیہ کو روزانہ قبرستان جانے سے روکنا ہوگا۔“ وہ میری امی سے مخاطب ہو کے بولے۔

”وہ تو ٹھیک ہے بابا جی! پر یہ سب کیسے ہوا؟ رضیہ تو کافی عرصے سے قبرستان جا رہی ہے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔“

”بیٹی! جس طرح ہم انسانوں میں مختلف خصوصیات کے حامل لوگ پائے جاتے ہیں اسی طرح جنات میں بھی ہر طرح کے مزاج والے ہیں۔ کوئی محفل پسند ہوتا ہے‘ کوئی تنہائی پسند‘ کوئی بذلہ سنج ہوتا ہے تو کوئی سنجیدہ‘ غرض جنات بھی مختلف عادات کے مالک ہوتے ہیں۔ آپ اگر کسی کی تنہائی میں مخل ہوں گے تو وہ یقیناً چڑ جائے گا اور آپ سے الجھے گا یا غصہ کرے گا اور یہی کام آپ کی بہن سے ہوا ہے۔ انہوں نے کسی انسان کی نہیں بلکہ ایک جن زادے کی تنہائی میں خلل ڈالا ہے جس کے نتیجے میں یہ سب کچھ ہوا اور کل اگر بروقت انہیں اٹھا کر گھر نہیں لایا جاتا تو آپ ساری زندگی اپنی بہن کی صورت دیکھنے کو ترس جاتیں۔“

”تو بابا جی‘ کیا اب انہوں نے خالہ کو معاف کر دیا ہے؟“ میں نے اپنے اندر کے خوف کو دور کرنے کی غرض سے پوچھا۔

میری بات سن کر وہ مسکرائے۔ ”ہاں بیٹا! انہوں نے تمہاری خالہ کو معاف کر دیا ہے۔ ان جنات سے میری بات ہوئی ہے اور انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جب تک تمہاری خالہ انہیں تنگ نہیں کریں گی‘ تب تک وہ بھی نہیں کریں گے۔“

”ہم خالہ کو سمجھائیں گے کہ وہ اب کبھی اتنی صبح قبرستان نہیں جائیں۔“ میں جلدی سے بولی۔

بابا جی نے خالہ کے بازو پر ایک تعویذ باندھ دیا اور چند وظیفے پڑھنے کے لیے بتائے۔

آج اس واقعے کو پانچ سال بیت گئے ہیں۔ اس کے بعد خالہ کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ان کے دل میں ڈر بیٹھ گیا ہے‘ وہ اکثر رات کو سوتے ہوئے ڈر جاتی ہیں۔ آپ سب دُعا کریں کہ ان کے دل سے یہ ڈر و خوف دور ہو جائے۔

غزالہ شاہین عبدالقیوم



ہم خانہ

پپا کی آواز باہر سے آئی۔ وہ چونک اُٹھی اور اس نے پلٹ کر لاؤنج میں دیکھا جہاں گھر کے تمام افراد بیٹھے تھے مگر اب وہاں کوئی نہ تھا۔ اس کی سٹی گم ہو گئی......

ایک نوجوان لڑکی کا واقعہ، اس نے چند گھنٹے جنات کے ساتھ گزارے تھے

سارے گھر والے تیار ہو کر پھوپھو کے ہاں جا رہے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے حارث کی آج بارات تھی۔ ثانیہ سب کو حسرت سے دیکھ رہی تھی کیونکہ وہ نہیں جا رہی تھی۔ کل اُس کا پیپر تھا۔ ایک عرصے کے بعد قریبی رشتہ داروں میں شادی نکلی تھی مگر کیمسٹری کا مشکل پیپر اس کے اعصاب پر سوار تھا پھر وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ اس کے مستقبل کا دارومدار انہی امتحانات پر تھا۔ وہ انٹر کے پیپر دے رہی تھی۔ اسے بہترین پوزیشن لینی تھی۔ میٹرک میں اُس کا گریڈ A تھا۔ فرسٹ ایئر میں اس کی percentage اس کی توقع کے مطابق 90 فیصد تھی۔ وہ انٹر کے امتحانات میں جان توڑ محنت کر رہی تھی۔



تقریباً ساڑھے دس کا وقت ہوگا جب اس کی امی ناصرہ بیگم نے اس کے کمرے کا دروازہ ناک کیا۔اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''تانیہ' ہم لوگ جا رہے ہیں' میں نے کھانا گرم کر کے ٹیبل پہ رکھ دیا ہے اور ہاں' اورنج جوس بھی فرج سے نکال لینا' فروٹس بھی وہیں رکھے ہیں' لازمی لے لینا۔ایسا نہ ہو ہم واپس آئیں اور سب یوں ہی رکھا ہو۔'' وہ اس کا گال پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''نو پرابلم مما' آپ لوگ جائیں بے فکر ہو کر' میں کھانا کھالوں گی۔'' تانیہ نے کہا۔

''اچھا آپی' اللہ حافظ!'' چمکتی دمکتی تابندہ بھی کمرے سے نکل آئی تھی۔وہ سبز جارجٹ کے سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔

''او کے' اللہ حافظ!'' تانیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم رہ لوگی ناں اکیلے' ڈرو گی تو نہیں؟'' مما نے پلٹ کر قدرے فکرمندی سے پوچھا۔

''اپنا گھر ہے مما' پھر ڈر کس بات کا' آپ لوگ بے فکر ہو کر جائیں۔'' اس نے مطمئن انداز میں کہا۔

پپا نے بھی اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔علی بھائی' نرگس بھابھی' ان کے دونوں بچے عالیان اور ملائکہ کے علاوہ تابندہ نے اس پر الوداعی نظر ڈالی۔اس نے مسکراتے چہرے کے ساتھ سب کو خدا حافظ کہا۔

بیرونی گیٹ بند کیا اور اندر آ گئی پھر اس نے منہ ہاتھ دھویا۔کچھ بھوک کا احساس تھا لہٰذا وہ ڈائننگ ٹیبل پہ آ گئی جہاں اُس کی پسندیدہ ڈش' ہری مرچ کا بھنا ہوا قیمہ موجود تھا۔یہ اس کی مما کی بڑی پیاری عادت تھی کہ امتحانات کے دوران بچوں کی پسندیدہ ڈشز تیار کرتی تھیں۔اس نے دل میں مما کو تھینکس کہا اور کھانا کھانے لگی۔

گھر میں ہر سو سناٹے کا راج تھا' تھوڑی سی وحشت ہو رہی تھی' وہ کبھی یوں تنہا نہیں رہی تھی۔کہنے کو تو اس نے اکیلے رہنے کا کہہ دیا تھا لیکن اب دل میں خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔

'اف' گھر والوں کے بغیر میں اتنا لمبا ٹائم کیسے گزاروں گی؟' وہ سوچے جا رہی تھی۔اس نے جلدی جلدی جیسے تیسے کھانا کھایا۔ابھی وہ ہاٹ پاٹ بند کر کے ہاتھ دھونے کے ارادے سے اٹھ ہی رہی تھی کہ لائٹ چلی گئی۔اس کا دم خشک ہونے لگا۔آنکھیں مارے خوف کے پھیلنے لگی۔دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ہر سو خاموشی اور تاریکی نے پر پھیلا رکھے تھے۔

وہ ہمت کر کے باہر کی طرف آئی۔چاند کی آخری تاریخیں تھیں لہٰذا آسمان پر بھی چاند نظر نہیں آ رہا تھا البتہ ستاروں کی جھلملاہٹ سے آسمان حسین لگ رہا تھا۔اکیلے پن' اندھیرے اور خاموشی سے وہ خوفزدہ ہو رہی تھی اور اللہ سے مدد کی درخواست کر رہی تھی۔

یکا یک مین گیٹ زور زور سے بجنے کی آوازیں آنے لگیں۔وہ پوری جان سے کانپ گئی۔

''اس وقت کون ہو سکتا ہے؟'' وہ بڑبڑا رہی تھی اور گیٹ پوری قوت سے پیٹا جا رہا تھا۔

''کون؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''دروازہ کھولو تانیہ' ہم سب واپس آ گئے ہیں۔''

مما کی آواز سن کر اس کی جان میں جان آئی۔اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔باہر تمام گھر والے موجود تھے' وہ ایک دم ہی خوش ہو گئی۔سب لوگ اندر آ گئے۔اسی وقت لائٹ بھی آ گئی۔اس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور سب کے اندر جانے کے بعد گیٹ بند کرتے ہوئے باہر جھانکا تو پورے علاقے کو تاریکی میں ڈوبا ہوا پایا۔

'اوہ...... صرف ہماری لائٹ آئی ہے؟' اس نے سر جھٹک کے سوچا اور گیٹ لاک کر دیا۔سب گھر

والے لاؤنج میں بیٹھ گئے۔

''اب ڈر تو نہیں لگ رہا ہے؟'' پپا نے پیار سے پوچھا۔

''نہیں پپا' وہ...... آپ لوگ شادی میں نہیں گئے؟'' وہ بولی۔

''چلے جائیں گے' اب تم سکون سے اپنی پڑھائی کر لو۔'' مما بولیں۔

''چائے پیو گی آپی؟'' تابندہ نے کہا۔تانیہ اس کی آفر پر ایک دم ہی خوش ہو گئی۔

''ہاں' پلا دو' آخر جاگ کر پڑھنا بھی تو ہے۔'' تانیہ نے کہا۔

''میں لاتی ہوں۔'' تابندہ چائے بنانے کچن میں چلی گئی اور تانیہ اپنے نوٹس وغیرہ اٹھا لائی۔اچانک ہی علی بھائی اس کے برابر والے صوفے پر آ بیٹھے۔

''چلو تانیہ' میں تمہیں کچھ امپورٹنٹ نوٹس بتائے دیتا ہوں۔'' علی بھائی نے گہری سنجیدگی سے کہا تو وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

وہ علی بھائی جن سے وہ التجائیں کر کر کے تھک جاتی تھی کہ بھائی' اسٹڈی میں میری ہیلپ کر دیں لیکن مجال ہے کہ کبھی اس کی ہیلپ کی ہو اور آج از خود اس کے پاس آن بیٹھے تھے۔وہ خوش ہو گئی۔

علی بھائی نے چند لمحوں میں اہم سوالات پر نہ صرف نشانات لگائے بلکہ اسے اتنے آسان طریقے سے سمجھایا کہ سب کچھ زبانی یاد ہو گیا۔اتنے میں تابندہ ایک کپ چائے لے آئی' تابندہ' علی بھائی' بھابھی' مما' پپا سب چائے کے شوقین تھے۔

''تابندہ' صرف ایک کپ' تم لوگ چائے نہیں پیو گے؟'' تانیہ نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں' ہم سب کو جانا ہے۔'' تابندہ نے مسکرا کے کہا۔تانیہ خاموش ہو گئی۔علی بھائی اسے دیر

تو......!

چل چُپ کر
اُسی کی طرفداری
اُسی کی گواہیاں
اُسی کی صفائیاں
تو میرا دل ہے
یا
اُس کا وکیل؟

ثانیہ بھٹی

تک سمجھاتے رہے۔اس نے چائے کا سپ لیا۔چائے بہت لذیذ تھی۔مزہ دے گئی تھی۔وہ سارا وقت پڑھتی رہی تھی اتنا کہ وقت گزرنے کا بھی احساس نہ رہا۔یکا یک اس کی نظر سامنے وال کلاک پر پڑی' پونے تین بج رہے تھے۔سب گھر والے خاموشی سے بیٹھے تھے۔

''آپ لوگ جائیں گے نہیں؟'' تانیہ نے حیرت سے کہا۔

''چلے جائیں گے' تم اچھی طرح پڑھ لو۔'' مما بولیں۔

وہ دوبارہ نوٹس پر جھک گئی۔اسی لمحے کال بیل ہوئی' اس نے چونکتے ہوئے مین گیٹ دیکھا۔

''جاؤ تانیہ' دیکھو تو ذرا۔'' پپا بولے تو وہ بڑی حیران ہوئی۔جب بھی کال بیل ہوتی' پپا خود جاتے تھے۔آج کل حالات اچھے نہ تھے اور اتنی رات گئے وہ کہہ رہے تھے کہ گیٹ تانیہ دیکھ لے؟ وہ حیرت کے تاثرات لیے اٹھی' برآمدہ اور صحن عبور کیا اور گیٹ پر پہنچی پھر اندر سے پوچھا۔

''کون ہے؟''

''کھولو بیٹے' ہم لوگ ہیں۔'' پپا کی آواز باہر سے آئی۔ وہ چونک اٹھی اور اس نے پلٹ کر لاؤنج میں دیکھا جہاں گھر کے سارے افراد کو وہ ابھی چھوڑ کے آئی تھی مگر اب وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ اس کی سٹی گم ہوگئی' مارے خوف کے دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''یا خدا! یہ کیا ماجرہ ہے' لاؤنج میں ابھی تو سب کو چھوڑ کر آئی ہوں اور یہ باہر کون لوگ ہیں؟'' وہ تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی' تب ہی علی بھائی کی غصیلی آواز اسے سنائی دی۔

''کیا ہوا تانیہ' دروازہ کھولو' کیا پوری رات ہمیں یہیں کھڑا رہنا پڑے گا؟'' اس نے ہمت کر کے گیٹ کھول دیا لیکن باہر سب گھر والوں کو دیکھ کر وہ بے ہوش ہوگئی۔ سب لوگ گھبرا گئے۔ وہ سمجھے' زیادہ پڑھنے کی وجہ سے وہ کمزوری کے سبب بے ہوش ہوئی ہے۔

''شاید بلڈ پریشر لو ہوگیا ہے۔'' بھائی نے کہا۔ مما' بھابھی اور تابندہ اسے اٹھائے ہما کے کمرے تک لے آئے۔ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے تو وہ تھوڑی دیر میں ہوش میں آ گئی۔

''کیسی ہو تانیہ؟'' مما بولیں۔

تانیہ آنکھیں پھاڑے مما اور دیگر لوگوں کو دیکھتی رہی۔ ''آپ لوگ تو جانے کے کچھ ہی دیر بعد آ گئے تھے؟''

''نہیں' ہم تو ابھی ابھی آئے ہیں۔'' علی بھائی نے کہا۔

''آپ تو مجھے پڑھاتے رہے تھے؟'' تانیہ نے حیرت سے کہا۔

''میں...... اور تمہیں پڑھا رہا تھا......؟'' علی نے قہقہہ لگایا۔ بھابھی بھی ہنس پڑیں۔

''ہم سب شادی میں گئے ہوئے تھے اور ابھی ابھی پھوپھو کے گھر سے آ رہے ہیں۔'' تابندہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''لیکن تابی' تم نے تو مجھے چائے بھی بنا کے پلائی تھی؟'' تانیہ نے جھٹ کہا اور ایسی نظروں سے تابندہ کو دیکھا جیسے اس نے تابندہ کی چوری پکڑ لی ہو۔

اسی لمحے پپا نے ہاتھ کے اشارے سے تابی کو بولنے سے منع کر دیا پھر بولے۔ ''ہاں بھئی تابی' چائے پلائی تو تھی تم نے' بھول گئیں؟''

''آں...... ہاں پپا' میں تو بالکل بھول گئی تھی۔'' تابندہ گڑبڑا کر بولی پھر پپا' علی کو کمرے سے باہر لاؤنج میں لے آئے۔

''لگتا ہے' تانیہ کے ساتھ کچھ غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ ایسا کرتے ہیں' جو وہ کہتی ہے' ہم مان لیتے ہیں' یہ بات فرداً فرداً تمام گھر والوں کو بتا دیتے ہیں' بعد میں دیکھیں گے' کیا بات ہے؟''

''او کے......'' علی نے کہا اور پھر سب تانیہ کی ہاں میں ہاں ملاتے گئے۔

گھر والے یکے بعد دیگرے سونے چلے گئے لیکن تانیہ کا ذہن الجھن کا شکار رہا۔ اگر گھر والے لاؤنج میں تھے تو کال بیل کس نے بجائی؟ اسی ادھیڑ بُن میں اسے نیند آ گئی۔

دوسری طرف تانیہ کے پپا احمد کمال بھی گہری سوچ میں گم تھے۔ تانیہ کی بتائی ہوئی باتیں بھی صداقت ظاہر کر رہی تھیں لیکن بات ان کی سمجھ سے باہر تھی۔ سوچوں کے سمندر میں وہ کتنی ہی دیر تک غوطہ زن رہے۔ ناصرہ بیگم بھی کچھ پریشان تھیں لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔ اسی عالم پریشانی میں احمد کمال کو نیند آ گئی۔

انہوں نے دیکھا کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے تسبیح پڑھ رہے ہیں۔ اچانک ایک بزرگ کچھ لوگوں کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے۔ احمد کمال تسبیح پوری کر کے دُعا مانگ رہے تھے۔ دُعا سے فارغ ہو کر وہ ان بزرگ ہستی کی طرف متوجہ ہوئے جو اپنی پُرکشش شخصیت کے ساتھ ایک دلکش مسکراہٹ لیے ان سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا رہے تھے۔ احمد کمال نے بھی بڑے خلوص کے ساتھ نہ صرف اُن سے بلکہ اُن کے ساتھ آنے والے سب ہی افراد سے ہاتھ ملایا اور انہیں بیٹھنے کو کہا۔ سب لوگ بیٹھ گئے۔ مدہم اور بھینی خوشبو فضا میں پھیل گئی تھی۔

''ہم آپ کے ساتھ اسی گھر میں رہتے ہیں۔'' بزرگ نے کہا۔ ''رات آپ لوگ گئے ہوئے تھے۔ تانیہ بی بی کو تنہائی سے پہلے ہی خوف آ رہا تھا' بعد میں لائٹ الگ چلی گئی۔ ہم لوگ' آپ سے بہت خوش ہیں کیونکہ آپ سب صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں اور گھر بھی صاف و شفاف رکھتے ہیں لہٰذا آپ سب کی غیر موجودگی میں ہم نے آپ سب کے روپ اختیار کیے اور تانیہ بی بی کے پاس آ گئے۔ صرف اتنی سی بات ہے' آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔'' بزرگ نے وضاحت کے ساتھ سب کچھ بتا دیا۔ احمد کمال حیرت سے سن رہے تھے۔

''آپ لوگ کون ہیں؟''

''ہمارا تعلق قومِ اجناء سے ہے۔'' بزرگ نے کہا۔

''آپ کا بہت شکریہ' آپ نے میری بچی کا خیال رکھا۔'' احمد کمال نے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔

''اس میں شکریئے کی کیا بات ہے' یہ تو ہمارا فرض تھا۔ ہاں' اس بات کا کسی سے ذکر مت کیجیے گا۔'' بزرگ نے کہا پھر اجازت طلب کی اور وہ سب کے سب لمحے میں سامنے بیٹھے بیٹھے غائب ہو گئے۔

اُسی وقت احمد کمال کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں وہی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اُن کا یہ خواب انہیں

سانحہ

سارا چمن پیار میں
پھولوں سے بھر گیا
پر ٹوٹا ہوا یہ میرا دل
چپکے سے مر گیا

شگفتہ شفیق

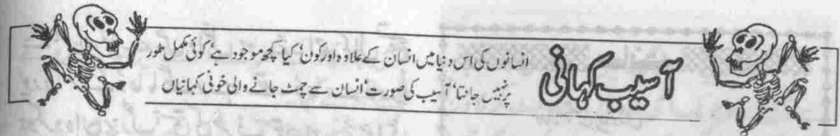
ساری حقیقت سمجھا گیا تھا۔

اگلی صبح تانیہ کا کیمسٹری کا پیپر تھا۔ وہ سب سے دُعائیں لے کر پیپر دینے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد احمد کمال نے صرف ناصرہ بیگم کو حقیقت سے آگاہ کیا۔ وہ بھی سن کر حیرت میں ڈوب گئیں۔

کمرۂ امتحان میں کیمسٹری کا پیپر تقسیم ہوا۔ تانیہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی' رات علی بھائی نے جن سوالات کی اور نوٹس میں موجود مواد کی نشاندہی کی تھی' وہی سب کچھ پیپر میں تھا۔ اس کا پیپر بڑا ''زبردست'' ہوا۔ اس سبجیکٹ کو وہ بہت مشکل سمجھتی تھی لیکن یہی سبجیکٹ اس کی کامیابی کا راستہ بنا۔ اس نے کیمسٹری میں بہترین نمبر لیے اور سال بہ سال کامیابی کے مدارج طے کرتی رہی۔ اس نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا اور ایک کالج میں کیمسٹری کی لیکچرار بن گئی۔

وہ آج ایک قابل لیکچرار ہے لیکن کبھی کبھی وہ اُس واقعے کو یاد کرتی ہے کیونکہ اُس کے پپا نے اسے بھی اصل بات بتا دی تھی اور جب اسے پتہ چلا کہ اس نے چند گھنٹے جنات کے ساتھ گزارے تھے تو اس کا رواں رواں کانپ اٹھا تھا' خاص کر تابندہ کا چائے پلانا۔ اس چائے کا ذائقہ ہی اتنا زبردست تھا کہ وہ اب تک اُس چائے کی لذت کو بھول نہیں پائی تھی۔

☆ ☆





حنا بشریٰ

معمہ حل نہیں ہوتا

کمرے میں اندھیرا ہونے سے امی کو صورتِ حال سمجھ نہیں آئی تھی۔ اسی وقت لائٹ آئی تو سب کچھ واضح ہوگیا اور پھر امی کی چیخوں نے ہم سب کو دہلا دیا۔

اس نوجوان کا قصہ جو سفلی طاقتوں کی بھینٹ چڑھ گیا تھا



میں حسبِ معمول گھر کے کاموں میں مصروف تھی کہ فون کی بیل بجی تو امی نے مجھے پکارا۔ ''حنا! تمہاری دوست فریال کا فون ہے۔''

میں نے فون اٹھایا تو پتہ چلا کہ فریال کے بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں بہت حیران ہوئی کہ وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھے، ایک دم یہ کیا ہوگیا؟ فریال نے بس اتنا بتایا کہ اس کے بھائی اپنے کمرے میں مردہ پائے گئے تھے۔ میں امی کے ساتھ تعزیت کے لیے اُس کے گھر گئی تھی اور پھر فریال نے جو کچھ بتایا، اُسی کی زبانی سنیے۔

•......•......•......•

''میرا نام فریال احمد ہے۔ میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ گھر میں اگر بہت دولت کی ریل پیل نہیں ہے تو کوئی ایسی تنگی بھی نہیں ہے۔ گزراوقات اللہ کے کرم سے اچھی ہو جاتی ہے۔ ابو ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازم ہیں۔ میں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ سب سے چھوٹی اور اکلوتی ہونے کے باعث گھر والوں کی بے حد لاڈلی ہوں۔ دونوں بڑے بھائیوں سے چھوٹے بھائی سلمان احمد مجھ سے دو سال بڑے تھے۔

اپنی وفات سے چند ماہ پہلے سلمان بھائی اپنے چند دوستوں کے ساتھ پنڈی گئے تھے۔ ایک تو سیر و تفریح کا پروگرام تھا اور دوسرا اُن کے دوست کی بہن کی شادی بھی تھی۔ اُن کا پنڈی میں دو ہفتے رکنے کا پروگرام تھا۔ بھائی نے مجھے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا۔ میں تیار ہو جاتی مگر ایگزام کی وجہ سے نہ جا سکی تھی۔

ہمارا گھرانہ مذہب سے دور ہے، کبھی کبھار جمعے کی یا عید کی نماز پڑھ لینے کو ہم مذہب سمجھتے ہیں۔ پانچ وقت کی نماز تو گھر میں کوئی پڑھتا ہی نہیں ہے۔ قرآن کی تلاوت کا تو کوئی سوچتا ہی نہیں البتہ ہمارے پاس فضول باتوں کے لیے بہت وقت ہوتا ہے۔

میں بھی اسکول، کالج میں اساتذہ کے کہنے پر کبھی کبھار نماز پڑھ لیتی ہوں۔ اپنی اس کوتاہی پر ندامت بھی ہوتی ہے، شاید اس کی یہ وجہ ہے کہ گھر میں کبھی بڑوں کو اس طرف راغب ہی نہیں دیکھا۔

سلمان بھائی بھی نماز، روزے سے دور بس نام کے مسلمان تھے۔ آج سوچتی ہوں کہ مذہب سے دوری سے ہم تباہی کے دہانے پر کھڑے ہوگئے ہیں۔ ہمارے اردگرد لاتعداد مخفی طاقتیں برسرِ پیکار ہیں اور شیطان کے آلہ کار بننے والوں کو اپنے بس میں کرتی رہتی ہیں۔ باطن کی پاکیزگی و صفائی کیا ہوتی ہے، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

بہرحال پنڈی پہنچ کر شروع کے دو تین دن بھائی گھر والوں کو بلاناغہ فون کرتے تھے اور اپنی خیر خیریت کی اطلاع دیتے تھے مگر پھر بھائی کے فون آنا بند ہوگئے جس پر گھر والوں کو تشویش ہوتی تھی۔ ہم نے خود سے فون کیا تو فون بھائی کے دوست نے اٹھایا تھا اور بتایا کہ بھائی سو رہے ہیں۔ اطمینان تو ہوگیا مگر ایک فکر سی لاحق تھی خصوصاً امی بہت پریشان تھیں۔ جس دن بھائی گھر آئے، تب امی کو سکون ملا تھا جبکہ بھائی کو دیکھ کر میں چونک گئی تھی۔ وہ بدلے بدلے سے لگ رہے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ یہ سلمان بھائی نہیں اور کوئی ہے۔ وہ کبھی اتنے خاموش اور سنجیدہ نہیں رہتے تھے۔ وہ تو بہت ہنس مکھ اور ملنسار سے تھے۔ میرے ساتھ اُن کی خاصی دوستی تھی مگر جب سے وہ واپس آئے تھے، میرے ساتھ بھی بے حد سنجیدہ تھے۔ سب سے رسمی سا مل کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ ہم نے اسے سفر کی تھکاوٹ جان کر زیادہ اہمیت نہیں دی تھی مگر میری حساسیت سلمان بھائی کی طرف سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

شام کو خاصی دیر تک انتظار کرنے پر بھی جب وہ اپنے کمرے سے باہر نہ آئے تو امی کے کہنے پر میں انہیں کھانے پر بلانے کے لیے اُن کے کمرے میں گئی تھی۔ میں نے دو بار دروازے پر دستک دی تھی مگر کوئی جواب نہ ملنے پر میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

کمرے میں سگریٹ کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی اور سلمان بھائی غالباً کوئی کام کررہے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر انہوں نے مڑکر دیکھا تھا۔ ان کی شکل دیکھتے ہی میں لرز کررہ گئی۔

اُف خدایا! سرخ انگارہ آنکھیں اور وحشت ناک چہرہ...... مجھے آج بھی وہ منظر یاد آتا ہے تو خوف سے جھرجھری آجاتی ہے۔

وہ سلمان بھائی تو نہیں تھے' وہ تو کوئی اجنبی خوفناک مخلوق لگ رہی تھی۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بھائی نے انتہائی سخت لہجے میں کہا تھا۔ "جاؤ یہاں سے...... خبردار! آئندہ میرے کمرے میں قدم رکھا......" اور میں جو پہلے ہی خوف زدہ تھی' الٹے پیروں واپس لوٹ گئی۔ امی نے میری گھبرائی ہوئی صورت دیکھی تو پوچھا۔

"سلمان کہاں ہے؟ کھانا کھانے کیوں نہیں آیا؟"

"وہ...... امی...... دراصل بھائی سورہے ہیں۔"

مجھے اپنی آواز کسی کھائی سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"ابھی تک......" امی کو فکر لاحق ہوئی۔

اور میں کوئی جواب دیئے بغیر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ سلمان بھائی کو کیا ہوگیا ہے؟ انہوں نے مجھ سے اتنی رکھائی سے کیوں بات کی ہے اور ان کی آنکھیں......!

اُف خدا کی پناہ!

بس اس دن کے بعد سے گھر میں وہ واقعات ہونے لگے کہ جس کا ہم نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

سلمان بھائی گھر والوں سے بے زار رہتے تھے۔ کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ جاب پر جانا بھی چھوڑ دیا تھا جس پر ابو بہت سیخ پا ہوئے تھے۔

ان کے مطابق 'یہ پاگل پن کا ڈرامہ ہورہا ہے' صرف کام سے بچنے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا جارہا ہے۔' ابو اور بھائی کے درمیان ہاتھا پائی بھی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ ابو کسی صورت میں یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ بھائی کو کسی مشکل کا یا بیماری کا سامنا ہے۔

ہمارے کہنے پر ابو اور دونوں بھائی انہیں ذہنی امراض کے معالج کے پاس لے گئے تھے اور انہوں نے چند دوائیاں دے کر فارغ کردیا تھا۔ دوائیوں کا بھی کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تھا۔ بھائی کی حالت پہلے سے بھی ابتر تھی' کسی سے بات نہ کرتے تھے' یہاں تک کہ کتنے ہی دن ہوگئے تھے' وہ نہائے بھی نہیں تھے اور نہ کپڑے بدلتے تھے۔ میں اور امی بے حد فکرمند تھے۔ دونوں بھائی امی کو تسلی دیتے مگر صورت حال بہتر نہ ہوتی تھی۔

پھر کسی کے کہنے پر امی' بھائی کو کسی اللہ والے کے پاس لے گئی تھیں اور جب ان کی واپسی ہوئی تو وہ خاصی خوف زدہ تھیں۔ بھائی نے راستے میں امی کو بہت پریشان کیا تھا اور مرنے مارنے کی دھمکیاں بھی دی تھیں اور دم کروانے پر بھی خاصا برہم ہوئے تھے۔ شاہ صاحب نے بھائی پر دم کیا تھا جس پر بھائی اور بے چین ہوگئے تھے اور آپے سے باہر ہوئے جارہے تھے۔

شاہ صاحب نے امی کو تعویذ اور پڑھا ہوا پانی دیا تھا کہ تعویذ گلے میں ڈال دو اور پانی سارا دن میں پلاتے رہنا ہے۔ گھر والے سب پابندی سے نماز پڑھیں اور باوضو رہیں۔ شاہ صاحب کا کہنا تھا کہ بھائی پر کسی آسیبی مخلوق کا قبضہ ہوگیا ہے جو اسے مارنا چاہتی ہے اس لیے بہت محتاط رہیں۔

شاہ صاحب کے آستانے سے واپسی پر بھائی خاصے برہم تھے اور انہوں نے تعویذ پہننے سے انکار کردیا تھا اور پڑھا ہوا پانی تو ہاتھ مار کر گرادیتے تھے۔ تمام گھر والے بے حد پریشان تھے۔

ایک دن بھائی کے دوست زبیر آئے تھے اور بھائی کے بارے میں پوچھا۔ بھائی کمرے میں موجود تھے مگر انہوں نے ملنے سے انکار کردیا تھا' تب امی نے تمام صورت حال زبیر بھائی کے گوش گزار کردی تھی۔

"بیٹا' وہاں سب خیر تھی ناں' سلمان کو آخر ہو کیا گیا ہے؟"

"آنٹی' ویسے تو سب خیریت تھی مگر ایک دن سلمان احمد ایک درخت کو خاصی دیر تک گھورتا رہا تھا۔ ابھی ہم سب متوجہ ہوتے کہ وہ ایک چیخ مار کر بے ہوش ہوگیا تھا۔ بس اس کے بعد خاموش سا اور گم صم سا رہنے لگا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید گھر والوں کو مس کررہا ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا۔"

زبیر بھائی نے خاصی وضاحت کے ساتھ بتایا تھا۔

ایک بار تو بھائی نے امی پر ایسا حملہ کیا کہ وہ امی کو جان سے مار دیں گے۔ بڑی مشکل سے بھائیوں نے امی کو اُن کی گرفت سے چھڑایا تھا۔ میرا رو رو کر برا حال ہوگیا تھا۔ یہ ہمارے گھر کو جانے کس کی نظر لگ گئی تھی۔ اب امی اور میں پابندی سے نماز پڑھ رہے تھے۔ ہم اپنی کوتاہی کی اتنی بھیانک سزا بھگتیں گے' کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

بھائی جو امی کے بے حد لاڈلے تھے' اب امی کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ امی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر بھی بہت سیخ پا ہوتے تھے۔ میں نے ایک بات نوٹ کی تھی' جب سے ہم نے نماز پڑھنی شروع کی تھی' بھائی کی حالت زیادہ بگڑ گئی تھی۔ وہ مرنے مارنے پر آمادہ رہتے تھے۔

میری ایک دوست کی بہن رُوحانی علوم کے بارے میں کچھ سمجھ بوجھ رکھتی ہیں۔ میں نے اُن سے



میرے دل کی لکھی تحریر میری آنکھوں میں پڑھنا
یہ دردِ دل ہے اسے تنہا راتوں میں پڑھنا

کوئی خوشی مجھے راس نہیں ہوئی اک تیرے بن
میری خوشیوں کے جنازے کی خبر اُداس شاموں میں پڑھنا

جب چلنا پڑے تجھے تنہا راہوں پر اکیلے
میرے بھی دکھوں کا نوحہ ان ہی لمحوں میں پڑھنا

ہر گھڑی ہر پل تجھے سوچتا ہوں
میری خاموش وصیت میری شاعری کے لفظوں میں پڑھنا

میں کیسے ٹوٹ گیا ہوں کیسے بکھر گیا ہوں
میری خوشیاں اڑتی ہواؤں میں پڑھنا

کتنے دکھوں سے' آنسوؤں کے درمیاں لکھی تحریر شاہد وفا
شاید ملے سکوں مہرباں بھیگی پلکوں میں پڑھنا

مور شاہد حسین وفا

بات کی تھی اور بھائی کی حالت بیان کی تھی۔ انہوں نے حساب لگاتے ہوئے بتایا تھا۔ ''تمہارے بھائی پر کسی مخلوق کا اثر ہوگیا ہے۔ وہ آپ لوگوں کی مداخلت پسند نہیں کر رہی ہے اس لیے آپ بھائی کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ جہاں تک میرے حساب کتاب کی بات ہے تو صورت حال بہتر ہونے کے امکان نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اس دنیا میں جن و انس کے علاوہ بھی بے شمار مخلوقات ایسی ہیں جو ہماری آنکھ سے تو اوجھل ہیں مگر ہمارے اردگرد ہی ہوتی ہیں۔ بعض اوقات گندی اور سفلی طاقتیں انسان کی نماز' روزے سے دوری کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں اور پھر انسان اپنے ہوش وحواس سے بے گانہ ہوجاتا ہے۔''

بھائی کی حالت رفتہ رفتہ بگڑتی جارہی تھی۔ سارے گھر والے بے حد پریشان تھے۔ ایک مرتبہ امی نے خواب میں دیکھا کہ ایک خوفناک صورت عورت امی کو ڈرا رہی ہے۔ امی اسے گھر سے نکالنے کی کوشش کرتی ہیں اور وہ خوفناک انداز میں امی کو کہتی ہے کہ وہ جتنا مرضی کوشش کرلے' میں یہاں سے جانے والی نہیں ہوں اور پھر امی کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس کے بعد امی مزید پریشان رہنے لگی تھیں۔

اب ابو کو بھی حالات کی سنگینی کا احساس ہورہا تھا۔ اُن کا رویہ بھی بھائی کے ساتھ نرم ہوتا جارہا تھا مگر بھائی کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔

بعض اوقات بھائی نے امی کے علاوہ مجھ پر بھی حملے کیے تھے۔ میں ان سے خاصی خوف زدہ ہوگئی تھی۔ بھائی نے اس کے بعد شاہ صاحب کے پاس جانے سے بھی انکار کردیا تھا۔ حالات بس سے باہر ہوگئے تھے۔ گھر پر ایک وحشت اور پراسراریت کا راج تھا۔ دو تین بار بھائی نے اپنے آپ کو مارنے کی کوشش بھی کی تھی مگر کسی نہ کسی کی موجودگی کے باعث اُن کی یہ کوشش ناکام ہوجاتی تھی۔

مگر ایک دن انہیں موقع مل گیا اور پھر کسی کو کچھ کرنے یا کروانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ بھائی رات کو اپنے کمرے میں تھے۔ امی کے دل کو قرار نہیں تھا۔ وہ انہیں دیکھنے ان کے کمرے میں گئی تھیں مگر وہاں بھائی کی بے حس وحرکت لاش ان کی منتظر تھی۔ کمرے میں اندھیرا ہونے کے باعث امی کو صورت حال سمجھ نہیں آئی تھی مگر سلمان بھائی اپنے بیڈ پر نہیں تھے بلکہ زمین پر گرے تھے۔ ان کے قریب ہی پستول پڑا تھا اور ان کی کنپٹی میں گولی لگی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ ان کے کپڑے خون سے تربتر تھے۔ امی ان کو اٹھانے کے لیے جھکی تھیں اور امی کے ہاتھ پر خون لگا تھا۔ اتنی دیر میں لائٹ آگئی تھی اور اندھیرے نے جس خوف پر پردہ ڈالا ہوا تھا' وہ روشنی کے باعث واضح ہوگیا اور پھر امی کی چیخوں نے ہم سب کو دہلا دیا۔ ہسپتال جانے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ بھائی جانے کب کے ہر قسم کی اذیت اور تکلیف سے نجات پاچکے تھے۔

آخر ان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اُن کے ساتھ کون تھا؟ کس تکلیف اور مصیبت کے زیر اثر انہوں نے خود کو ختم کرلیا؟ کیوں وہ گھر والوں کی جان لینا چاہتے تھے؟ وہ خوفناک عورت کون تھی؟ یہ وہ سوالات ہیں جو آج بھی ہمارے ذہنوں میں ہیں مگر ان کے جواب ہمیں آج تک نہیں ملے۔ زندگی کا کام چلنا ہے' چل رہی ہے مگر وہ لمحہ ہماری زندگیوں میں جم سا گیا ہے۔ ہمارا پیارا بھائی آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہے جہاں اس کی موت کا غم ہے' وہاں ان واقعات کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتے جو ان کی موت کا باعث بنے تھے اور حقیقت کیا ہے' یہ صرف خدا کو معلوم ہے۔ ہمارے لیے وہ تمام واقعات آج بھی معمہ ہیں۔

☆☆

الماس فاطمہ عابدی

نادیدہ عاشق

حسینہ چیختی چلاتی دھوبی گھاٹ کی طرف بھاگی، باپ اور دادی نے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ ایک دھوبی کی جلتی ہوئی بھٹی میں کود گئی اور چند منٹوں......

ایک آسیبی محبت کا قصہ، وہ آسیب اپنی محبت کو ساتھ لے گیا تھا

یہ کہانی چالیس برس پرانی ہے۔ یہ واقعہ گولیمار کا ہے جو ہم نے اپنی نانی کی زبانی سنا تھا اور آج میں اپنے قلم کے ذریعے آپ تک پہنچا رہی ہوں۔ گولیمار دھوبی گھاٹ کے قریب کچے کے مکانوں کی ایک بستی آباد تھی جہاں ہماری نانی نے بھی مکان خریدا تھا۔ ہماری نانی کی ہر ایک سے دوستی تھی' وہ بہت خوش اخلاق اور گھل مل کر رہنے والی خاتون تھیں خواہ دھوبن ہو یا بھنگن' ہر ایک کو اپنا سمجھتیں اور محبت سے پیش آتیں اسی لیے علاقے میں سب نانی کی بڑی عزت کرتے تھے۔ نانی کے گھر ایک دھوبن آتی تھی جو نانا اور ماموں کے کپڑے دھوتی تھی۔ اُس کا نام رشیدن



تھا۔ وہ ہر ہفتے آتی، گھنٹوں نانی سے اپنے دکھ سکھ بیان کرتی۔ رشیدن کی ایک پوتی تھی جو دس سال بعد بڑی منتوں مرادوں سے ہوئی تھی۔ رشیدن نے اس کا نام حسینہ رکھا تھا۔ وہ اپنے نام کی طرح واقعی حسین تھی۔ اس کی بلوریں آنکھیں، کتابی نقش و نگار ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ ہماری نانی صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں اور قرآنی عمل کے ذریعے رُوحانی مسائل بھی حل کر دیا کرتی تھیں۔

رشیدن کو نانی نے کئی بار متنبہ کیا کہ پوتی کا خیال رکھو اس بچی کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے، اس پر سایہ ہے کسی گندی شئے کا، اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت ہے۔

مگر نانی کی بات پر رشیدن ہمیشہ ہنس کر کہتی۔ ”بی بی، یہ ضدی ہوگئی ہے۔ آخر میری اور باپ کی لاڈلی ہے، ہر وقت اپنی من مانی کرتی ہے۔“

ایک روز رشیدن آئی تو وہ اداس تھی۔ اس نے بتایا تھا۔ ”بی بی آپ ٹھیک کہتی ہیں، اب ہم بھی محسوس کرتے ہیں، کوئی نہ کوئی بات ہے۔ حسینہ خود سے باتیں کرتی ہے، سارا دن کھانا نہیں کھاتی، اس کی سکھیاں اس کو پگلی بول کر چھیڑتی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ ”بی بی جی، آپ اس کے لیے کوئی تعویذ دھاگہ پڑھ کے دے دیں۔“

”میں کوئی تعویذ نہیں دے سکتی کیونکہ میرا تعویذ اس پر اثر نہیں کرے گا البتہ تم کل ایک صاف بوتل لانا، میں پانی دَم کرکے دوں گی۔ تم اس کو پانی پلاتی رہنا۔ اللہ کرم کرے گا۔“ نانی نے کہا۔ اگلے دن نانی نے پانی دَم کرکے دے دیا۔ اس پانی سے حسینہ کو کچھ افاقہ ہوا۔ وہ کھانا وغیرہ کھانے لگی۔

نانی نے رشیدن سے کہا۔ ”دیکھو اسے زیادہ تنگ مت کرنا، اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔“

مگر حسینہ کا باپ مختلف عاملوں کے پاس جاتا رہا جس کی وجہ سے حسینہ ضدی اور خونخوار ہوگئی، پہلے وہ گھر کے کسی فرد کو نقصان نہیں پہنچاتی تھی، اب مرنے مارنے پر آگئی تھی۔ ایک دن اس نے اپنی ماں کو بری طرح زخمی کر دیا کیونکہ وہ بار بار اس پر کچھ پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھی۔ آخر کار تنگ آکر باپ نے حسینہ کو زنجیروں میں جکڑ دیا۔ ایک دن معلوم ہوا کہ حیدرآباد میں ایک بہت بڑے عامل صاحب ہیں جو شاہ جی کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ اس طرح کی چیزوں کا اتار کرتے ہیں۔ حسینہ کا باپ ان عامل کو بڑی منت سماجت کرکے گھر لایا۔ انہوں نے حسینہ کو دیکھتے ہی بتایا کہ اس کے اتار میں بہت رسک ہے یا تو وہ آسیب چلا جائے گا یا پھر حسینہ کی موت ہوسکتی ہے۔ اگر تم راضی ہو تو میں علاج شروع کروں۔

”آپ شروع کریں۔ اللہ کی جو مرضی۔“ باپ نے کہا۔ عامل نے علاج کے لیے کالے بکرے کی سری، پرانی قبر سے مردے کا ڈھانچہ اور دیگر چیزیں منگوائیں اور گھر کے بچوں کو گھر سے دور کرنے کے لیے کہا۔ بچوں کو کسی رشتے دار کے ہاں بھیج دیا گیا۔

اتار شروع ہوا تو حسینہ بالکل خاموش تھی۔ عامل صاحب نے اپنی پڑھائی شروع کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تو خاموش کیوں ہے، بولتا کیوں نہیں؟ بتا، تو اس لڑکی پر کب سے اور کیوں ہے؟“

حسینہ نے مردانہ لہجے میں کہا۔ ”جب یہ دس سال کی تھی، میں تب سے اس کے عشق میں گرفتار ہوں۔ یہ گھاٹ کے سامنے والے درخت کے نیچے آکر کھیلتی تھی۔ میں اسی درخت پر رہتا تھا۔ کچھ دن پہلے دھوبی نے وہ درخت کاٹ ڈالا۔ میں نے سوچا، میں کہاں بسیرا کروں؟ میں اس سے جدا ہونا نہیں

چاہتا تھا اس لیے میں نے اس لڑکی پر ہی بسیرا کرلیا۔“

”دیکھو یہ لڑکی مسلمان ہے اور تم......؟“

”میں ہندو ہوں......“

”تو تم اس کا پیچھا چھوڑ دو......“ اس بات پر حسینہ نے عامل صاحب کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ سخت سردی میں بھی عامل کو پسینہ آگیا۔ وہ حسینہ کے باپ سے مخاطب ہوا۔

”دیکھو اس پر جو شئے ہے، وہ بہت ضدی ہے، وہ اس کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔ میرا مشورہ ہے لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ دو......“

”شاہ صاحب، میری ایک ہی بیٹی ہے، میں اسے اس حال میں دیکھ کر دکھی ہوتا ہوں۔“

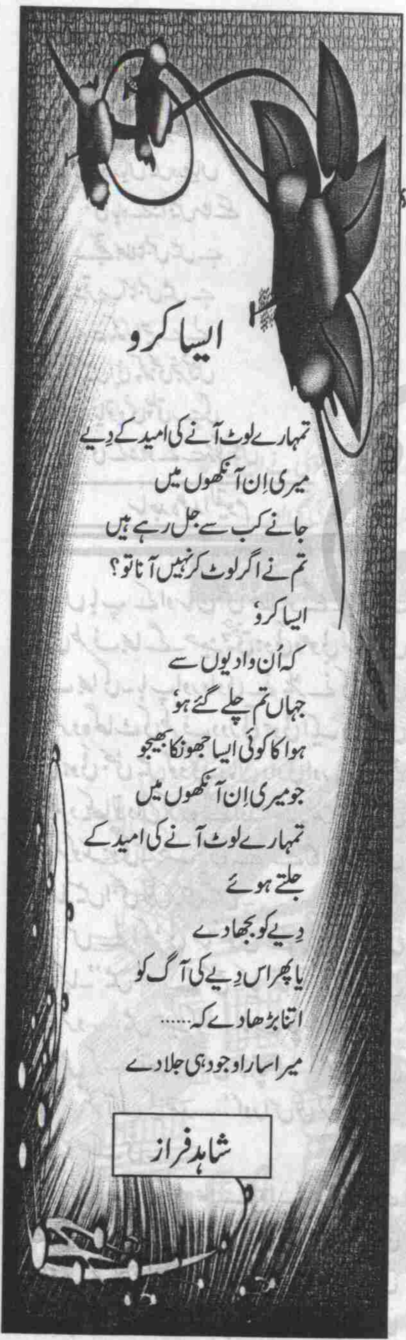
”تو ٹھیک ہے، اب جو ہونا ہے، ہو جائے......“

اگلے روز جمعرات تھی۔ عامل صاحب نماز کے بعد پڑھائی کرنے بیٹھ گئے۔ حسینہ کو زنجیر سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ اس وقت حسینہ کی سسکیاں اور آہیں وہاں موجود گھر والوں کو اداس کر رہی تھیں۔ اس کی سسکیوں میں عجیب درد تھا۔

آخر عمل شروع ہوا۔ اس کو قابو میں کرنا تھا مگر عامل صاحب پریشان تھے۔

”شاہ صاحب...... آپ بہت پریشان لگ رہے ہیں؟“ رشیدن نے پوچھا۔

”ہاں بی بی......! میں زبان کا پابند ہوں اس لیے یہ کام کر رہا ہوں مگر مجھے خطرہ نظر آرہا ہے اپنے لیے بھی، بچی کے لیے بھی۔“ ابھی عامل صاحب کو پڑھائی شروع کیے چند لمحے ہوئے تھے کہ حسینہ بے قابو ہوگئی۔ اس کے حلق سے اس طرح کی آوازیں نکلنا شروع ہوئیں کہ سب ہی لرز کر رہ گئے۔ حسینہ نے عامل صاحب کو اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے بری طرح زخمی کر دیا، وہ بے ہوش ہوگئے۔ رشیدن



دنیا

تیری یاد سے جو خلا ہوا
وہ ابھی تلک نہ بھر سکا
وہ جو دوریاں تھیں درمیاں
کبھی چاہ کے نہ انہیں مٹا سکے
نہ تجھے بھلانا بس میں ہے
نہ قریب آنا بس میں ہے
بہت کچھ کیا تیرے لیے
ہمیں اپنی کچھ بھی خبر نہیں
یہ دنیا تو یونہی چلتی رہے گی
کسی کے نہ ہونے سے رکی نہیں

ساجدہ عبدالقیوم

اور ماں باپ کے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ وہ سب باہر کی طرف بھاگے۔ حسینہ چیختی ہوئی دھوبی گھاٹ کی طرف بھاگی۔ باپ اور دادی نے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ گھاٹ کی طرف دوڑتی ہوئی ایک دھوبی کی جلتی ہوئی بھٹی میں کود گئی۔ ماں، دادی اور باپ نے یہ منظر دیکھا تو دہل کر رہ گئے اور حسینہ چند منٹوں میں جل کر کوئلہ ہو گئی۔ جب بھٹی سے اسے نکالا گیا تو اس کی سانسیں ابھی چل رہی تھیں۔

اس نے اکھڑتی سانسوں کے درمیان دادی سے کہا۔ ”میں...... نے منع کیا تھا...... اس طرح مت کرو...... میں حسینہ کو...... بہت چاہتا ہوں...... میں اس کو...... نقصان نہیں پہنچاتا...... ہمیشہ خوش رکھتا...... مگر آپ کی ضد......“ اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

اس دوران تمام علاقے والے جمع ہو چکے تھے۔ نانی کو پتہ چلا تو وہ بھی آ گئی تھیں۔ رشیدن اور اس کے ماں باپ کا برا حال تھا۔ جوان بچی کی موت پر انہیں قرار نہیں آ رہا تھا۔ نانی نے غسل کی جگہ اس کی سوختہ لاش کو تیمم کرایا کیونکہ اسے غسل نہیں دے سکتے تھے۔ کفن بھی نانی نے پہنایا۔ کوئی قریب نہیں آ رہا تھا، صرف رشیدن اور نانی نے یہ کام انجام دیا۔

نانی نے حسینہ کے باپ سے کہا۔ ”دیکھو، تم اس کو اسی جگہ دفن کرنا جہاں اس کے ارد گرد کوئی قبر نہ ہو......“ پھر اس کا جنازہ اٹھا۔ ساری رات اس علاقے میں ایک خوف طاری رہا تھا۔ بعد میں اس بھٹی سے حسینہ کے سسکنے کی آواز آئی تھی جس میں کود کر اس نے جان دی تھی۔ اس علاقے میں دھوبی نے وہ بھٹی بند کر کے دوسری جگہ بنا لی۔ مغرب کے بعد گھاٹ پر ویرانی چھا جاتی تھی۔ لوگوں نے گھاٹ کو چھوڑ کر اپنے گھروں کے سامنے گھاٹ بنا لیا۔ کچھ دن بعد حسینہ کا باپ بیٹی کی محبت میں روتا ہوا قبر پر گیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا، وہاں قبر کا نشان تک نہ تھا۔ رشیدن نے روتے ہوئے نانی سے پوچھا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ نانی نے حساب کتاب کر کے بتایا۔ ”وہ اسے لے گیا ہے۔ اب تم لوگ اس کے لیے کوئی پڑھائی وغیرہ مت کرو کیونکہ وہ ہندو ذات سے تھا۔ قبر پر جا کر کچھ نہ پڑھو۔“

وقت گزرتا گیا، چند سال بعد دھوبی گھاٹ ختم ہو گیا۔ دھوبی بھی ادھر سے چلے گئے۔ نانی اور نانا کے انتقال کے بعد ماموں نے بھی وہ گھر بیچ دیا۔ یہ واقعہ سنانے کے بعد نانی نے ہم سب بچوں کو تاکید کی کہ سب نماز کی پابندی کرو، قرآن دل لگا کر پڑھو، پاک وصاف رہو، جب گھر سے نکلو خاص طور پر مغرب کے وقت یا دن کے بارہ بجے، رات کے بارہ بجے اپنے اوپر چاروں قل، آیت الکرسی کا حصار کھینچ کر نکلو۔ خداوند کریم ہماری سب بچیوں اور بچوں کو ان بلاؤں کے شر سے محفوظ رکھے۔ (آمین!)

ارواح کہانی

کہنے والے کہتے ہیں، جن انسانوں کو زندگی میں چین نہ ملے اکثر اوقات ان کی ارواح مرنے کے بعد بھی بھٹکتی رہتی ہیں، ایسی ہی ارواح کی چشم کشا کہانیاں

انور فرہاد

موہنی

”نہیں...... نہیں...... موہنی...... نہیں“، وہ دونوں گڑگڑا رہے تھے مگر موہنی نے ان کی التجا پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اگلے لمحے وہ آگ کے پیکر میں تبدیل ہو گئی تھی اور......

موہنی جسے مار دیا گیا تھا مگر وہ سراپا انتقام بن کر واپس آ گئی تھی



"کون ہے......؟ کون ہے......؟"

اس آواز پر عبداللہ ایک دم چونک پڑا تھا اور اپنی بیوی کو جو اس سے چپکی ہوئی تھی' پرے کرتے ہوئے مخاطب کیا۔ "کون ہے؟ کہاں ہے؟ کیسے دیکھ لیا تم نے؟"

عبداللہ کی بیوی مریم لمبی لمبی سانس لیتے ہوئے بولی۔ "مجھے لگا جیسے کمرے میں کوئی ہے......"

"کمرے میں کوئی ہے؟" یہ جملہ سوالیہ انداز میں دہراتے ہوئے عبداللہ نے لائٹ آن کر دی۔ سیور کی دودھیا روشنی میں کمرہ جگمگا گیا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ مریم کے چہرے پر خجالت کی پرچھائیاں سی نظر آئیں مگر اب بھی اس کا خوف دور نہیں ہوا تھا۔ "کمرے کا دروازہ بند ہے۔" عبداللہ نے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "پھر بھلا کون آ سکتا ہے کمرے میں؟" مریم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد عبداللہ دوبارہ بولا۔ "تم نے خواب دیکھا ہوگا۔"

"نہیں......" مریم اس کے اور قریب ہو گئی۔ "میں سو نہیں رہی تھی' جاگ رہی تھی۔" اس نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔ "مجھے محسوس ہوا جیسے دروازے کے قریب سے کوئی ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔"

"تم نے کسی کو دیکھا تھا؟"

"نہیں' میرا چہرہ اس طرف نہیں تھا' مجھے بس ایسا لگا تھا جیسے کوئی چلتا ہوا ہماری طرف آ رہا ہے۔"

"ایسا لگا...... یوں محسوس ہوا......" عبداللہ نے بیوی کے جملے دہراتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارا وہم ہے اور کچھ نہیں۔ تم نے تو دیکھ بھی لیا کہ کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ چلو اب ایسے خیالات کو ذہن سے جھٹک کر سو جاؤ۔" مریم ایک بار پھر شوہر سے چپک گئی تھی۔

مریم کوئی ڈرپوک یا کمزور دل کی مالک نہیں تھی لیکن ادھر کچھ دنوں سے وہ اکثر اسی طرح چونک کر خوف زدہ ہو جاتی تھی۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے کوئی اس کی طرف آ رہا ہے۔ وہ جو محاورہ ہے کہ پتہ کھڑکا دل دھڑکا تو آج کل وہ اسی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ پہلے پہل تو عبداللہ یہی سمجھا تھا کہ کراچی کے مخدوش حالات نے اس کے دل و دماغ پر کچھ زیادہ ہی اثر کیا ہے۔ اسے بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چپکے سے آ کر مار دے گا یا پکڑ کر لے جائے گا اور مار کر کہیں پھینک دے گا۔ اخبار میں وہ ایسے واقعات پڑھتی اور ٹی وی پر دیکھتی تھی۔ عبداللہ نے ایک دو بار اس سے کہا بھی کہ وہ اخبار نہ پڑھا کرے اور ٹی وی نیوز بھی نہ دیکھا کرے۔ اس بات پر مریم نے کسی قدر عمل بھی کیا تھا اس کے باوجود اس کے ڈرنے کا سلسلہ جاری رہا تھا اور پھر ایک دن یوں ہوا کہ عبداللہ کو خود محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی چل رہا ہے۔ وہ اس وقت جاگنے اور سونے کی درمیانی کیفیت میں تھا۔ اس نے ذہن کو جھٹکا اور ادھر غور سے دیکھا۔ اسے کمرے میں ایک سایہ نظر آیا تھا۔ وہ سایہ جب ذرا اور قریب آیا تو اس کے چہرے کی ایک جھلک نظر آئی تھی اور عبداللہ کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

"موہنی......! تم......" اس کے ساتھ ہی مریم اس کے پہلو میں کسمسائی اور شکایت بھرے لہجے میں منمنائی۔ "اب وہ تمہیں خواب میں بھی نظر آنے لگی؟"

اگلے لمحہ کمرے میں کوئی نہیں تھا جبکہ دروازہ کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور عبداللہ سوچ رہا تھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ویسے اس نے مریم پر یہی ظاہر کیا تھا جیسے وہ واقعی خواب دیکھ رہا ہے ہو۔

صبح مریم' عبداللہ کو چھیڑ رہی تھی۔ "وہ موہنی ابھی تک تمہارے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ اب اسے بھول جاؤ۔"

"یار' کوئی اگر بغیر اجازت کے خوابوں میں آ جائے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟" کہنے کو تو اس نے یہ بات کہہ دی مگر دن بھر وہ یہی سوچتا رہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ موہنی بھلا کیسے آ سکتی ہے؟ اسے اب رہ رہ کر یہی خیال آنے لگا کہ مریم جو اچانک چونک پڑتی ہے اور اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے تو کہیں وہ موہنی ہی تو نہیں؟ مگر...... مگر...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے چاہا کہ اس سلسلے میں وہ مریم سے بات کرے مگر بس یہی سوچ کر رہ گیا کہ وہ پہلے ہی ڈری ہوئی ہے اور ڈر جائے گی اور پھر ایک دن خود مریم ہی نے بات کچھ یوں چھیڑ دی تھی۔

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ہم بچ نہیں سکیں گے۔"

"ارے یار' تم خوامخواہ ڈر رہی ہو' تمہارے بھائی کے گر گے......"

"وہ نہیں......"

"پھر کون؟"

"موہنی...... موہنی ہمیں مار دے گی۔"

"پاگل ہوئی ہو۔" یہ کہتے ہوئے عبداللہ نے قہقہہ لگایا تھا۔ اگرچہ یہ قہقہہ اسے خود بھی بڑا کھوکھلا لگا تھا۔ "موہنی بھلا ہمیں کیسے مار سکتی ہے؟ وہ تو......"

"ہاں' مجھے علم ہے' میں جانتی ہوں' تم جو کہہ رہے ہو' وہ غلط نہیں ہے لیکن میں جو کہہ رہی ہوں' یہ بھی غلط نہیں ہے۔ موہنی ہمارا پیچھا کر رہی ہے' جس روز اسے موقع مل گیا' وہ ہمارا آخری دن ہوگا۔"

"شک اور بدگمانی کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا پھر میں تمہیں اُس سے کیسے نجات دلا سکتا ہوں؟"

"شک نہیں' یہ سچ ہے' اب مجھے وہ رات ہی کے وقت نہیں' دن میں بھی اپنے اردگرد نظر آنے لگی ہے' بس جس دن اسے موقع ملا......"

"تو وہ تمہارا آخری دن ہوگا۔" عبداللہ نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا تھا۔

"میرا مذاق نہ اڑاؤ جانو...... میں سچ مچ بہت پریشان ہوں۔" مریم سنجیدہ لہجے میں بولی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ سنجیدہ تو عبداللہ بھی تھا' اسے خود بھی اب یقین ہونے لگا تھا کہ موہنی ان کا پیچھا کر رہی ہے اور جس دن اسے موقع ملا' وہ انہیں مار ڈالے گی۔

•......•......•......•

موہنی' عبداللہ کی پہلی بیوی تھی۔ اپنے نام کی طرح من موہنی شکل و صورت کی مالک' وہ ہر طرح سے اچھی تھی' بس اس میں خرابی یہ تھی کہ شادی کے کئی سال گزرنے کے باوجود وہ ماں نہیں بن سکی تھی۔ اپنے شوہر کو باپ کا درجہ نہیں دے سکی تھی لہٰذا عبداللہ نے اس کا علاج یہی سوچا کہ اسے دوسری شادی کر لینی چاہیے اور پھر اسی دوران میں عبداللہ اور مریم کے درمیان محبت کا چکر بھی چل گیا۔ اس نے موہنی کو بھی یہی سمجھانے کی کوشش کی اور اُس سے دوسری شادی کی اجازت مانگی۔

"تم کو میری طرف سے ایک نہیں' دو' تین' چار شادیوں کی اجازت ہے مگر......"

"مگر کیا......؟"

"پہلے تم مجھے طلاق دے دو۔" موہنی نے بہت رسان سے کہا تھا۔

یہ طلاق کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا تھا۔ حق مہر عبداللہ کی استطاعت سے بہت زیادہ تھا چونکہ موہنی کے بھائی بڑے پیسے والے خوش حال لوگ تھے اس لیے انہوں نے اپنی حیثیت کے پیشِ نظر اپنی بہن کا ٹھیک ٹھاک مہر رکھوایا تھا۔ اتنی بڑی رقم وہ کہاں سے لاتا؟ اس لیے وہ عجیب تذبذب میں مبتلا ہو گیا' دوسری طرف مریم کا یہ تقاضہ بڑھنے لگا کہ اگر تم نے نکاح میں زیادہ دیر لگائی تو کوئی اور میری ڈولی اٹھا کر اپنے گھر لے

جائے گا۔ بہت سوچ بچار کے بعد عبداللہ نے یہی فیصلہ کیا کہ موہنی کو بڑی خاموشی کے ساتھ راستے سے ہٹا دینا چاہیے پھر ایک رات اس نے موہنی کا گلہ دبا کر اسے مار دیا...... اور قبرستان لے جا کر ایک پرانی اور ٹوٹی پھوٹی قبر میں اُس کی لاش پھینک دی...... "لیکن دن کے وقت اگر کسی کو اس کی لاش نظر آ گئی تو......؟" یہ سوچ کر اُس نے سوکھے پتے اور لکڑیاں جمع کر کے اس قبر کے اندر ڈالی تھیں اور پھر پیٹرول کے ذریعے اس میں آگ لگا دی اور چپکے سے وہاں سے کھسک گیا۔ جب آگ کے شعلے بلند ہوئے تو کچھ لوگوں کو خبر ہوئی مگر وہ مارے خوف کے قبرستان میں جا کر آگ نہ بجھا سکے۔

"اللہ کے معاملے میں ہمیں دخل نہیں دینا چاہیے۔ یہ عذابِ قبر ہے۔ کسی کو اس کے گناہوں کی سزا دی جا رہی ہے۔" یہ سوچ کر کوئی قبر کے قریب نہیں گیا تھا البتہ صبح کو گورکنوں نے اس قبر کو تازہ مٹی ڈال کر بند کر دیا تھا۔

عبداللہ نے موہنی کے بارے میں یہ مشہور کر دیا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے مگر اس کے بھائیوں نے اپنی بہن کے خلاف یہ الزام ماننے سے انکار کر دیا تھا اور تھانے جا کر رپورٹ لکھوائی تھی کہ اُن کے بہنوئی نے اُن کی بہن کو قتل کر دیا ہے لیکن سر توڑ کوشش کے باوجود پولیس کو کوئی ثبوت نہیں ملا تھا اور پھر کچھ دنوں کے بعد جب یہ معاملہ ٹھنڈا ہو گیا تھا تو عبداللہ نے مریم سے دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ بات صرف اس کی پرانی محبوبہ اور نئی بیوی مریم کو معلوم تھی کہ موہنی کہیں بھاگی نہیں، عبداللہ نے اسے زندگی سے اتنی دور بھگا دیا ہے جہاں سے وہ کبھی واپس نہیں آ سکے گی۔

مریم سے شادی کے بعد عبداللہ کو موہنی کے بھائیوں کی طرف سے ہر وقت یہ خوف لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے اسے اور مریم کو قتل نہ کروا دیں لہٰذا وہ ایک روز چپکے سے اپنا علاقہ اور گھر چھوڑ کر مریم کے ساتھ لاہور چلا آیا۔ اس کا خیال تھا کہ لاہور ایک بڑا شہر ہے اُس کے پنڈ جیسا چھوٹا سا علاقہ نہیں۔ یہاں ہم دونوں میاں بیوی بے کھٹکے رہ سکیں گے۔ یہاں اسے ایک بہت اچھا ٹھکانہ مل گیا تھا۔ جس فیکٹری میں اسے کام ملا اس کے مالک نے اسے ایک تین منزلہ عمارت کی اوپری منزل پر اسے ایک فلیٹ دلوا دیا تھا۔ مالک کی فیکٹری یہاں سے قریب ہی تھی اور وہ ہر وقت مالک کو دستیاب ہو سکتا تھا۔ مریم بھی یہاں آ کر بہت خوش تھی کہ اب اچانک ہی موہنی کی روح یا پھر بدروح کی آمد اور انہیں دکھائی دینے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

•......•......•......•

اُس رات وہ دونوں پڑوس میں ہونے والی ایک چھوٹی سی تقریب میں گئے تھے۔ واپس آئے تو دیکھا، فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ دونوں یہی سمجھے تھے کہ ان کی غیر موجودگی میں چور گھر کا صفایا کر گیا ہے مگر جب اندر داخل ہوئے تھے تو گھر کی ہر چیز موجود تھی، اپنے کمرے میں گئے تھے تو بتی جل رہی تھی اور ان کے بیڈ پر کوئی لیٹا ہوا تھا۔

"کون ہو تم؟" دونوں میاں بیوی بیک وقت بول پڑے تھے اور پھر جب لیٹنے والے نے کروٹ بدل کر ان کی طرف دیکھا تھا تو انہیں اپنے دل کی دھڑکنیں بند ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ مریم کو چکر آ گیا تھا۔ وہ گرنے ہی والی تھی کہ عبداللہ نے اسے سنبھال لیا تھا اور پھر جو اُن کی نظر پلنگ پر گئی تھی تو وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ مریم کو جیسے ہی ہوش آیا اس نے پوچھا تھا۔

"وہ موہنی کہاں گئی؟"

"غائب ہو گئی۔" عبداللہ نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا تھا۔

"یہ گھر اب ہمارے رہنے کے قابل نہیں رہا، اسے چھوڑ کر کہیں اور چلو۔" مریم نے ڈری ہوئی آواز میں کہا تھا۔

•......•......•......•

اس نئے علاقے اور نئے فلیٹ میں شفٹ ہوئے انہیں ابھی کچھ دن ہی ہوئے تھے کہ ایک رات جب وہ بے خبر سو رہے تھے کہ کمرے میں اچانک جیسے ایک دھماکہ ہوا تھا۔ دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے تھے اور ان کی نظر کمرے کے وسط میں کھڑی موہنی پر پڑی تھی۔

"مجھے غور سے دیکھو...... آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھو...... میں موہنی ہی ہوں، کوئی اور نہیں......" موہنی کی بدروح یا بھوت جو اس وقت مکمل انسانی پیکر میں تھا، کہہ رہا تھا۔

"موہنی......! ہمیں معاف کر دو۔" عبداللہ نے لرزیدہ آواز میں کہا تھا۔ "یہاں سے چلی جاؤ۔"

"تم لوگوں کا جرم معاف کرنے کے قابل نہیں اور اب میں یہاں تم لوگوں کو اپنی جھلک دکھا کر واپس جانے کے لیے نہیں آئی ہوں۔ تم لوگوں نے مجھے جس بے دردی سے مارا تھا اور......"

"میں نے نہیں......" مریم نے فوراً ہی قطع کلامی کرتے ہوئے کہا تھا۔ "اس نے مارا ہے تمہیں۔"

"تو نے نہیں مارا...... لیکن تیری وجہ سے تو مارا...... میں تجھے بھی نہیں چھوڑوں گی۔"

"اتنے دنوں تک جب تم نے ہمیں نہیں مارا تو اب کیوں مارنا چاہتی ہو؟" عبداللہ پھر گھگھیایا تھا اور اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔ "خدا کے لیے، ہمیں معاف کر دو۔"

"معاف تو میں تم لوگوں کو کسی حال میں بھی نہیں کر سکتی، تمہیں اُس وقت اللہ یاد نہیں آیا تھا جب تم نے مجھے بڑی بے دردی سے گلہ گھونٹ کر مارا تھا اور پہلے تمہیں نہ مارنے کی وجہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل، کھیل رہی تھی، تمہیں خوف اور دہشت میں مبتلا کر کے تم لوگوں کا صبر و سکون تہ و بالا کر رہی تھی ورنہ میں پہلی ملاقات ہی میں تم لوگوں کا کام تمام کر سکتی تھی مگر میں نے ایسا نہیں کیا چونکہ میں جس انتقام کی آگ میں جل رہی ہوں، تم لوگوں کو اسی آگ کا ایندھن بنانا چاہتی تھی جس طرح تم نے مجھے مارا تھا، میں بھی اسی طرح تمہیں مارنا چاہتی ہوں۔ مجھے گلہ دبا کر مارنے کے بعد بھی تمہیں سکون نہیں ملا تھا اس لیے تم نے میرے مُردہ جسم کو بھی جلا کر راکھ کر دیا تھا۔" اتنا کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے رکی تھی۔ اس نے دونوں پر نظر ڈالی تھی۔ ان کا رنگ فق تھا، سارا بدن دہشت سے کانپ رہا تھا۔ ان کی اس کیفیت سے گویا لطف لیتے ہوئے وہ بولی تھی۔ "تم لوگوں نے تو مجھے مار کر جلایا تھا لیکن میں تمہیں زندہ جلاؤں گی......"

"نہیں...... نہیں...... موہنی......! نہیں......" وہ دونوں روتے ہوئے گڑگڑا رہے تھے مگر موہنی نے ان کی التجا پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اگلے لمحے وہ خود سر سے پیر تک آگ میں جلتے ہوئے پیکر میں تبدیل ہو گئی تھی اور اسی حالت میں ان دونوں کی طرف بڑھی تھی۔

•......•......•......•

اس فلیٹ میں لگنے والی آگ پر قابو پانا بہت مشکل تھا، فائر فائٹرز نے بہت کوشش کی تھی مگر ناکام رہے تھے۔ اس فلیٹ کی ہر چیز اور اس کے رہائشی جل کر خاکستر ہو چکے تھے...... بعد میں اس آتشزدگی کی وجہ شارٹ سرکٹ کو قرار دیا گیا تھا۔

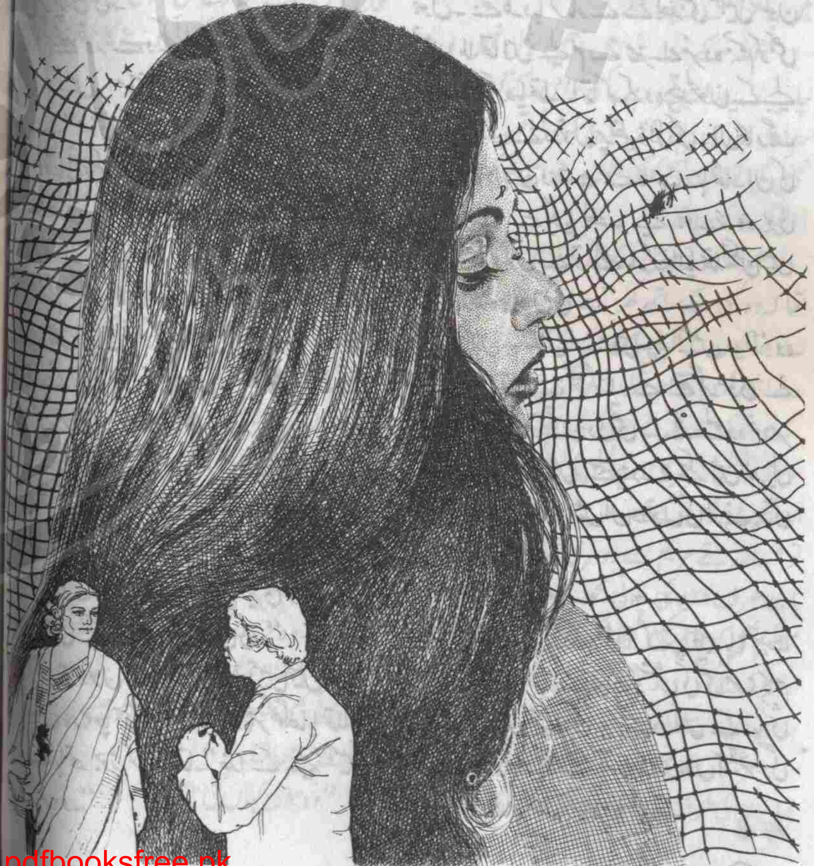
☆☆

وہ کون تھی؟

سدرہ انور علی

وہ گھر کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی اور مجھے گھور رہی تھی۔ مجھ میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں تھی اگر وہ چاہتی تو ایک سیکنڈ میں مجھے نقصان پہنچا سکتی تھی، یکا یک مجھے......

اُس بھٹکتی روح کا ہول ناک قصہ جو ایک نوجوان کے پیچھے پڑ گئی تھی



یوں تو ہر انسان کی زندگی میں بہت سے واقعات پیش آتے ہیں لیکن کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جنہیں چاہنے کے باوجود بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ہمارے دل و دماغ پر ایسے نقوش چھوڑ جاتے ہیں جو مٹائے نہیں مٹتے۔ ایسا ہی ایک واقعہ تقریباً ایک سال قبل میرے ساتھ پیش آیا جو مجھ سے بھلائے نہیں بھولتا یوں لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔

.....•.....•.....•.....•

وہ اتوار کا دن تھا' اس دن تو ویسے بھی چھٹی ہوتی ہے۔ میں' میرے تین دوستوں اور مجھ سے چھوٹے دو بھائیوں نے قریبی پارک میں کرکٹ کھیلنے کا پروگرام بنایا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم صبح آٹھ بجے گھر سے نکلے۔ جب ہم پارک پہنچے تو میری نظر پارک کے دروازے کے ساتھ پڑے بالوں پر پڑی' وہ انسانی بال تھے اور کسی عورت کے تھے' تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبے بال...... میرے علاوہ اور کسی نے ان بالوں پر دھیان نہیں دیا تھا۔ بالوں کو دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ یہ بال یہاں کس نے پھینکے ہیں؟ میں روز ہی اس پارک میں آتا تھا اور کبھی اس قسم کی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی کیونکہ پارک میں صفائی کا بے حد خیال رکھا جاتا تھا۔ میں اسی سوچ میں گم تھا کہ میرے چھوٹے بھائی ارشاد نے پکارا۔

''بھیا' آپ ابھی تک یہیں کھڑے ہیں' آؤ' ہم نے کرکٹ شروع کر دی ہے۔''

''ارشاد' یہ بال دیکھو' یہ کیسے ہیں اور یہاں پہ کیوں؟'' میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

بال دیکھ کر وہ ہنسنے لگا۔ ''بھیا' آپ بھی نا بس' پچھلے دس منٹ سے انہی بالوں کے پیچھے پڑے ہیں' ضرور کسی بیوٹیشن نے یہاں پھینکے ہوں گے۔''

''لیکن ارشاد' یہاں آس پاس کوئی پارلر وغیرہ نہیں ہے اور ویسے بھی لڑکیاں سر کے بال بالکل صاف نہیں کرواتیں؟'' اتنے میں دوسرے دوست بھی آ گئے۔ بات ان کے علم میں بھی آئی اور سب نے میرا مذاق بنایا کہ یہاں پہ بالوں کا ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے اور پھر سب وہاں سے چلے گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر بالوں کو چھونا چاہا تو اس میں سے عجیب سی بو آنے لگی اور عجیب بات یہ ہوئی کہ بالوں میں حرکت ہوئی اور وہ سرک کر آگے ہو گئے۔ یہ منظر میرے اوسان خطا کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں فوراً وہاں سے بھاگ آیا اور گھر آ کر سانس لی پھر دو دن تک پارک نہیں گیا۔

تیسرے دن ڈر ختم ہوا تو شام میں دوستوں کے ساتھ پارک کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔ کھیل شروع ہوا۔ ایک دوست نے چھکا لگایا تو گیند اڑ کر درختوں کے جھنڈ میں چلی گئی۔ گیند اٹھانے کے لیے میں درختوں کے پاس گیا تو میں نے جو کچھ دیکھا' اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ درختوں کے پاس ایک گڑھا تھا اور اس میں ایک عورت کا کٹا ہوا سر پڑا ہوا تھا۔ سر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سر کچھ اس انداز میں پڑا ہوا تھا کہ اس عورت کا چہرہ دوسری طرف تھا اور مجھے صرف بال نظر آ رہے تھے۔ میں بدحواس سا ہو کر وہاں سے ایسا بھاگا کہ گھر آ کر دم لیا۔

انسانی سر بغیر جسم کے؟ یہ سب کیا معاملہ تھا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پورے چار دن میں بخار میں جلتا رہا پھر میں نے آئندہ اس پارک میں جانے سے توبہ کر لی۔ اگلے روز دوپہر کے وقت میں کچھ لینے کے لیے باہر نکلا ہی تھا کہ ہمارے گھر کے دروازے کے بالکل ساتھ وہی سر پڑا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر میں اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ دوڑ کر اندر چلا گیا اور اپنے کمرے میں جا کر اندر سے

لاک لگا دیا۔ میرا ذہن بدستور اسی سر کی طرف اٹکا رہا کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ شام تک مجھے پھر بخار نے آلیا اور میری حالت بہت خراب ہوگئی۔ شام کو کمرے سے باہر نکلا تو امی میری طرف دیکھ کر چونک گئیں۔

''اشفاق بیٹے' یہ تمہارا چہرہ اتنا سرخ کیوں ہو رہا ہے اور طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟''

''جی امی......! مجھے پھر ٹمپریچر ہوگیا ہے' بس اسی وجہ سے......''

''بیٹا' پہلے تو تم کبھی اس طرح بیمار نہیں ہوئے' میں تو تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہوں۔''

ابو نے میری حالت دیکھی۔ مجھے مسجد لے گئے اور مولوی صاحب سے دَم کروایا۔ وہ شاید اصل معاملہ بھانپ گئے تھے لہٰذا دم کر کے بولے۔

''اب جب کوئی ایسا معاملہ ہو تو میرے پاس چلے آنا۔''

مولوی صاحب کے دَم سے میں دو دن میں بالکل ٹھیک ہوگیا لیکن اب میں باہر کم ہی جاتا تھا۔ کالج یا پھر نماز کے علاوہ کہیں نہیں جاتا تھا کیونکہ میرے دل میں بہت زیادہ ڈر بیٹھ گیا تھا۔ میری راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ اکثر راتوں کو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا' یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر جگایا ہو۔ ان دنوں جو میری حالت تھی' اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔

ایک روز عجیب واقعہ ہوا' وہ سردیوں کے دن تھے' سرِ شام سے ہر طرف دھند پھیل جاتی تھی اور سڑکوں پر سناٹا چھا جاتا تھا۔ مغرب کا وقت قریب تھا اور میں سودا سلف خرید کر اپنے گھر جا رہا تھا۔ راستے میں وہی پارک پڑتا تھا۔ ابھی میں اس پارک سے سات' آٹھ قدم کی دوری پر تھا کہ اچانک میرے سامنے ایک لڑکی آگئی۔ وہ پارک کے دروازے پر کھڑی تھی' سفید لباس میں ملبوس تھی اور میری طرف اس کی پشت تھی' اس کا چہرہ دوسری طرف تھا پھر مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا' وہ لڑکی الٹے قدموں چلتی ہوئی میرے نزدیک آنے لگی۔ قدم بہ قدم وہ میرے قریب آتی جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میں وہاں سے سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا پھر میں نے ایک اور ناقابلِ یقین منظر دیکھا' وہ لڑکی اڑتی ہوئی ہوا میں معلق ہوگئی تھی۔ یہ دہشت ناک نظارہ میرے ہوش و حواس گم کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں کس طرح گھر پہنچا' مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔

پھر تو روز ہی ایسا ہونے لگا' مجھے ہر طرف وہ لڑکی نظر آنے لگی جہاں بھی میں جاتا' وہ لڑکی میری طرف پشت کیے جیسے میری منتظر ہوتی۔ اسے دیکھ کر میرا جو حال ہوتا تھا' وہ بیان سے باہر ہے۔ میں خوف سے کانپنے لگتا اور جسم پسینے میں بھیگ جاتا۔ کچھ سجھائی نہ دیتا تو اپنے ہی بال مٹھی میں جکڑ لیتا پھر مجھے خواب میں بھی وہ لڑکی پریشان کرنے لگی تھی۔ اس صورت حال سے میں بہت تنگ آچکا تھا۔ اس دوران مجھے مسجد والے مولوی صاحب کا خیال بھی آیا کہ ان کے پاس جا کر اپنا مسئلہ رکھوں مگر جانے کیا بات تھی کہ میرے قدم مسجد کی جانب اٹھتے ہی نہیں تھے۔ میری نمازیں بھی قضا ہو رہی تھیں۔

اس روز میرے ایک دوست کی سالگرہ تھی۔ وہ میرے بہترین دوستوں میں سے تھا۔ میرا جانا لازمی تھا۔ اس نے بہت اصرار کے ساتھ مجھے بلایا تھا۔ برتھ ڈے کی یہ تقریب تقریباً آدھی رات کو ختم ہوئی تھی' واپسی میں اپنی موٹر بائیک پر میں گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک مجھے لگا جیسے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہو۔ اس احساس کے ساتھ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے بائیک کی رفتار مزید تیز کر دی۔ جیسے ہی میں اپنی گلی میں مڑا تو میری آنکھوں نے ایک ہیبت ناک منظر دیکھا' میرے گھر کے دروازے کے باہر ایک بھیانک شکل کی عورت کھڑی تھی' اس کا جسم کالے لبادے میں چھپا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں اور دانت دور سے ہی چمک رہے تھے' وہ میرے گھر کے دروازے کے بالکل سامنے کھڑی تھی اور میری طرف غضب ناک نظروں سے گھور رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میں نے بائیک کے بریک لگا دیئے۔ وہ مسلسل مجھے گھور رہی تھی۔ مجھ میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں تھی پھر میں نے اپنی بائیک موڑی اور کچھ دور جا کر مدد کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید کوئی شخص نظر آجائے لیکن اس وقت وہاں کوئی نہ تھا' مایوس ہو کر میں پھر گلی میں آیا۔ وہ وہیں چپکی کھڑی تھی۔ اگر وہ چاہتی تو ایک سیکنڈ میں میرے قریب آکر مجھے نقصان پہنچا سکتی تھی لیکن پتہ نہیں' وہ کیا چاہتی تھی کہ وہیں کھڑی تھی۔ یکایک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے آیت الکرسی کا وِرد شروع کر دیا اور اپنے اوپر پڑھ کر پھونکنے لگا۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ جو کوئی مصیبت و پریشانی کے وقت آیت الکرسی پڑھے تو اس پر موت کے سوا کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوتی۔ آیت الکرسی پڑھتے ہوئے میں نے سامنے دیکھا تو وہ گھر کے دروازے سے ہٹ گئی اور غائب ہوگئی۔ میں تیزی سے دروازے کے قریب آیا اور کال بیل بجا دی۔ دروازہ میرے بھائی ارشاد نے کھولا جب میں اندر داخل ہو رہا تھا تو مجھے ایک آواز سنائی دی۔

''اشفاق! آج تو تم مجھ سے بچ گئے۔ اگر تم آیت الکرسی کا وِرد نہ کرتے تو تمہاری خیر نہیں تھی۔ آج تمہیں مجھ سے کوئی نہیں بچا سکتا لیکن کب تک بچو گے؟'' پھر ایک زوردار قہقہہ سنائی دیا۔ میں چونک کر دروازے پر ہی رک گیا تو میرا بھائی حیرانگی سے بولا۔

''بھیا! آپ رک کیوں گئے؟'' میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا کہ اس نے یہ آواز نہیں سنی تھی۔ میں کمرے میں آتے ہی بستر پر گر گیا۔ میرے اوسان بحال نہیں ہو رہے تھے اور پھر ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔

فجر کی نماز کے وقت میں ڈرتے ہوئے اٹھا۔ معوذتین اور آیت الکرسی اپنے اوپر دَم کی اور مسجد چلا آیا۔ نماز کے بعد تمام کہانی مولوی صاحب کے گوش گزار کر دی۔ ساری بات سن کر انہوں نے مجھ پر دَم کیا اور ایک تعویذ دیا۔

''تعویذ موم جامہ کر کے گلے میں پہن لینا پھر کبھی تمہارے ساتھ یہ واقعات نہیں ہوں گے اور نہ ہی تمہیں ڈر لگے گا۔''

اس تعویذ کی برکت سے واقعی پھر کبھی میرے ساتھ ایسے واقعات پیش نہیں آئے اور نہ ہی وہ عورت دوبارہ دکھائی دی لیکن میں یہ معمہ آج تک نہیں حل کر سکا کہ وہ عورت کون تھی اور کیوں میرے پیچھے پڑ گئی تھی؟ جو کچھ میں نے اپنی کہانی میں بیان کیا ہے' وہ سب کچھ من و عن سچ ہے۔ اب آپ خواہ اس پر یقین کریں یا نہ کریں' آپ کی مرضی......!

٭٭

سہارا

آنکھیں میری نم ہوگئیں
کوئی پوچھنے والا نہ تھا
دھڑکنیں گم ہوگئیں
کوئی دیکھنے والا نہ تھا
جسم ہلکان ہوگیا
کوئی ہمارا نہ تھا
چلتا رہا میں دربدر
امیدوں کا سہارا نہ تھا

زوبیا ماہی۔ ملائیشیا

جادو ٹونے کی حقیقت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے انسان کو تباہ و برباد کر دینے والے
اس عمل سے جڑی ان کہانیوں کے کچھ کردار اصل زندگی سے جڑے ہوئے ہیں





عقیلہ حق

آدمی یا انسان؟

بابو اچانک اُٹھے اور کہنے لگے کہ میں نہاؤں گا مجھے اپنے آپ میں سے شدید بدبو آ رہی ہے اور پھر بابو کے جسم کی بدبو سارے گھر میں پھیل گئی۔ امی نے جلدی سے......

ایک ایسے شخص کا ماجرا جس کا کفن دفن تیار تھا مگر زندگی باقی تھی

جس طرح بہت سارے لوگ جادو' سفلی اور عملیات وغیرہ کو نہیں مانتے' میرے والد بھی نہیں مانتے تھے بلکہ اگر کوئی اُن سے کبھی جادو وغیرہ کی بات بھی کرتا تو یا تو مذاق اڑاتے یا پھر ناراض ہو جاتے تھے لیکن پھر حالات نے اُن کو وہ کچھ دکھایا کہ انہیں بھی ماننا پڑا کہ دنیا میں ابلیسی قوتیں بھی موجود ہیں اور ان ہی شیطانی قوتوں کا ایک ہتھیار جادو ٹونہ بھی ہے۔ میں اپنے والد کی کہانی شروع سے آپ کو بتاتی ہوں۔

میرے والد صاحب اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ میرے دادا کا تعلق ایک مڈل کلاس گھرانے سے تھا۔ میرے والد جنہیں ہم بابو کہتے ہیں' اُن کی منگنی بچپن ہی میں ماموں زاد کزن ثوبیہ سے ہو گئی تھی۔ جس زمانے میں منگنی ہوئی تو بابو کے ماموں بھی ایک سفید پوش گھرانے کے سربراہ تھے۔ بابو جی بچپن ہی سے بہت ذہین تھے۔ نوجوانی میں وہ عجیب سحر انگیز شخصیت کے مالک تھے' وہ بہت خوبصورت' مردانہ وجاہت کے مالک' سمجھدار آدمی تھے اور گفتگو میں بھی کمال رکھتے تھے لیکن مالی طور پر کافی کمزور تھے اور اسی بات کو بنیاد بنا کر ان کے ماموں نے اپنی بیٹی ثوبیہ کی منگنی توڑ کر اس کی شادی ایک بہت مال دار آدمی سے کر دی تھی۔

میرے والد کو اس منگنی کے ٹوٹنے کا بہت صدمہ ہوا اور انہوں نے اپنی زندگی بنانے کے لیے اپنا کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا۔ بابو جی ڈائمنڈ جیولری بنانے کے ماہر کاریگر تھے' چنانچہ انہوں نے اسی کام کو بطورِ کاروبار اپنایا اور شب و روز محنت میں لگ گئے۔ میری دادی' بھائی کے رویئے سے اس قدر دلبرداشتہ ہوئیں کہ پھر انہوں نے خاندان میں میرے والد کی شادی ہی نہیں کی بلکہ اپنی اکلوتی بہو غیروں میں سے لے کر آئیں۔

میری امی ایک نیک' فرماں بردار' خدمت گزار اور تابع دار بہو تھیں۔ اُن کے آنے سے گھر میں ہن برسنے لگا' میرے والد کا کاروبار تیزی سے ترقی کرنے لگا' چاروں طرف سے دولت آ رہی تھی۔ اللہ نے میرے والد کو نیک بیوی' اولاد' مال' عزت ہر چیز سے نواز دیا جبکہ آنٹی ثوبیہ کی شادی جن صاحب سے ہوئی' انہیں کاروبار میں پے در پے نقصان اٹھانا پڑے اور پھر اُن کو ایک جان لیوا بیماری لگ گئی جس سے وہ چند سالوں میں اللہ کو پیارے ہو گئے اور ثوبیہ آنٹی اپنے دو بچوں کے ساتھ واپس اپنے باپ کے گھر آ گئیں۔ میری دادی نے بیٹے کی منگنی ٹوٹنے کے بعد اپنے بھائی سے تمام تعلقات ختم کر دیئے تھے حتیٰ کہ خوشی اور غمی کا بھی تعلق نہیں رہا تھا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ دادی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ہمارا نیا گھر بنگلے کی صورت بن گیا تھا اور امی نے نئے گھر کی خوشی میں محفلِ میلاد رکھی تھی۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میری امی فطرتاً بہت نیک اور درگزر کرنے والی خاتون تھیں تو امی نے بابو جی سے کہا۔ "اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اللہ نے آپ کو بہت نوازا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ اپنے ماموں کو معاف کر دیں اور اس خوشی کے موقع پر اُن کو بھی دعوت دے دیں۔"

بابو جی' امی کی بات کا بہت احترام کرتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "جو آپ کی مرضی۔"

اور امی نے آنٹی ثوبیہ کے ساتھ ساتھ تمام گھر والوں کو دعوت بھجوا دی۔ وہ لوگ بھی ہمارے نئے گھر آئے۔

ہمارا ہزار گز کا خوبصورت بنگلہ' پورچ میں کھڑی چار چار گاڑیاں' نوکروں کی فوج' وہ لوگ تو یہ سب دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اُس وقت آنٹی ثوبیہ نے

ٹھنڈی سانس بھر کر اپنی بہن سے کہا۔ ''اس کو کہتے ہیں قسمت' آج یہ سب میرا ہوتا اگر ابا جلد بازی میں منگنی نہ توڑتے تو۔''

امی جو قریب سے گزر رہی تھیں' آنٹی ثوبیہ کے حسرت بھرے انداز پر کانپ کر رہ گئیں۔

کئی روز تک خاندان بھر میں ہمارے گھر اور دعوت کا چرچا رہا۔ زندگی معمول کے مطابق گزر رہی تھی کہ ایک دن بابو جی دکان سے گھر آئے اور امی سے کہنے لگے کہ میری آنکھوں میں کالا پانی اتر آیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں' میں اب کام نہیں کر سکوں گا۔ چونکہ بابو جی ڈائمنڈ کا کام کرتے تھے اور اس کام میں تیز نظر کا ہونا ضروری تھا کیونکہ یہ بہت باریک کام کہلاتا ہے۔ آنکھوں کی خرابی کے باعث بابو جی گھر بیٹھ گئے۔ آنکھیں خراب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بیمار بھی رہنے لگے۔ چہرہ عجیب بے رونق اور بدوضع ہو گیا تھا۔ میں اُن کی طرف دیکھنے سے بھی ڈرتی تھی۔ اُس زمانے میں اُن کا علاج انکل سریہ ہسپتال کے ڈاکٹر شوکت علی سید صاحب سے کروایا جا رہا تھا جو اپنے زمانے کے بہت بڑے ڈاکٹر تھے۔ میرے بڑے بھائی جمیل اُن کو لے کر جاتے تو ڈاکٹر صاحب کہتے کہ یہ بالکل ٹھیک ہیں' ان کو کوئی بیماری نہیں ہے' ساری رپورٹیں ٹھیک تھیں لیکن اُن کی طبیعت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی۔

ایک دن بہت تیز بارش ہو رہی تھی' بادل گرج رہے تھے۔ اُس روز ہندوؤں کا تہوار ہولی منایا جا رہا تھا۔ بابو کی طبیعت قدرے بہتر تھی کہ اچانک دروازہ کی گھنٹی بجی اور ایسا لگا جیسے کوئی بابو کا نام لے کر آواز دے رہا ہو۔

امی نے کہا۔ ''میں جا کر دیکھتی ہوں۔''

لیکن بابو کہنے لگے۔ ''رہنے دو' کسی مرد کی آواز لگ رہی ہے۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔'' اور وہ دروازہ کھولنے چلے گئے۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اچانک کوئی بہت وزنی چیز گرنے کی آواز آئی۔ امی اور سب گھر والے دوڑتے ہوئے دروازے تک گئے تو دیکھتے ہیں' بابو جی پشت کے بل فرش پر پڑے ہیں اور اُن کے سینے پر کپڑے کا بنا ہوا ایک انسانی پتلا تھا جس کے پورے جسم پر سوئیاں گھسی ہوئی ہیں۔ یہ منظر خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ میرے بڑے بھائی فوراً وہ پتلا اٹھا کر کسی نزدیکی قبرستان میں پھینک آئے۔ اُس دن کے بعد بابو شدید سے شدید بیمار پڑتے چلے گئے لیکن اُن کی میڈیکل رپورٹ بالکل صحیح آتی۔

امی اکثر بابو سے کہتیں۔ ''آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہے' یہ کوئی اوپری چکر ہے۔ کسی عالم کو دکھانا چاہیے۔''

لیکن بابو سختی سے منع کر دیتے۔ ''تم لوگوں کا دماغ خراب ہے۔ کوئی جادو وادو نہیں ہوتا اور میرا کون دشمن ہے جو مجھ پر جادو کرواتا پھرے گا؟'' امی بے چاری خاموش ہو جاتیں۔

بابو کا رنگ سرخ و سفید تھا اور شخصیت ایسی کہ آدمی دیکھتا رہ جائے لیکن اب اُن کا رنگ بالکل سیاہ ہو گیا تھا' گال پچک گئے' آنکھیں زرد اور اندر کو دھنس گئی تھیں۔ ان کی پراسرار بیماری کے باعث کاروبار تباہ ہو گیا تھا' گھر میں تنگ دستی در و دیواروں سے برسنے لگی۔ وہ انتہائی تکلیف دہ دور تھا جو مجھے آج تک یاد ہے۔ امی' بابو کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ دیکھ کر چپکے چپکے روتیں اور ہم بچے سہمے سہمے سے گھر کے کونے کھدروں میں بیٹھے رہتے۔

ایک رات' ہم سب سو رہے تھے کہ اچانک میری بڑی بہن کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھتی ہیں' بابو تجوری کھولے کھڑے ہیں۔ جلدی سے امی کو اٹھایا۔

امی کے پوچھنے پر بابو نے بتایا۔ ''ثوبیہ (بابو کی سابقہ منگیتر) آئی تھی' کہہ رہی تھی کہ گھر کی ساری چپلیں اور پیسے مجھے دے دو۔ میں نے جوتیاں تو دے دیں' اب پیسے نکال رہا ہوں۔''

''کہاں ہے وہ؟'' امی نے پوچھا۔

''میرے کمرے کی کھڑکی کے باہر کھڑی ہے۔'' بابو نے کہا۔

میرے بڑے بھائی جمیل نے کہا۔ ''بابو......! آپ آرام سے لیٹو' میں پیسے خود جا کر دے آتا ہوں۔'' مگر بابو ضد کرنے لگے کہ نہیں' میں خود جاؤں گا لیکن بھائی جمیل خود گئے۔ دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا لیکن گھر کی ساری چپلیں غائب تھیں۔ بابو اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئے اور پھر اُن کو شدید بخار چڑھ گیا۔ امی ان تمام باتوں سے بہت پریشان رہنے لگی تھیں لیکن بابو کسی صورت یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ وہ کسی جادو وغیرہ کا شکار ہو گئے ہیں۔

ایک روز بابو بہت ہمت کر کے کھڑے ہوئے اور تیار ہو کر گھر کے اوپر والے پورشن کی طرف جانے لگے۔

امی نے پوچھا۔ ''خیریت' آپ سے چلا تو جا نہیں رہا' آپ سیڑھیاں کیسے چڑھ گئے؟''

''ناہید (میری بہن) کے رشتے کے لیے چند لوگ اوپر آ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں اُن سے بات کرنے جا رہا ہوں۔''

''لیکن اوپر تو کوئی نہیں ہے؟'' امی نے پریشانی سے کہا۔

''کیسی باتیں کرتی ہو؟ میں خود بٹھا کر آیا ہوں' تین مرد اور عورتیں ہیں۔''

''اچھا چلیے' اگر آپ ناہید کے باپ ہیں تو میں بھی تو ماں ہوں نا' میں بھی چلتی ہوں۔'' امی اُن کے ساتھ اوپر ڈرائنگ روم میں گئیں تو دیکھا' وہاں کوئی نہیں تھا لیکن کمرہ ایک غیر مانوس سی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ایش ٹرے میں سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑ
تھے اور دائیں طرف بچھے ہوئے دیوان پر موتیا ک
پھولوں کا گجرا رکھا تھا۔ امی دم بخود تھیں۔

بابو کہنے لگے۔ ''دیکھو' وہ لوگ موجود تھے لیکن تمہارے آنے کی وجہ سے چلے گئے۔ اچھا تھا' میں خود آ کر ان سے بات کرتا کیونکہ وہ کہہ رہے تھے ک
بات ختم ہونے کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ لے ک
جائیں گے۔''

''اپنے ساتھ؟'' امی نے حیران ہو کر کہا۔

''ہاں ہاں' اپنے ساتھ' ان کے گھر...... لیکن ت
پیچھے لگ کر آ گئیں۔'' بابو ناراض تھے اور امی خوف زدہ۔

روز گھر میں کوئی نہ کوئی پراسرار واقعہ رونما ہوتا
مجھے اچھی طرح یاد ہے' اُس دن بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔ بابو کا بیڈ کھڑکی کے ساتھ لگا ہوا تھا' و
آنکھیں بند کیے لیٹے تھے اور امی اُن کے سرہانے بیٹھی سورۃ بقرہ پڑھ رہی تھیں کہ مٹی کی ایک ہانڈی اڑتی ہوئی آئی' گھر کے بلب تڑاتڑ ٹوٹنے لگے اور و
ہانڈی راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو پار کرتی ہوئی گھر میں گھستی چلی گئی حتیٰ کہ دیواروں میں سے ایسے گزری جیسے وہاں کوئی دیوار نہ ہو اور بابو کے پلنگ کے پاس آ گئی لیکن قرآن کی تلاوت سن کر جیسے وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔ امی اس ہانڈی کو دیکھ کر زور زور سے قرآنی آیات پڑھنے لگیں اور قرآن کو ایک ڈھال کی طرح لے کر کھڑی ہو گئیں۔ ہانڈی تھوڑی دیر تک تو ہوا میں معلق رہی اور پھر دھڑام سے فرش پر گر کر ٹوٹ گئی...... اس کے ٹوٹنے سے اس قدر سخت بدبو پھیلی جو بیان سے باہر ہے...... وہ بدبو آج بیس سال گزرنے کی باوجود بھی مجھے محسوس ہوتی ہے۔

بابو بھی یہ سب منظر کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے

تھے اور زندگی میں پہلی بار وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کچھ ہے جو غلط ہو رہا ہے۔ میرا اس بات پر ایمان ہے کہ جب کسی کام کا وقت آ جاتا ہے تو خود بخود راستے کھلنے شروع ہو جاتے ہیں' شاید اب بابو کی صحت یابی کا وقت آ گیا تھا اور ہماری پریشانیاں ختم ہونے والی تھیں۔

دوسرے دن صبح جب سارے گھر والے ڈرے ڈرے اور بجھے بجھے تھے' بابو نے امی سے کہا۔ "تم اکثر کہتی ہو کہ مجھے کسی عامل کو دکھانا چاہیے تو میرے خیال سے تم ٹھیک کہتی ہو۔ اگر تم کسی پیر' فقیر' مولوی یا عامل کو جانتی ہو تو بلوا لو۔" بابو کی طرف سے اشارہ ملنے کی دیر تھی' امی تو کِھل اٹھیں کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ بیمار نہیں ہیں بلکہ اُن کے ساتھ معاملہ ہی کچھ اور ہے۔

ہماری امی کے ایک رشتے کے ماموں تھے' وہ رُوحانی علم کے بارے میں جانتے تھے لیکن عمل کرتے نہیں تھے۔ وہ غریب آباد کی کچی آبادی میں رہتے تھے۔ امی ایک شام مجھے لے کر اپنے ماموں عبدالغفار کے گھر پہنچ گئیں جنہیں ہم لوگ نانا غفار کہتے تھے۔ اُن کی عمر تقریباً اسی سال تھی لیکن صحت قابلِ رشک حد تک اچھی تھی۔ امی نے نانا غفار کو سارا مسئلہ سنایا۔

انہوں نے کہا۔ "بیٹا! میں تو کوئی عامل ہوں نہیں' تم کسی عامل سے بات کرو۔"

امی نے روتے ہوئے کہا۔ "ماموں! میں اچھی طرح جانتی ہوں' خواہ آپ کتنا ہی منع کرو' آپ اس عمل سے واقف ہو۔ ماموں! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' میرے میاں بہت بیمار ہیں۔ آپ ایک دفعہ اُن کو آ کر دیکھ لیں۔" امی کی باتوں پر نانا غفار کا دل پسیج گیا اور انہوں نے دوسرے دن مغرب کے بعد آنے کا وعدہ کر لیا۔

اگلے دن سفید کُرتہ شلوار میں ملبوس نانا غفار ہمارے گھر آئے۔ بابو بستر پر لیٹے ہوئے تھے' اُن کی آنکھیں بند تھیں اور سانس ہلکے ہلکے چل رہی تھی' اُن کا چہرہ سیاہ ہو رہا تھا۔ نانا غفار کے آنے پر بابو نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اُن سے اٹھا نہیں گیا۔ نانا نے انہیں لیٹنے رہنے کے لیے کہا اور پھر اُن کے سرہانے رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے پہلے تو منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور پھر بابو کے دونوں ہاتھ سونگھے۔ جب وہ اپنے ہاتھوں میں بابو کے ہاتھ لیے سونگھ رہے تھے تو اُن کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا پھر وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئے اور امی کو اشارے سے بلا کر کہا۔

"ان پر تو میعادی کام ہوا ہے۔"

"میعادی کام کیا ہوتا ہے؟" امی نے الجھن آمیز انداز میں پوچھا۔

"جس نے بھی ان پر سفلی کا عمل کروایا ہے' اس عمل کے تحت چار ماہ کے اندر اندر تمہارے میاں کو مر جانا چاہیے۔" یہ سن کر میری امی رونے لگیں۔ نانا غفار نے امی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! تیرے میاں کا کام بہت مشکل ہے۔ اس میں ہر حال میں ایک جان جانی ہے۔ بہرحال پھر بھی میں انشاءاللہ یہ کام کروں گا اور ہاں' ان کی میعاد کے 22 دن رہ گئے ہیں اور یہ میرا تجھ سے وعدہ ہے کہ آج تیرے میاں سے بستر سے اٹھا نہیں جا رہا لیکن انشاءاللہ! 21ویں دن یہ اپنے ہاتھوں میں مٹھائی کا ٹوکرا اٹھا کر میرے گھر آئیں گے۔" اُس وقت نانا غفار کا دعویٰ بڑا عجیب سا لگا جبکہ بابو تو ملنے جلنے کے قابل بھی نہیں تھے۔

دوسرے دن سے نانا غفار نے اپنا عمل شروع کر دیا۔ انہوں نے ایک بکرے کی سری منگوائی اور اس کو بابو کے سر پر سے اتار کر قبلہ کی سمت رکھا اور پھر

اس پر کوئی عمل پڑھتے رہے۔ ہم بچے تھے' ایسے مواقع پر امی ہمیں دور رکھتیں بلکہ کوشش کرتیں کہ ہم پڑوس میں چلے جائیں لیکن میں نہیں جاتی تھی اور چھپ چھپ کر نانا غفار کو عمل کرتے دیکھتی اور کبھی بستر پر ادھ موئے لیٹے اپنے پیارے بابو کو!

نانا نے وہ کھوپڑی امی کو دی اور کہا۔ "اس کو قبرستان میں پھنکوا دو لیکن جو بھی پھینکنے جائے' اس سے کہنا کہ اس کھوپڑی کو پھینکتے ہی آوازیں آنے لگیں گی جیسے کوئی بلا رہا ہے لیکن پلٹ کر نہیں دیکھنا۔"

امی نے میرے بھائی حبیب سے کہا کہ تم جا کر اس کھوپڑی کو خاموش کالونی کے قبرستان میں پھینک آؤ لیکن بھائی جمیل کہنے لگے کہ نہیں' یہ بہت ذمہ داری کا کام ہے' میں خود جاتا ہوں۔ امی نے آیت الکرسی اور دوسری بہت ساری دُعائیں پڑھ کر بھائی جمیل پر پھونکیں اور اُن کو قبرستان روانہ کر دیا۔ بھائی جمیل بتاتے ہیں کہ جب انہوں نے کھوپڑی پھینکی اور پلٹے تو اُن کو لگا جیسے بابو بہت تکلیف میں اُن کو آوازیں دے رہے ہیں پھر اُن کو ہم چھوٹے بہن بھائیوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں لیکن وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر سر پر پیر رکھ کر وہاں سے بھاگ آئے۔

کبھی نانا غفار انڈوں پر لکیریں کھینچتے اور کہتے۔ "کسی ایسی جگہ ڈال کر آؤ تاکہ کسی کے لانگن پھلانگن میں نہ آئے۔ جیسے جیسے نانا' بابو پر کیے گئے عملیات کا توڑ کر رہے تھے' بابو دن بہ دن صحت مند ہوتے جا رہے تھے اور نانا غفار کی حالت خستہ ہوتی جا رہی تھی۔

اُس روز عمل کا 15واں دن تھا۔ امی نے نانا غفار سے کہا کہ ماموں' پتہ تو چلے' ایسا کون ہے جس نے اتنا سخت عمل کیا کہ جان کے لالے پڑ گئے؟

پتھر دل

دل پتھر تو نہیں ہے
آنکھ میں آنسو بھی آتے نہیں اب
صدمہ کوئی صدمہ لگتا ہی نہیں
لیکن میں ایک بار دل کھول کر روتی ضرور ہوں
ایک دریا جو میرے اندر ہے موجود
راستہ دریا کا کھول دیتی ضرور ہوں
کیونکہ!!
دل بھی درد دل کب تک کرے برداشت؟
دل ہے میرا' پتھر تو نہیں

ثمرین ادریس

نانا غفار نے ٹالنے والے انداز میں امی سے کہا۔ "ارے بیٹا! تمہارا میاں صحت یاب ہو رہا ہے۔ چھوڑو ان سب باتوں کو۔" لیکن امی نے تو جیسے ضد ہی پکڑ لی کہ مجھے نام بتائیں تاکہ پھر میں آئندہ احتیاط کروں۔

"بیٹا! میں نام تو نہیں بتا سکتا لیکن ہاں' اتنا بتا دوں کہ ایک عورت ہے اور وہ تمہارے گھر کی خوشحالی اور تم دونوں میاں بیوی کی آپس کی محبت سے حسد کرتی ہے اور اس نے کسی سفید میٹھی چیز میں ان کو کچھ کھلایا ہے اور جب عمل پیٹ میں اتر جائے یا قبرستان میں دفن کر دیا جائے تو پھر وہ جان لے کر ہی ختم ہوتا ہے لیکن یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ تمہارا میاں انشاءاللہ' صرف چھ دن بعد اپنے پیروں پر چل کر میرے گھر آئے گا۔" نانا غفار نے امی کے

پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے تسلی دی۔ امی کے ساتھ ساتھ میرے بڑے بھائی بھی سمجھ گئے کہ وہ خاتون کون ہو سکتی ہیں لیکن خاموش رہے کہ بولنے سے، جھگڑنے سے فائدہ بھی کیا تھا۔

جس روز عمل کے اترنے کا 20 واں دن تھا، بابو اچانک اٹھے اور امی سے کہنے لگے کہ میں نہاؤں گا۔ میرے سارے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں اور مجھے اپنے آپ میں سے بہت شدید بدبو آ رہی ہے اور پھر بابو کے جسم کی بدبو سارے گھر میں پھیل گئی، سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ امی نے جلدی سے نانا غفار کو فون کر کے ساری صورت حال بتائی تو وہ سن کر زور سے ہنسے۔

''بس بیٹا! وہ چیز تمہارے میاں کے اندر سے باہر نکل رہی ہے۔ تم بے فکر ہو کر اُن کے نہانے کا بندوبست کرو۔''

بابو جب نہا کر نکلے تو آپ کو یقین نہیں آئے گا، اُن کا رنگ و روپ اُسی طرح سرخ و سفید تھا، صحت زبردست تھی، دبلے ہونے کے باوجود صحت مندی اُن کے چہرے سے جھلک رہی تھی اور سب سے بڑی بات کہ اُن کو صاف نظر آ رہا تھا۔ گھر میں ایک دم خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بہت عرصے کے بعد بابو نے سب گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ امی نے فوراً شکرانے کے نفل ادا کیے اور محلے میں مٹھائی تقسیم کی۔

دوسرے دن جمعہ تھا۔ نمازِ جمعہ کے بعد بابو نے مٹھائی کا ٹوکرا بنوایا اور امی سے کہا۔ ''میں نے کبھی اس بات پر یقین نہیں کیا تھا کہ جادو، سفلی وغیرہ ہوتا ہے لیکن اب خود پر بیتی تو یقین آیا۔ میں آپ کے ماموں کے گھر اُن کی خواہش کے مطابق مٹھائی کا ٹوکرا خود اٹھا کر اُن کے گھر جاؤں گا اور اُن کا شکریہ ادا کروں گا۔''

امی اور بابو جب نانا غفار کے گھر پہنچے تو عصر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ نانا غفار گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے قبلہ کی طرف منہ کیے بیٹھے تھے۔ جب بابو اندر داخل ہوئے تو نانا غفار خوش دلی سے مسکرائے اور بہت محبت سے بابو کا ہاتھ تھام لیا۔

''بیٹا......! برسوں پہلے اپنی جوانی میں، میں نے شوق میں آ کر یہ رُوحانی عمل سیکھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ سعیدہ (امی) کو کیسے خبر ہوئی کہ میں یہ علم جانتا ہوں؟ میں نے پوری زندگی نہ عمل کیا اور نہ ہی کسی کے عمل کی کاٹ کی لیکن ساٹھ برس بعد تمہارے لیے میں نے اپنا ہنر آزمایا، شاید میں نے یہ سیکھا ہی تمہارے لیے تھا۔ جس دن میں نے تمہارا کام کرنا شروع کیا تو میری موکلوں سے بات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ اس آدمی کے حصے کا کفن دفن ہو چکا ہے اور 22 ویں روز اُس کفن کے لیے ہم کو جسم چاہیے تو بیٹا......! میں تو زندگی گزار چکا ہوں، تمہارے آگے تو بال بچے کھڑے ہیں۔ میرا کہا سنا معاف کرنا۔ اُس قبرستان میں دفن کفن کو جسم چاہیے اور میں اپنا جسم اُن کو دے رہا ہوں۔'' پھر نانا غفار نے باآوازِ بلند کلمۂ طیبہ پڑھا اور اُن کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

امی اور بابو جو مٹھائی لے کر خوشی خوشی اُن کا شکریہ ادا کرنے گئے تھے، پہلے تو حیرت سے گنگ کھڑے رہے اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

میرے والد مرتے دم تک نانا غفار کا نام بہت عقیدت سے لیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔ ''بیٹا......! یہ تو بہت لوگ کہتے ہیں کہ ہم تمہارے لیے جان دے دیں گے لیکن انہوں نے واقعی میرے لیے اپنی جان دے دی۔ دنیا میں آدمی تو بہت ہوتے ہیں لیکن انسان کم اور نانا غفار ایک عظیم انسان تھے۔''

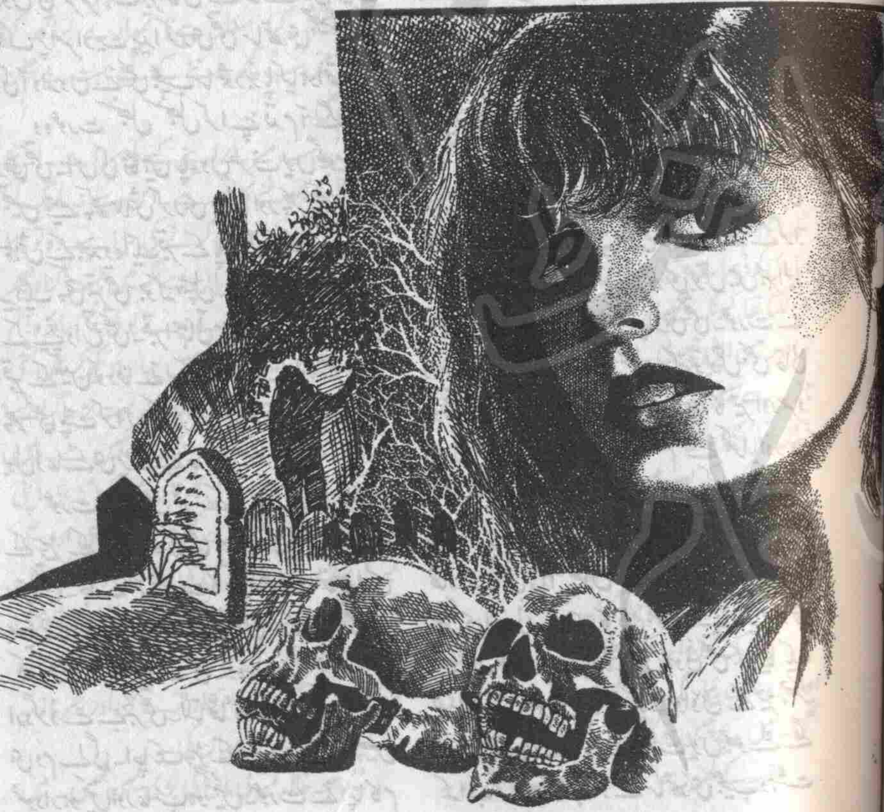
☆☆

علی صبا

اور وہ اُسے لے گئے

اس عورت کے ہاتھ بہت تیزی سے چل رہے تھے، اس دوران دو سرخ آنکھیں کتنی ہی بار درخت پر نمودار ہوئی تھیں اور اُس عورت کو غصے سے......

اُس نادان عورت کا عبرت ناک انجام جو شیطان کی پیروکار بن گئی تھی



قبرستان میں مکمل اندھیرے اور سناٹے کا راج تھا' سردیوں کی راتیں تھیں' یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں کہ ٹوٹے ہوئے گیٹ سے ایک سایہ قبرستان میں داخل ہوا۔ وہ ایک عورت تھی جس نے خود کو بڑی سی چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کالی تھیلی تھی جسے احتیاط سے تھامے وہ قدم آگے بڑھا رہی تھی۔ یہ خاصہ پرانا قبرستان تھا' جابجا ٹوٹی پھوٹی' کچی پکی قبریں نظر آ رہی تھیں۔ قبرستان کے چاروں اطراف لگے برگد' نیم اور پیپل کے درخت اس اندھیرے میں یوں لگ رہے تھے جیسے بہت سے بھوتوں نے قبرستان کو گھیرا ہوا ہے۔ ان درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ قبرستان کے سناٹے میں ہیبت ناک پراسراریت پیدا کر رہی تھی' ساتھ ہی جھینگروں کی آوازوں نے بھی عجیب سا شور برپا کیا ہوا تھا۔

وہ عورت سنبھل سنبھل کر اپنے قدم آگے بڑھا رہی تھی۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف یوں گھوم رہی تھیں جیسے کچھ تلاش کر رہی ہوں اور پھر کچھ دیر کی تلاش کے بعد وہ ایک قبر کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ ایک کچی قبر تھی جو کہ پیپل کے ایک گھنے درخت کے نیچے واقع تھی۔ قبر انتہائی مخدوش تھی۔ لگتا تھا اس قبر کے مکین کو دفنانے کے بعد اس کے لواحقین نے پھر کبھی پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی کہ تربت پر جا کر دو بول دُعا کے ہی پڑھ لیے جائیں۔

عورت اب اس قبر کے سرہانے بالکل پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گئی تھی اور جلدی جلدی مٹی ہٹا رہی تھی۔ جانے اس عورت کا دل پتھر کا بنا تھا جو ایسی بھیانک رات میں سنسان قبروں کے بیچ بیٹھی قبر کھودنے میں مصروف تھی۔ وہ اپنے کام میں مگن اردگرد سے بے خبر تھی۔ لگتا تھا' وہ اپنا کام پورا کر کے ہی دم لے گی۔ اچانک پیڑ کے اوپر دو سرخ آنکھیں نمودار ہوئیں اور غائب ہو گئیں۔ عورت نے اپنا کام جاری رکھا ہوا تھا مگر اسی وقت اسے احساس ہوا جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کے تیزی سے چلتے ہاتھ تھم گئے۔ گردن اٹھا کر اوپر دیکھا' پر کوئی نظر نہ آیا۔ اسے اپنا وہم جان کر وہ پھر قبر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اب گڑھا کسی حد تک گہرا ہو چکا تھا لہٰذا اس نے پاس رکھی کالی تھیلی کا منہ کھولا اور اس میں سے خون میں تربتر گوشت کے لوتھڑے نکالے اور گڑھے میں ڈال دیئے پھر اسی تھیلی میں سے ایک تعویذ نکال کر وہ بھی گڑھے کی نذر کر دیا اور گڑھے کو واپس مٹی سے پُر کر دیا۔ اس عورت کے ہاتھ بہت تیزی سے چل رہے تھے۔ اس دوران وہ دو سرخ آنکھیں کتنی بار درخت پر نمودار ہوئی تھیں اور اس عورت کو غصے سے گھورتی ہوئی دوبارہ غائب ہو گئی تھیں۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ عورت ایک بار پھر اپنی تھیلی کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس میں سے ایک بڑی سی بوتل باہر نکالی۔ یہ بوتل تازہ خون سے بھری ہوئی تھی۔ عورت نے اب پیپل کے درخت کے گرد چکر کاٹنا شروع کر دیا تھا اور ساتھ ہی بوتل میں بھرا لہو درخت کی جڑوں میں چھڑکتی جا رہی تھی۔ عورت نے درخت کے گرد سات چکر مکمل کیے تو بوتل بھی خالی ہو چکی تھی۔ جونہی اس کا یہ عمل ہوا' ہوا کا تیز اور سرد جھونکا تیزی سے اس کے جسم سے ٹکرایا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی گر پڑی۔ اسے لگا جیسے کسی نے اسے دھکا دے کر گرایا ہو۔ بہر حال اس کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔ اب اس کی آنکھوں سے خوشی جھلک رہی تھی کہ بغیر کسی انہونی کے اس کا کام بخوبی اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ ابھی وہ دوبارہ کھڑی ہوئی تھی کہ یکا یک قبرستان میں طوفان سا آ گیا۔ ہواؤں کے تیز جھکڑ چلنے لگے جن کے زور سے درخت یوں جھولنے لگے کہ اب گرے کہ تب گرے' ساتھ ہی عجیب دہشت

انگیز آوازیں گونجنے لگیں جیسے ہزاروں چڑیلیں مل کر بین کر رہی ہوں۔ وہ گرتی پڑتی' لڑکھڑاتی قبرستان کے دروازے کی جانب بڑھنے لگی مگر واپسی کا سفر اب آسان نہیں رہا تھا۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے' لگتا تھا' کوئی لوہے کی زنجیر پاؤں میں پڑ گئی ہو' ساتھ ہی اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کے پیچھے ہے' کسی غیر مرئی قدموں کی چاپ مسلسل اسے سنائی دے رہی تھی۔

جیسے تیسے وہ قبرستان کے ٹوٹے گیٹ تک پہنچی اور ابھی اس نے ایک قدم باہر نکالا ہی تھا کہ کسی نے عقب سے اسے پکارا۔ ''نازیہ......!'' اس پکار پر دلیری کا مظاہرہ کرتی نازیہ نے پوری قوت سے بھاگنا شروع کر دیا تھا۔

•......•......•

نازیہ اور میں کورنگی' کراچی میں رہتے تھے۔ ہمارے گھر تھوڑے فاصلے پر تھے اور ہم آسانی سے ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے۔ ہم دونوں میں بہت گہری دوستی تھی اور ایک دوسرے سے ہماری کوئی بات چھپی نہ رہتی تھی۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی لگتا تھا کیونکہ مجھے اپنی اس دوست سے بہت پیار تھا اور میں اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی جب تک نازیہ سے شیئر نہ کر لیتی' مجھے چین نہیں آتا تھا۔ میرا خیال تھا' یہی حال اس کا بھی ہے۔

شادی کے بعد میں بیاہ کر لاہور چلی آئی' یوں ہمارا رابطہ بس نام کا ہی رہ گیا۔ اس دوران ہم تقریباً چھ سال مل نہ سکے' بس ایک ٹیلی فونک رابطہ تھا اور وہ بھی آہستہ آہستہ ختم ہوتا چلا گیا۔

مگر ایک دن اچانک مجھے نازیہ کا فون موصول ہوا۔ وہ بہت بیمار لگ رہی تھی اور مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ میں بے چین ہو گئی اور فوراً کراچی آ گئی۔

نازیہ کے گھر کی حالت بہت خراب تھی اور نازیہ کی اپنی حالت بھی بدتر تھی۔ یہ وہ نازیہ لگ ہی نہیں رہی تھی جو چھ برس پہلے تھی' یہ تو کوئی اجڑی ہوئی ویران عورت تھی جس کی رنگت کالی سیاہ پڑ چکی تھی' آنکھوں کی جگہ دو گڑھے رہ گئے تھے' ہونٹ پپڑیوں کی طرح' گال پچکے ہوئے' بال بکھرے ہوئے اور ہاتھ' پیر سوکھ کے کانٹا ہو گئے تھے۔ اس کی یہ ابتر حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی اور سچ کہوں تو پہلی نظر میں تو اسے دیکھ کر مجھے وحشت ہوئی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی نازیہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور میں بھی خود کو نہ روک سکی۔

''نازیہ......! یہ تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے؟ مجھے بتاؤ' کیا مسئلہ ہے؟ تمہارے ساتھ کیا ہوا؟'' میں سب کچھ جاننے کے لیے بہت بے چین ہو رہی تھی۔

''یہ سب میرے اپنے کیے کی سزا ہے۔ اپنے پروردگار کو بھولنے کا نتیجہ ہے۔ اس سے نہ مانگ کر' دوسرے سہارے تلاش کرنے کی سزا ہے۔ وہ تو بڑا رحیم ہے' کریم ہے' مہربان ہے مگر میں بہت گناہ گار ہوں۔'' وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ ''سائرہ! تم اندازہ نہیں کر سکتیں' آج تمہیں یہاں دیکھ کر میں کتنی خوش ہوں۔ میرے گناہوں کا بوجھ بہت بڑھ گیا ہے اور میرے پاس اب زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔ میں نے تو تمہاری دوستی پر بھی بھروسہ نہیں کیا' نہ ہی اپنی ماں کو کچھ بتایا۔ اس سے بھی چھپاتی رہی اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ کاش' کوئی مجھے اس تاریک راہ پہ چلنے سے روک لیتا......'' نازیہ ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گئی۔ میں اس کے دوبارہ بولنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی اور پھر نازیہ نے اپنی کہانی کچھ یوں بیان کی۔

''رابعہ خالہ میری ماں کی بڑی بہن تھیں۔ میں

اس وقت بہت چھوٹی تھی جب خالو کا انتقال ہوگیا اور خالہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہمارے ساتھ رہنے لگیں۔ خالہ بہت اکیلی ہوگئی تھیں' خالو کا انتقال کیا ہوا' سسرال والوں نے خالہ کا ناک میں دم کرکے رکھ دیا۔ گھر' جائیداد سب پر قابض ہوکر بیٹھ گئے مگر خالہ نے ہار نہ مانی۔

وہ ہمیشہ کہتی تھیں کہ میں اپنا اور اپنی بچی کا حق لے کر رہوں گی' پر کیسے' یہ کوئی نہیں جانتا تھا سوائے میرے۔

خالہ کسی عامل کے پاس جایا کرتی تھیں جو کالے جادو کا ماہر تھا۔ خالہ سب سے چھپ کر اس کے پاس جاتی تھیں اور ساتھ میں مجھے بھی لے جایا کرتی تھیں۔ پہلی بار جب خالہ مجھے اس عامل کے پاس لے کر گئیں تو وہاں کا منظر دیکھ کر میں بہت ڈر گئی تھی۔ اس عامل کا آستانہ عجیب پراسرار نوعیت کا تھا اور اس کا اپنا حلیہ بھی بہت عجیب سا تھا۔ اس نے گلے میں مرغیوں کے پنجوں کو کالے دھاگے میں پرو کر مالا بنا کر پہن رکھا تھا جبکہ اس کی داڑھی اس کے قدموں کو چھو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کچھ بڑبڑا بھی رہے تھے۔

خالہ نے جب دیکھا کہ میں ڈر رہی ہوں تو مجھے خود سے قریب کرکے سمجھانے لگیں۔ ''نازیہ' یہ بہت اچھے بابا ہیں' سب کے لیے دُعائیں کرتے ہیں' ان سے دُعا کروالوں تو پھر چلتے ہیں مگر ہاں' تو گھر پہ کسی کو یہاں آنے کے بارے میں نہ بتانا ورنہ بابا ناراض ہوجائیں گے اور دُعا نہیں کریں گے۔''

میں نے خالہ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے گھر آکر کسی سے کچھ نہ کہا کہ کہیں بابا ناراض نہ ہوجائیں۔ اب خالہ خوش رہنے لگی تھیں اور کہتی تھیں کہ دیکھنا' بہت جلد میرے دن پھرنے والے ہیں' مجھے میرا حق مل جائے گا۔

ایک دن خبر آئی کہ خالہ کے سسر اور دیور کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ موقع پر ہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ سب کو دکھ تو ہوا تھا مگر خالہ کو اپنا حق مل گیا تھا۔ خالہ کی ساس اپنے شوہر اور بیٹے کی وفات سے اتنی دلبرداشتہ ہوئیں کہ سب کچھ اپنی باقی اولادوں اور خالہ کو دے دیا جو جس کا حق تھا' اسے مل گیا اور خالہ نے سکون کا سانس لیا۔

خالہ اکثر مجھے کہتی تھیں۔ ''نازیہ' یہ سب بابا کی دُعاؤں کا اثر ہے۔ بابا سب کچھ کرسکتے ہیں۔'' ان کی یہ بات میرے دماغ میں بیٹھ گئی تھی۔

''سائرہ' تو' تو جانتی ہے' مجھے پڑھائی کا کتنا شوق تھا لیکن گھر میں ابا سمیت سب مجھے آگے پڑھنے کے حق میں نہیں تھے' تب مجھے خالہ نے بابا کی راہ دکھائی اور میں نے بھی بابا سے مدد مانگی کہ بابا جی' آپ میرے لیے دُعا کردیجیے' میں آگے پڑھ سکوں اور ابا اور گھر والے مان جائیں۔

''ہاں' ہاں کیوں نہیں مگر اس کے لیے تمہیں مجھے کچھ دینا ہوگا۔'' یہ میرا پہلا موقع تھا لہٰذا نا سمجھی کی کیفیت میں بابا کو دیکھا تو وہ بولا۔ ''مجھے تم اپنے گلے کی یہ سونے کی چین دے دو پھر دیکھنا' تمہارا کام کیسے ہوتا ہے۔''

اگر میں چین بابا کو دے دیتی تو اماں کو کیا جواب دیتی؟

خالہ جو میرے پاس بیٹھی تھیں' بولیں۔ ''نازیہ' اتنا کیا سوچ رہی ہے؟ دے دے نا چین۔''

''پر خالہ' میں اماں کو کیا جواب دوں گی کہ چین کہاں گئی؟''

''اری' تو کیوں پریشان ہوتی ہے' کہہ دینا کہ راستے میں گر گئی۔'' اور میں نے بابا کو چین اتار کر دے دی۔ گھر آکر اماں کو جھوٹ بول دیا۔ اماں نے غصہ تو کیا پر خالہ نے ساری بات سنبھال لی۔

میں روز اماں اور ابا کو سمجھانے کی کوشش کرتی کہ مجھے پڑھنے دیں اور پھر میرا بڑا بھائی اس وقت میرے بہت کام آیا' اس نے میرے پڑھنے کی بات اماں' ابا سے منوالی اور میں خوش ہوگئی۔

خالہ بولیں۔ ''نازیہ' یہ سب بابا کی دُعاؤں کا اثر ہے۔'' اور اس دن سے میں بھی خالہ کے رنگ میں رنگ گئی۔ جب بھی کبھی مجھے کوئی مسئلہ درپیش ہوتا' بابا کے پاس پہنچ جاتی۔ بابا بدلے میں کچھ نہ کچھ ضرور مانگتا تھا مگر میرا کام تو ہوجاتا تھا' میرے لیے یہی کافی تھا۔

سائرہ' آج سوچتی ہوں تو لگتا ہے' میں کتنی غلط تھی۔ وہ سارے کام تو اللہ کی رضا سے ویسے ہی ہونے تھے اور میں اپنی بے وقوفی میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں نے نماز' روزہ' سب چھوڑ دیا تھا۔ اماں مجھے بہت سمجھاتیں لیکن مجھ پہ تو جیسے شیطان سوار ہوگیا تھا' میں اندھیرے رستے پہ جو چل پڑی تھی پھر میری شادی ہوگئی۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں مگر اپنی ناسمجھی میں' میں انہیں بھی کبھی نہ سمجھ سکی۔

میری نظر میں وہ ہمیشہ اپنی ماں' بہنوں کا ہی ساتھ دیتے تھے جس سے مجھ میں حسد پیدا ہوگیا اور میں نے روز عامل بابا کے چکر کاٹنے شروع کردیئے۔ اب تک مجھے یہ تو سمجھ آچکا تھا' بابا ان تمام کاموں کے لیے کوئی عمل کرتا تھا مگر اب اس نے مجھے بھی کچھ عملیات میں اپنے ساتھ شامل کرنا شروع کردیا تھا۔ بابا کبھی مجھے تعویذ دیتا جسے میں کبھی کھانے میں شامل کردیتی تو کبھی پانی یا دودھ میں گھول کر اپنے سسرال والوں اور شوہر کو پلا دیتی۔ کوئی تعویذ شوہر کے بستر کے نیچے رکھنا ہوتا' کوئی کسی کے کپڑوں میں سینا ہوتا یا تکیے کے نیچے رکھ دیتی یا پھر دروازے کی چوکھٹ پر باندھ دیتی۔ میں یہ سارے کام اتنی ہوشیاری سے کرتی کہ کسی کو کچھ شک نہیں ہوتا تھا۔ وقت ایسے ہی بیتتا چلا گیا اور میں دو ننھی پریوں کی ماں بن گئی۔

مگر اب میرا اصل امتحان شروع ہوچکا تھا۔

سسرال میں سب کو بیٹے کی آس تھی۔ اب ساس کا رویہ مجھ سے بگڑتا جارہا تھا۔ نندیں جن کے بیٹے تھے' مجھے کسی نہ کسی صورت طعنے ضرور دیتیں یہاں تک کہ میرے میاں کو بھی بیٹے کا انتظار تھا۔ میری شادی کو پانچ سال ہوچکے تھے۔

میری ماں کہتی۔ ''بیٹی! اللہ سے دُعا کیا کرو' وہ تمہاری جھولی میں اولادِ نرینہ ڈال دے تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

مگر مجھے تو بابا جی ہر مرض کی دوا لگتا تھا۔ وہ کچھ اس طرح مجھ پر حاوی ہوگیا تھا کہ وہ جو کہتا' میں کرتی تھی۔ بابا سے میں اس بارے میں کئی بار ذکر کرچکی تھی۔

''بابا جی' آپ کچھ کرتے کیوں نہیں؟ میں بہت پریشان ہوں۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتے؟''

''کیوں نہیں کرسکتا بلکہ ہم نے تو تمہارے لیے پہلے سے ہی کچھ سوچ رکھا ہے۔''

''سچ بابا......! کیا میری مراد پوری ہوسکتی ہے؟''

''ہاں' کیوں نہیں مگر اس بار کام ذرا کٹھن ہے' تم کرپاؤ گی؟''

''بابا...... آپ بتائیے' میں کچھ بھی کروں گی۔''

''ایسا ہے تو سب سے پہلے تم پچاس ہزار روپے کا انتظام کرو پھر باقی کام میں تمہیں اس کے بعد ہی بتاؤں گا۔''

پچاس ہزار کی رقم کا بندوبست کرنا میرے لیے بہت مشکل تھا مگر میں نے ہامی بھرلی اور اپنے کچھ زیور بیچ کر میں نے رقم کا انتظام کرکے بابا کے پاس

پہنچ گئی۔

"پورے پچاس ہزار ہیں بابا! اب مجھے بتایئے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟" بابا نے ایک کالی تھیلی میری طرف بڑھادی۔

اس تھیلی میں کالے بکرے کا گوشت تھا اور ایک بوتل تھی جس میں بکرے کا تازہ خون بھرا ہوا تھا اور ساتھ ہی ایک تعویذ بھی دیتے ہوئے مجھ سے جو کرنے کو کہا' وہ میں نے کردیا۔

وہ بھیانک' کالی اور سرد رات تھی' نجانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی' شاید بابا کے پاس اتنے عرصے سے جاتے جاتے اور ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے میرے احساسات سرد پڑگئے تھے ورنہ کوئی عام عورت ہوتی تو رات کے آخری پہر بھی قبرستان میں قدم رکھنے کی جرات نہ کرتی مگر میں نے یہ ہمت کرلی تھی جس کا خمیازہ بھی مجھے بھگتنا پڑا۔ میں قدم آگے بڑھاتی گئی اور اپنی مطلوبہ قبر پہ آکر رک گئی اور پھر اپنا کام کرنا شروع کردیا۔

بابا کے مطابق پہلے مجھے ایک ایسی قبر تلاش کرنی تھی جو کسی پیپل کے پیڑ کے نیچے بنی ہوا اور پھر وہاں ایک گہرا گڑھا کھودکر ان تمام چیزوں کو اس گڑھے میں دفن کرنا تھا اور پھر پیپل کے گرد سات چکروں کے درمیان بوتل میں بھرا خون اس پیڑ کی جڑوں میں ڈالنا تھا۔

یہ کام کرتے ہوئے کئی بار مجھے ایسا لگا جیسے مجھے کوئی دیکھ رہا ہے۔ میں نے کئی بار اپنے اردگرد پیڑ پر بھی دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا اور میں اسے اپنا وہم جان کر عمل پورا کرتی رہی پھر جب میں نے پیڑ کے گرد اپنا ساتواں چکر پورا کیا تو مجھے لگا کہ کسی نے مجھے دھکا دیا ہے' میں گر پڑی۔ اسی وقت طوفان سا آگیا' ہواؤں میں تیزی آتی جارہی تھی اور جھکڑ بہت تیز چلنے لگے تھے۔ میں نے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیئے پر نجانے کیوں لگتا تھا' پاؤں کے نیچے کسی نے کانٹے بچھادیئے ہوں اور پاؤں اٹھانا مشکل ہوگیا ہو' ساتھ ہی ساتھ ایک اور بات ہوئی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی عذاب میں گھر چکی ہوں۔ میں جیسے جیسے قدم بڑھاتی' کوئی اور بھی میرے ساتھ چل پڑتا۔ کسی کے مسلسل ساتھ چلنے کی آواز اور احساس میرے ساتھ ساتھ تھا مگر میں نے ہار نہ مانی اور قبرستان سے باہر آگئی مگر ابھی اپنا پہلا قدم ہی گیٹ سے باہر رکھا تھا کہ کسی نے مجھے پیچھے سے پکارا' میرا نام لے کر کوئی مجھے رک جانے کو کہہ رہا تھا مگر میں نے اپنی پوری طاقت سے بھاگنا شروع کردیا اور گھر آکر ہی دم لیا۔

میں بہت خوف زدہ تھی مگر کسی سے اس بات کا ذکر بھی نہیں کرسکتی تھی لہٰذا سوچا کہ کل ہی بابا سے جاکر یہ سارا واقعہ بیان کروں گی تو وہ ضرور کوئی حل نکالیں گے۔

مگر اگلے دن میں بابا کے پاس نہ جاسکی کیونکہ مجھے سخت بخار نے آلیا تھا۔ میری رنگت پیلی پڑگئی تھی جیسے کسی نے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ میرے میاں یہ سب دیکھ کر بہت پریشان تھے اور سچ تو یہ ہے کہ اس دن پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ آصف مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ میں اپنی ہی نظروں میں شرمندہ ہوگئی تھی۔ انہوں نے مجھے کتنے ہی ڈاکٹرز کو دکھایا مگر میری حالت میں ذرا بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ ہر وقت لگتا جیسے جسم کی ہڈیاں ٹوٹ رہی ہوں یا سارے جسم پہ کیڑے رینگ رہے ہوں۔ میں درد سے چلاتی رہتی۔ مجھے اب دورے بھی پڑنا شروع ہوگئے تھے' دورے کی کیفیت میں مجھے اپنا ہوش نہیں رہتا' ایسے میں پورا گھر ادھیڑ کے رکھ دیتی یہاں تک کہ جہاں جہاں میں نے اتنے عرصے میں تعویذ چھپائے یا دبائے تھے' سب اپنے ہی ہاتھوں سے

نکالنے لگی۔ ایسا لگتا' کوئی غیر مرئی قوت مجھ سے یہ سب کروارہی ہے۔ میں خود سے بے گانی اپنے ہی راز کھولے چلے جارہی تھی۔

جب ہوش میں آتی' آصف مجھ سے پوچھتے کہ یہ سب کیا ہے اور میں کوئی جواب نہ دے پاتی۔ پورا دن گھر میں پاگلوں کی طرح پھرتی رہتی اور رات کو سو نہ پاتی۔ ڈراؤنے خوابوں نے مجھے پریشان کرکے رکھ دیا تھا۔ رات میں کئی بار چیخ مار کر اٹھ جاتی اور خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ کبھی کبھی تو جاگتے میں بھی کچھ بھیانک شکلیں نظر آتیں۔ کانوں میں بس ایک آواز آتی رہتی۔

"آؤ نازیہ...... آؤ' ہمارے پاس آؤ...... ہمیں بھول گئیں کیا......؟ ہم تمہیں لینے آئے ہیں......" یہ آوازیں میرے کانوں میں پڑتیں تو میں تڑپنے لگتی' چیخنے لگتی' میری یہ حالت اور تعویذ سب کو ساری کہانی بیان کرچکے تھے۔ میں اپنی ساس' سسر اور نندوں کی نظروں میں تو گرہی چکی تھی اور اب آصف کے سامنے بھی اپنا مقام کھو بیٹھی تھی۔

آصف نے شروع میں بہت کوشش کی۔ پیر' فقیر' مولوی' سب کو دکھایا' پر کچھ اثر نہ ہوا بلکہ میری حالت اور خراب ہوتی گئی اور پھر وہ ہوگیا جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی' میں نے ایک مری ہوئی بچی کو جنم دیا۔

آصف کو بیٹے کی چاہ تو تھی مگر وہ اپنی بیٹیوں سے بھی بے انتہا محبت کرتے تھے اور اس بات کا احساس بھی مجھے اسی دن ہوا جب وہ پھوٹ پھوٹ کررورہے تھے۔ میں سب کی گناہ گار تھی۔ میں نے ہی کفرانِ نعمت کیا تھا جس کی مجھے سزا ملی تھی۔ اس دن مجھے یوں لگا جیسے میں نے خود ہی اپنے ہاتھوں اپنی بچی کو مارا ہے۔ میں سب کی مجرم تھی' میں نے سب کی خوشیاں چھین لی تھیں پھر آصف بھی مجھ سے

چھوٹی نظم بڑی دعا!

یارب!
میری دعا ہے
میں جب مروں تو!
میرے مدفن میں
پیارے محمدؐ کے نام کا
اک دیا بھی رکھ دینا
کیونکہ
مجھے اندھیروں سے ڈر لگتا ہے!

زمر نعیم۔ لاہور

دور ہوتے گئے اور میں اکیلی رہ گئی۔

وہ آوازیں اب بھی میرے کانوں میں گونجتی ہیں سائرہ' اور میں جانتی ہوں' وہ مجھے لے کر ہی جائیں گے۔ میں مرنے والی ہوں...... ہوسکے تو اللہ کے حضور میرے لیے دُعا کرنا۔ کوئی تو ہو' کوئی تو ہو جو مجھے میرے مرنے کے بعد یاد رکھ سکے۔"

نازیہ خاموش ہوگئی تھی مگر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا اور میں جو سکتے کی حالت میں یہ سب سن رہی تھی' اسے دلاسہ تک نہ دے سکی اور وہاں سے چپ چاپ چلی آئی۔

نازیہ نے ٹھیک کہا تھا کیونکہ دو دن بعد ہی اس کی وفات کی خبر آگئی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھے' اسے لے گئے تھے۔

یہ کہانی بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ عبرت حاصل کریں جو ایسے عاملوں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں اور اپنا سب کچھ گنوا بیٹھتے ہیں۔ جادو ٹونے اور کالے جادو میں پڑ کر اپنی زندگی عذاب کرتے ہیں اور ایمان جیسی نایاب شئے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ☆☆



اصفا فیصل

کسی کو کیا ملا؟

نوشابہ بیگم نے چونک کر بیٹی کو دیکھا تھا یہ سیرت کا انداز تو ہرگز نہ تھا۔ اُس کے بعد سیرت نے پہلے کھانا پینا چھوڑا پھر گھر والوں کو پہچاننا چھوڑا اور بستر سے......

آج کے معاشرے کی زندہ تصویر، ایک لڑکی کی پُرالم مختصر کہانی

نوشابہ سحری سے فراغت کے بعد قرآنِ کریم کی تلاوت کر رہی تھی۔ سورۃ الحجرات کی پہلی آیت کے ترجمے کو بار بار پڑھنے میں نجانے دل کو کیسا سکون میسر ہو رہا تھا۔

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔''

''بلاشبہ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ اے ربِ کریم! تو سب کچھ جانتا ہے' سب کچھ پھر مجھے تو اس مشکل سے نکال۔ اے میرے......!'' وہ دُعا میں مشغول تھی' یکدم اس قدر زوردار چیخ بلند ہوئی کہ مانو نوشابہ کی جان ہی نکل گئی......وہ قرآنِ پاک کو جزدان میں لپیٹ کر کتنی ہی دیر سینے سے لگائے سکون حاصل کرتی رہی پھر اٹھ کر قرآنِ پاک کو اپنی جگہ پر رکھا اور اپنی بیٹی سیرت کے کمرے کا بند دروازہ کھول کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ اور پیر میں زنجیر بندھی ہوئی تھی' ہاتھ میں موجود زخم سے خون بھی رِس رہا تھا' یقیناً سیرت نے اپنے آپ کو چھڑوانے کے لیے زنجیر سے ہاتھ نکالنے کی کوشش کی تھی اور پھر زخم میں تکلیف کے باعث چیخ اٹھی تھی۔ یہی چیخ نوشابہ نے دُعا مانگتے وقت سنی تھی۔ ایک سرد آہ بھر کر نوشابہ نے دروازہ بھیڑ دیا تھا اور اپنے کمرے میں آ کر اپنے بستر پر لیٹنے کے بعد ماضی کی یادوں میں کھو گئی تھی۔

اَب سے کچھ عرصہ قبل سیرت کی ایسی حالت نہ تھی' وہ تعلیمی میدان سے لے کر امورِ خانہ داری تک ہر چیز میں طاق تھی' سچی صاف اور کھری لڑکی' ماں باپ نے کس قدر محنت اور جانفشانی سے اپنی اولاد کی تربیت کی ہے' سیرت اُس کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ اللہ نے نوشابہ اور احمر کو ایک ہی اولاد سیرت دی تھی جو اپنی مثال آپ تھی۔

احمر ایک سفید پوش انسان تھا' ساری زندگی گورنمنٹ کی جاب کرتے ہوئے اُس نے ایک پیسہ اِدھر اُدھر نہیں کیا' ہمیشہ اپنی اولاد کو رِزقِ حلال کھلایا' اُس کے ساتھ پوسٹ ہوئے ساتھی زندگی کی دوڑ میں اُس کو بہت پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ ایمان داری اور رِزقِ حلال کے معاملے میں شاید احمر بھی اتنا ثابت قدم نہ ہوتا جو اُس کو نوشابہ کی صورت میں اچھی بیوی میسر نہ ہوتی۔

نوشابہ پڑھی لکھی' سمجھدار' رِزقِ حلال اور نصیب پر یقین رکھنے والی' صبر و قناعت کی مٹی سے گندھی انتہائی سلیقہ شعار لڑکی تھی جس نے ہر ہر قدم پر اپنے شوہر کا ساتھ دیا' روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کیا مگر حرام آمدنی سے ملنے والے رِزق کی کبھی چاہ نہیں کی۔ جو ہے' جتنا ہے' کو بہت مانا......اور بیویوں کی طرح شوہر کو کبھی کم آمدنی کے طعنے نہیں دیئے تھے۔

احمر کے بڑے چچازاد بھائی سعادت کا اپنا بہت بڑا کاروبار تھا۔ انہوں نے کئی بار احمر کو اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے کہا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ احمر ایک دیانت دار شخص ہے مگر احمر نے ہمیشہ انہیں بڑے سلیقے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ سعادت بھائی جسے کاروبار کہتے تھے' اسے چلانے کے لیے کئی ہیر پھیر کرنے پڑتے تھے جو کہ احمر جیسے شریف النفس آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔

احمر اور نوشابہ نے سیرت کی بہت دیکھ بھال کر بڑے ارمانوں اور چاہ سے تربیت کی تھی۔ سیرت کی خوش شکل اور اعلیٰ عادات و اطوار کی وجہ سے بہت رشتے آتے تھے مگر چونکہ سیرت ڈاکٹر بننا چاہتی تھی اس لیے بڑی سہولت سے منع کر دیا جاتا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جن دنوں سیرت میڈیکل کے آخری سال میں تھی' اُس کے بعد اُس کا ہاؤس جاب ہونا تھا۔ انہی دنوں احمر کے چچازاد بھائی سعادت اور بھابھی ثمینہ کی آمد ہوئی تھی چونکہ اُن کی آمد خال خال ہی ہوتی تھی جیسے قربانی کا گوشت یا کسی کی شادی کا کارڈ وغیرہ دینے لہٰذا احمر اور نوشابہ اُن کی آمد پر سخت اچنبھے کا شکار تھے۔

سعادت خان کے تین بیٹے تھے' بیٹی کوئی نہ تھی۔ وہ اپنے دو بڑے بیٹوں کی شادی کر چکے تھے

اور اب اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کاشف کے لیے وہ سیرت کا رشتہ مانگنے آئے تھے۔ ''بس بھائی' کیا کہوں' دونوں بیٹوں کی شادی غیروں میں کر کے بہت پچھتائی' بہویں تو ہمیں کچھ سمجھتی نہیں' بس اَب اپنے کاشف کے لیے تو سیرت ہی میری نظر میں ہے۔'' ثمینہ نے کولڈ ڈرنک کے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے بھابھی' مگر سیرت ابھی پڑھ رہی ہے۔'' احمر نے موقع کی مناسبت سے جواب دیا تھا۔

''ہاں تو ہم کب کہہ رہے ہیں فوراً شادی کر دو' بس ذرا منگنی وغیرہ ہو جائے' شادی تو سیرت کی پڑھائی کے بعد ہی کریں گے۔'' سعادت خان نے بھی گھر ہی میں سیرت کے بنائے ہوئے مزے دار سموسوں سے انصاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''دراصل ابھی ہم نے سیرت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے اور ویسے بھی ہم منگنی وغیرہ کو اتنی قابلِ اعتبار رسم نہیں سمجھتے' ویسے جب بھی ہم سیرت کی شادی کا سوچیں گے' آپ سے پہلے پوچھیں گے۔'' نوشابہ نے اپنی طرف سے بات کو سمیٹا تھا۔

''پوچھیں گے؟ نوشابہ' یہ خوب کہی تم نے' سن رہے ہیں سعادت' آپ اپنے بھائی بھاوج کی باتیں!'' ثمینہ نے تنک کر کہا تھا۔

''بھابھی' آپ ناراض نہ ہوں' ہماری ایک ہی بیٹی ہے' یوں جلد بازی میں تو رشتے طے نہیں ہوتے۔ ہمیں کچھ وقت دیں۔'' احمر نے ثمینہ بیگم کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس سے پہلے کہ ثمینہ بیگم کچھ کہتیں' سعادت خان بولے تھے۔ ''احمر! تمہیں جتنا وقت چاہیے' لے لو' بس اتنا خیال رکھنا کہ فیصلہ ہمارے ہی حق میں ہونا چاہیے۔ تم سیرت کی فکر مت کرو' میں تو اپنی بٹیا کو اسپیشلائزیشن کے لیے ملک سے باہر بھی بھیجوں گا۔''

''اور ہاں احمر بھائی! سوچا غیروں کے لیے جاتا ہے' اپنوں میں نہیں۔'' ثمینہ بیگم نے جاتے ہوئے یہ بات بہت زور دے کر کہی تھی۔

•......•......•......•

اُس روز رات کو کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے بیڈ روم میں موجود میاں بیوی کے درمیان گفتگو کچھ یوں جاری تھی۔ ''آپ نے دیکھا احمر! آپ کے چچازاد بھائی اور بھابھی کے کیا تیور تھے جیسے لڑکی کا رشتہ نہیں' اپنا کوئی قرض واپس مانگنے آئے ہوں۔''

''ہوں...... میں بھی یہی سوچ رہا ہوں اور ویسے بھی کاشف کی ریپوٹیشن بالکل بھی اچھی نہیں' گریجویشن بھی کئی بار سپلی دے کر کیا ہے۔''

''ہاں' دیکھیں ناں' اپنے نالائق بیٹے کے لیے تو ہماری سیرت کا خیال آ گیا' جب اپنے لائق فائق بیٹوں کے رشتے کر رہی تھیں' تب یاد ہے' انہوں نے یہ کہا تھا کہ رشتے ہمیشہ برابری کی بنیاد پر ہی پائیدار ہوتے ہیں۔''

''ہاں' مجھے سب یاد ہے' خیر' تم اب اس بات کو ختم کرو' جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔'' احمر نے گویا یہ معاملہ ختم کرنا چاہا تھا۔

''مگر میں آپ کو یہ بتا دیتی ہوں کہ میں سیرت کا رشتہ کسی صورت بھی کاشف کے ساتھ نہیں کروں گی۔'' نوشابہ نے بڑے ہی سخت لہجے میں فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

''اچھا بھئی' اچھا' آج تو تمہارا لہجہ اور انداز ہی کچھ اور ہے۔'' احمر نے قدرے حیران ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ مت بھولیں کہ جب اولاد کی بات ہو تو بلی بھی شیر بن جاتی ہے۔'' نوشابہ نے بہت رسان سے کہا تھا۔

''یعنی پہلے بلی تھیں اور اب شیرنی بن گئی ہو تو پھر میں کیا بنوں؟'' اس بات کے اختتام پر احمر اور نوشابہ کا مشترکہ قہقہہ بلند ہوا تھا مگر شاید اُس وقت اُن کی قسمت بھی دور کھڑی اُن پر قہقہے لگا رہی تھی۔

جب سعادت خان کا سیرت کے رشتے کے لیے اصرار بہت بڑھا تھا تو احمر نے نوشابہ سے مشورے کے بعد انہیں سہولت سے انکار کر دیا تھا جس پر سعادت خان اور ثمینہ بیگم آگ بگولہ ہو گئے تھے اور اپنے تمام رشتے ناطے ختم کرنے کی دھمکی دی تھی جو کہ کارگر نہ ہوئی' سو اپنے بیٹے سے انکار کے انجام کا ڈراوا دے کر وہ دونوں میاں بیوی اُس گھر سے چلے گئے تھے۔

اُس روز کے بعد اُن دونوں میاں بیوی نے خاندان اور ملنے جلنے والوں میں سیرت کے خلاف غلط سلط باتیں مشہور کرنا شروع کر دی تھیں مگر جو لوگ احمر' نوشابہ اور سیرت کو اچھی طرح جانتے تھے' انہوں نے یہ باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دی تھیں اور جو کچھ شرپسند لوگ تھے' انہوں نے یہ باتیں اِدھر اُدھر پھیلائی بھی تھیں' سیرت نے ان سب باتوں کے درمیان ہی اپنا امتحان کامیابی سے پاس کیا تھا اور ہاؤس جاب کی تیاری بھی شروع کی تھی۔

•......•......•......•

سیرت کو ہاؤس جاب شروع کیے ابھی مہینہ ہی ہوا ہو گا کہ نوشابہ بیگم نے اچانک ہی محسوس کیا تھا کہ اُن کی بیٹی گھر کے کسی کام میں حصہ نہیں لے

فلورا......!

اسے تتلیوں کے رنگوں سے عشق بے حد تھا
وہ اکثر ماں سے کہتی تھی، مجھے تتلیوں کے دیس جانا ہے
کہاں پہ دیس ان کا ہے کہاں سے اڑ کے آتی ہیں؟
کہاں پھر کھو یہ جاتی ہیں، مجھے تتلی بنا دو نا
مجھے اڑنا سکھا دو نا
فلورا کی مفلس ماں! سجا کے خواب آنکھوں میں
اسے بھر کے وہ بانہوں میں، دھیرے سے کہتی تھی
یقیں مجھ کو فلورا ہے
تمہاری زیست کا اب تلک جو ورق کورا ہے
اسے رنگین کر دوں گی
تمہیں میں اپنے ''پر'' دوں گی
تمہیں اتنا پڑھاؤں گی
ایئر ہوسٹس بناؤں گی
اڑان پہلی بھرو گی جب
خلاؤں میں اڑو گی تب
تمہیں میں یاد آؤں گی
تمہارے من پسند کھانے میں ٹیبل پر سجاؤں گی
فلورا آنے والی ہے پڑوسن کو بتاؤں گی
مگر اب یہ جانکاہ خبر آئی ہے
فلورا اب نہ آئے گی
پلٹ آؤ میری بیٹی تمہارے ماتھے پہ بوسہ دوں
کہ تم کو تتلیوں کے دیس جانا تھا
پلٹ کر پھر نا آنا تھا کہ
(تمہیں تتلیوں کے رنگوں سے عشق بے حد تھا)
(ایئر ہوسٹس فلورا کی فرسٹ فلائٹ
20 اپریل 2012ء)

صفیہ سلطانہ مغل

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل اُنہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے
محسن بھوپالی
("شکستِ شب" 61ء)

رہی، ہاؤس جاب سے واپسی کے بعد بس چپ چاپ پڑی رہتی ہے۔ انہوں نے سوچا۔ 'شاید جاب سے تھک جاتی ہے۔' اس لیے کوئی باز پرس نہیں کی تھی۔

"سیرت بیٹا......! دیکھو، درزن یہ تمہارے کپڑے دے کر گئی ہے مگر اس میں تمہارے ناپ کا سوٹ نہیں ہے، ناپ کا سوٹ تو تم نے دیا تھا ناں؟"

"ہاں، شاید دیا تھا یا شاید نہیں!" سیرت نے گم صم سے لہجے میں جواب دیا تھا۔

نوشابہ بیگم نے چونک کر بیٹی کو دیکھا تھا، یہ سیرت کا انداز تو ہرگز نہ تھا۔ "سیرت بیٹا......! کوئی مسئلہ ہے کیا، تم پریشان لگ رہی ہو؟"

"نہیں، کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔" کہتے ہوئے سیرت کروٹ لے کر لیٹ گئی تھی۔

اُس کے بعد تو پہلے سیرت نے کھانا پینا چھوڑا اور بستر سے لگ گئی پھر گھر والوں کو پہچاننا چھوڑا، نوشابہ اور احمر نے ہر طرح سے اُس کا علاج کرایا مگر کوئی فرق نہ پڑا بلکہ مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی تھی پھر کسی نے احمر کو ایک بابا جی کا بتایا تھا کہ وہ بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ احمر اور نوشابہ وہاں بھی سیرت کو لے کر پہنچے تھے تو انہوں نے بتایا تھا کہ بچی پر کسی نے بہت سخت سفلی کرایا ہے۔

"مگر بابا! میری سیرت نے کسی کا کیا بگاڑا جو کوئی اُس پر سفلی کرائے گا؟" نوشابہ بیگم نے روتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"بیٹا! یہ سب مجھے نہیں پتہ مگر اتنا بتا دوں، اس بچی کے استعمال کیے ہوئے کپڑے یا کوئی اور چیز تمہارے کسی دشمن کے ہاتھ لگ گئی ہے، اس نے سفلی ان ہی چیزوں کے ذریعے کیا ہے۔"

"بابا جی! اَب اِس کا حل، توڑ کیا ہے؟" احمر نے گڑگڑاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"دیکھو، میں کوئی دعویٰ یا وعدہ نہیں کرتا، میں تو خلقِ خدا کی خدمت کے لیے بیٹھا ہوں، مجھ سے جو بن سکا، کروں گا۔" اس کے بعد بابا جی نے سیرت کا روحانی علاج شروع کرتے ہوئے احمر اور نوشابہ کو اُن کی بیٹی کے حوالے سے کچھ ہدایات بھی دی تھیں۔

احمر اور نوشابہ نے بابا جی کی ہدایت پر سختی سے عمل کیا تھا۔ سیرت کی حالت میں کچھ بدلاؤ بھی آنا شروع ہوا تھا کہ انہی دنوں اچانک بابا جی کا انتقال ہو گیا تھا۔

اُس وقت سے لے کر اب تک احمر اور نوشابہ سیرت کو لے کر کہاں کہاں نہیں گئے، بڑے پیسے برباد کیے مگر کوئی حل نہیں نکلا۔ میڈیا والوں نے بھی اس کیس کو اچھالا، مارننگ شو میں سیرت کو کسی سائیکاٹرسٹ کے حوالے بھی کیا گیا مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

احمر اور نوشابہ کو اب مجبوراً سیرت کو زنجیروں میں باندھ کر رکھنا پڑتا ہے ورنہ وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچا لیتی ہے۔ سیرت کی یہ حالت کیسے ہوئی؟ ایسا کر کے کسی کو کیا ملا؟ ان سوالوں کے ساتھ نوشابہ اور احمر آج بھی پرامید ہیں کہ سیرت ٹھیک ہو جائے گی۔ اُن کا رب سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ بے شک وہ یقیناً ظالموں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے گا۔

☆☆



جویریہ سلیم

درندہ

میں اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ شیر نہیں بلکہ انسانی جسم تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ میرا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ آدم خور کوئی اور نہیں بلکہ......

ایک خونخوار شکاری کی روداد، وہ کسی کی بددعا کا شکار ہو گیا تھا۔



چوہدری جمال انتہائی امیر ترین شخص تھا' کئی ایکڑ اراضی کے علاوہ کئی بھٹوں کا بھی مالک تھا۔ میں ایک عرصہ سے اس کے ساتھ بطور منشی کام کر رہا تھا۔ اس کے بھٹوں کا تمام لین دین کا حساب کتاب میرے پاس تھا۔ میں چوہدری کے خاص لوگوں میں سے تھا۔ وہ مجھ پر ہر طرح سے اعتماد کرتا تھا اور میری ہر بات مانتا تھا۔ اتنا امیر کبیر ہونے کے باوجود اس کا صرف ایک ہی شوق تھا' جنگلی جانوروں کا شکار۔ شکار کا وہ اس قدر شوقین تھا کہ اس پر وقت اور پیسہ دونوں اندھا دھند برباد کرتا تھا۔ ہم اسے 'شکاری مجنوں' کہا کرتے تھے۔ شکار کی وجہ سے اکثر اس کا اپنی بیوی سے جھگڑا رہتا تھا لیکن وہ اپنے شوق سے باز نہیں آتا تھا۔ اس کی بیوی کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کسی روز چوہدری خود ہی شکار نہ ہو جائے مگر چوہدری جمال کا کہنا تھا کہ ابھی تک کوئی جانور ایسا پیدا نہیں ہوا جو اس کی گولی سے بچ نکلے یا خود اسے شکار کر کے لے جائے۔

چوہدری جمال کا نشانہ واقعی غضب کا تھا' اس کی گولی بھی ضائع نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کسی جنگلی جانور نے اسے نقصان پہنچایا تھا۔ اسے اپنی بہادری اور پکے نشانے پر بڑا ہی مان تھا۔ اس کے شکار کے مجنونانہ شوق کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی وہ تمام رات شکار کی دھن میں جنگل میں ہی گزار دیتا تھا۔ اب تو وہ اکثر مجھے بھی اپنے ساتھ شکار پر لے جانے لگا تھا۔ میں مجبوراً اس کے ساتھ جاتا تھا کیونکہ مجھے اس قسم کا قطعی شوق نہ تھا مگر میں اس کے سامنے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شکار کے دوران ایک بات جو میں نے اکثر نوٹ کی کہ جب بھی چوہدری کوئی بڑا شکار کرتا مثلاً کوئی بھینسا' تیندوا یا شیر وغیرہ تو اس کی اپنی شکل بھی درندوں کی طرح خونخوار سی لگنے لگتی تھی۔ اس لمحہ مجھے اس سے بے حد خوف آتا تھا' یوں لگتا جیسے کسی درندے کی روح چوہدری جمال کے اندر سرایت کر گئی ہے۔

....

وہ جنگل شکار کے حوالے سے بہت مشہور تھا۔ لوگ اسے 'بوڑھا جنگل' کہتے تھے کیونکہ وہ بہت ہی پرانا تھا اور اس میں ہر قسم کے جنگلی جانور اور درندے پائے جاتے تھے۔ چوہدری جمال کو جب معلوم ہوا کہ اس جنگل میں شیر اور چیتے بھی ہیں تو اس کی رگِ شوق پھڑ پھڑانے لگی اور پھر اس نے فوراً اس جنگل کے قریب مہنگے داموں زمین خریدی اور وہاں پر بھٹہ لگا لیا۔ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اپنی عارضی رہائش بھی وہیں بنالی تھی۔ کھانا پکانے کے لیے باورچی بھی رکھ لیا گیا' یوں جنگل میں منگل بن گیا۔ 'بوڑھا جنگل' سے دو کوس کے فاصلے پر ایک بڑا گاؤں تھا جس کو 'تارہ گڑھ' کہا جاتا تھا۔ کھانے پکانے کا سامان وغیرہ ہم وہیں سے لاتے تھے۔ اس گاؤں کی آبادی اچھی خاصی تھی۔ گاؤں کے زیادہ تر لوگ زمین داری کرتے تھے۔ چوہدری نے زمین بھی اس گاؤں کے ہی لوگوں سے خریدی تھی۔ گاؤں والوں کے پالتو جانور گائے' بھینس' بکریاں' بھیڑیں وغیرہ اسی جنگل کے نشیبی علاقے میں گھاس وغیرہ چرتے تھے۔ کبھی کبھار جنگلی جانور کسی بکری یا بھیڑ کو گھیر کر مار ڈالتے اور اپنی پیٹ پوجا کا سامان کرتے۔

گاؤں کا ایک غریب چرواہا منیر احمد تھا جسے میرو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کا مرحوم باپ گاؤں کا کمی تھا جس وجہ سے اس کا شمار غریب لوگوں میں ہوتا تھا۔ میرو بچپن سے ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور تھا اور جوان ہونے کے باوجود بھی اس کی بعض باتوں اور حرکتوں سے بچپنا جھلکتا تھا۔ گاؤں والے جن میں بچے' جوان' بوڑھے سب ہی شامل ہوتے تھے' اکثر

اس سے مذاق کر کے اسے تنگ کرتے تھے مگر وہ کسی کی بات یا مذاق کا برا نہیں مناتا تھا۔ اس کی باتوں میں اتنی سادگی اور معصومیت ہوتی تھی کہ لوگ اسے سائیں میرو کہنے لگے تھے۔ وہ گاؤں کے لوگوں کا خادم تھا۔ گاؤں والے اس سے مفت میں اپنے کام بھی کرواتے تھے۔ میرو نے بھی انکار کرنا نہیں سیکھا تھا۔ وہ اَن پڑھ تھا' اسکول کی تو اس نے شکل ہی نہیں دیکھی تھی البتہ کبھی کبھی مسجد میں چلا جاتا تھا مگر دو سال کے عرصہ میں وہ ابتدائی قاعدہ بھی امام مسجد سے نہ پڑھ پایا تھا۔ نماز بھی اسے پوری طرح نہیں آتی تھی مگر وہ پھر بھی مسجد میں جا کر نمازیوں کے ساتھ صف میں کھڑا ہو جاتا اور ان کو دیکھ کر رکوع اور سجود کرتا رہتا۔ کئی نمازیوں کو اس پر غصہ بھی آتا' اسے ڈانٹ بھی پڑتی مگر امام مسجد اس کی حمایت کرتے۔ اس کو نماز سکھاتے تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھتا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اس میں کچھ عقل اور شعور بھی آتا گیا۔ اپنی ماں اور بہن کی کفالت کے لیے اس نے بھیڑ' بکریاں پال لیں۔ صبح ناشتہ کرنے کے بعد وہ بکریاں لے کر جنگل کی طرف نکل جاتا اور شام ڈھلے ان کو لے کر واپس گاؤں آ جاتا۔ اب تو گاؤں کے کچھ لوگ بھی اپنی بکریاں چرانے کی غرض سے میرو کے حوالے کرنے لگے تھے۔ اس کام کے بدلے وہ ہر ماہ اسے کچھ معاوضہ دے دیتے تھے۔ میرو خوش تھا کہ اب وہ کچھ کمانے بھی لگا تھا۔ وہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا مگر جانے کیسے اس نے وارث شاہ کی ہیر بھی یاد کر لی تھی جسے وہ اکثر جنگل میں بکریاں چراتے ہوئے گایا کرتا تھا۔ قدرت نے میرو کی آواز میں خاص قسم کا سوز اور درد بھر دیا تھا۔ اس کی سوز بھری آواز سن کر راہ گیروں کے قدم تھم جاتے تھے۔ جب تک وہ آنکھیں بند کیے سوز بھری آواز میں گاتا رہتا' راہ گیر کھڑے سنتے رہتے۔

اب تو اس نے حضرت بابا بلھے شاہؒ کی ایک کافی کے کچھ بول بھی یاد کر لیے تھے۔ جب وہ "الف اللہ چنبے دی بوٹی" گاتا تو جیسے جنگل کے پرندے بھی اپنی چہچہاہٹ بھول کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے' یوں لگتا جیسے میرو کی آواز کا زمزمہ آبِ حیات بن کر ان کی سانسوں اور سماعتوں میں اترا چلا جا رہا ہے۔

سائیں میرو کبھی کسی کا دل نہیں دکھاتا تھا۔ صلہ کی پروا کیے بغیر دوسروں کے کام آنا اس کی سرشت میں شامل تھا۔ وہ غریب تھا' اس کے پاس اچھا لباس نہیں تھا' اچھا کھانا اس کے نصیب میں نہیں تھا مگر وہ پھر بھی اپنے نصیب پر خوش اور شاکر تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کائنات کی ہر شے دوسروں کے لیے ہے۔ درخت اپنا پھل خود نہیں کھاتے' دریا اپنا پانی خود نہیں پیتے' یہ بہاریں' یہ برساتیں' یہ نغمے سب دوسروں کے لیے ہیں اور وہی زندگی مسرتوں سے ہمکنار ہوتی ہے جو دوسروں کے لیے ہو۔

میرو کو سب سے زیادہ پیار اپنی بکریوں سے تھا' وہی اُس کی کُل کائنات تھیں۔ وہ ان کی ذرا سی تکلیف پر یوں تڑپ اٹھتا تھا گویا اس کی جان پر بن گئی ہو۔ وہ ان سے باتیں کرتا تھا' بکریاں بھی اس کی باتیں سمجھتی تھیں اور اس پر عمل بھی کرتی تھیں۔

گاؤں کے لوگوں کی زبانی مجھے علم ہوا کہ ایک بار دو بھیڑیوں نے اس کی ایک بکری کو گھیر کر مار ڈالا تھا۔ اُس روز سائیں میرو بہت رویا تھا۔ لگتا تھا جیسے اُس کا کوئی عزیز فوت ہو گیا ہو۔ اس نے بکری کے سوگ میں دو دن کھانا بھی نہیں کھایا اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بھیڑیوں کو بددعائیں دی تھیں۔

"اے اللہ......! تو ان درندوں کا اس جنگل سے خاتمہ کر دے۔ انہیں اس جنگل سے نکال دے۔"

میرو کے دل سے نکلی ہوئی معصوم دُعاؤں کا اثر

تھا کہ بھیڑیئے یہ جنگل چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلے گئے کیونکہ اس کے بعد آج تک کسی نے اس جنگل اور علاقہ میں بھیڑیئے کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ اب تو میرو کی بکریوں سے محبت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ ہردم اُن کی ہی فکر کرنے لگا تھا۔

گاؤں کے لوگ اب میرو کو اللہ کا خاص بندہ کہتے تھے۔ کئی تو اُس سے کسی مقصد کے لیے دُعا بھی کراتے تھے اور اس کی دُعائیں بارگاہِ الٰہی میں شرف قبولیت بھی حاصل کرتی تھیں مگر کچھ لوگ میرو سے اب بھی مذاق کرتے اور اسے تنگ بھی کرتے تھے مگر وہ کسی بات اور تضحیک کا برا نہیں مناتا' اُسے تو بس اپنی بکریوں سے پیار تھا' وہ اُن سے اس طرح باتیں کرتا جیسے انسان ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ وہ اُن سے اپنے دکھ اور غم بانٹتا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ بے زبان جانور کسی کو دکھ نہیں دیا کرتے' کسی کا حق نہیں مارتے' کسی کا خون نہیں بہاتے۔ یہ اعزاز صرف انسان کو ہی حاصل ہے کہ اپنے مفاد کی خاطر تمام حدود پھلانگ ڈالتا ہے۔

میں جب میرو سے ملا تو میں نے اسے ویسا ہی پایا جیسا سنا تھا۔ وہ واقعی خدا کا محبوب بندہ تھا۔ میں اس کی سادگی' معصومیت اور اس کے من کی سچائی سے بہت ہی متاثر ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے نہ صرف اس سے ہمدردی بلکہ ایک اُنس سا ہو گیا۔ اب وہ جب بھی بکریاں چراتے ہوئے چوہدری کے بھٹے کی طرف آتا تو میرے پاس ضرور بیٹھتا۔ میں اس سے باتیں کرتا اور اس سے حضرت بابا بلھے شاہؒ کی کافی ضرور سنتا۔ میں نے ایک دوبار کافی سن کر انعام کے طور پر اسے کچھ رقم دینا چاہی تو اس نے رقم لینے سے صاف انکار کر دیا۔ میرا اصرار زیادہ بڑھا تو اس نے بھٹے کی طرف آنا ہی چھوڑ دیا۔ اسے روپے پیسے کا قطعی لالچ نہیں تھا۔ علاقے میں اس کی کسی سے دوستی تھی نہ ہی دشمنی۔ بکریاں ہی اس کی دوست اور ہمدم تھیں۔ اپنے ریوڑ میں اسے دو بکریاں کچھ زیادہ ہی پسند تھیں' اس نے ایک کا نام رانو اور دوسری کا بانو رکھا ہوا تھا۔ وہ دونوں تھیں بھی بہت خوبصورت۔ میرو اُن کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھتا تھا۔ اس نے جب میرے پاس آنا چھوڑا تو میں نے ایک دوبار اس کے پاس جا کر اسے منانے کی کوشش کی تو وہ بڑے ہی معصومانہ انداز میں کہنے لگا۔

"منشی جی......! آپ بڑے لوگ ہیں' پیسے والے ہیں اور میں غریب چرواہا...... میرا آپ کا کیا ملاپ۔"

میں کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ واپس لوٹا تو پتہ چلا کہ بوڑھا جنگل میں ایک شیر کی موجودگی کی خبر ملی ہے۔ چوہدری جمال نے اپنے شکاری ساتھیوں کی مدد سے خاص مقام پر ایک بکری باندھ دی تھی تاکہ شیر اس کو شکار کرنے کے لیے آئے اور خود شکار ہو جائے۔ میں بھی اس مقام کو دیکھ آیا جہاں بکری بندھی ہوئی تھی۔ بکری کو دیکھ کر مجھے شبہ ہوا کہ یہ بکری تو میرو کی ہے۔ میں نے چوہدری جمال اور ان کے دوستوں سے پوچھا کہ کیا تم لوگ یہ بکری خرید کر لائے ہو؟ اور اگر خرید کر لائے ہو تو کس سے اور کتنے میں خریدی ہے؟

وہ کہنے لگے۔ "نہیں' خرید کر نہیں لائے' یہ ہمیں یہاں جنگل میں چرتی ہوئی مل گئی تھی' شاید ریوڑ سے بچھڑ گئی ہے۔ ہم اس کو پکڑ لائے اور یہاں باندھ دی ہے۔"

"یہ تو اچھی بات نہیں ہے' آپ کو بکری خرید کر لانی چاہیے تھی۔ اس کا مالک آ گیا تو؟"

"مالک آ گیا تو اُس کو بکری کی قیمت دے دیں گے۔" چوہدری لاپروائی سے بولا۔

مجھے چوہدری کا یہ انداز بالکل اچھا نہ لگا مگر میں خاموش رہا۔ اس بکری اور میرو کے بارے میں سوچ سوچ کر رات کو بھی مجھے اچھی طرح نیند نہ آئی۔ صبح صبح ہم ابھی ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ میرو بھٹے پر آ گیا۔ وہ سیدھا میرے پاس آیا۔

"منشی جی......! میری بکری رانو کل سے غائب ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ چوہدری جمال کے آدمیوں نے اسے پکڑا ہے۔ آپ میری بکری واپس دلوا دیں ناں۔" میرو کی آنکھوں میں آنسو اور لہجے میں التجا تھی۔

اتنے میں چوہدری جمال اپنے کمرے سے باہر آیا اور میرو کو غصے سے کہنے لگا۔

"تیری بکری میں نے پکڑی ہے' بتا' اُس کی کیا قیمت لے گا؟"

میرو نہایت ہی عاجزی سے بولا۔ "میں نے بکری بیچنی نہیں ہے۔ رانو کو میں نے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔ مجھے اس سے بہت محبت ہے۔"

چوہدری جیسے سنگدل انسان پر بھلا میرو کی باتوں کا کیا اثر ہوتا' وہ کرخت لہجے میں بولا۔ "میں اسے ہر حال میں خریدوں گا اور تجھے اسے فروخت کرنا ہو گا۔"

میرو نے ایک سرد سی آہ بھری اور مجھے کہنے لگا۔ "منشی جی' میری بکری دلوا دیں ناں' رانو میں تو میری جان ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی چوہدری بول پڑا۔ "اب وہ بکری تمہیں کبھی نہیں مل سکے گی۔ اب تو وہ شیر کی خوراک بن چکی ہو گی......" یہ کہہ کر چوہدری نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے کچھ روپے نکال کر میرو کے سامنے زمین پر ڈال دیئے اور رعونت بھرے انداز میں بولا۔ "انہیں اٹھا اور اپنی شکل گم کر......" میں نے دیکھا' دکھ اور غم کی کیفیت سے میرو کی حالت بدل گئی تھی۔ چوہدری کا یہ انداز اسے بہت ہی برا لگا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرو کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہوں۔ وہ غصہ سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے نوٹوں کی طرف نگاہ بھی نہ ڈالی' اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور پھر ہاتھ بھی اٹھا لیے۔ اس کے ہونٹ تیزی سے ہلنے لگے اور آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو گئے۔ میں جان گیا کہ وہ چوہدری کو بددعا دے رہا ہے۔ وہ کافی دیر روتا رہا اور بددعا کرتا رہا اور پھر لاغر سا ہو کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا واپس لوٹ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائے گا۔

میرو کی بکری تو واقعی شیر کی غذا بن گئی تھی مگر شیر پھر بھی شکار نہ ہو پایا تھا۔

کئی دن گزر گئے' میں کوشش کے باوجود میرو کی روتی آنکھوں کو نہ بھلا پایا تھا۔ اس کی آنکھیں ہر لمحہ مجھے اپنے اردگرد گردش سی کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ ایک روز میں اس کی خبر لینے اس کے گاؤں گیا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ میرو بیمار ہے۔ میں اس کے گھر چلا گیا۔ میں نے دیکھا' وہ چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور برسوں کا مریض لگ رہا تھا۔ رانو کی جدائی نے اسے اس حال تک پہنچا دیا تھا۔ میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی مگر وہ زبان سے کچھ نہ بولا۔ لگتا تھا' وہ مجھ سے بھی ناراض ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیسے اس کو راضی کروں؟ کیسے اس کا دکھ بانٹوں؟ کیسے اس کا نقصان پورا کروں؟ لہٰذا میں شرمندہ سا ہو کر لوٹ آیا۔

چند دنوں بعد خبر ملی کہ میرو فوت ہو گیا ہے۔ میں نے اس کے جنازے میں شرکت کی۔ اس کے جنازے میں بہت لوگ تھے اور وہاں موجود ہر فرد کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ہر ایک زبان اس کی شرافت'

سادگی اور ایمان داری کی تعریف کر رہی تھی، یوں ہی دو ماہ بیت گئے مگر میں میرو کو بھلا نہیں سکا۔ میں جب کبھی بکریوں کو دیکھتا تو مجھے میرو یاد آ جاتا، یوں لگتا جیسے وہ ''الف اللہ چمبے دی بوٹی'' گا رہا ہو۔

•......•......•......•

کئی دنوں سے میں چوہدری کے تیور بدلے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ اس میں غصہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بات بات پر جھگڑا کرنا اور بھٹہ پر کام کرنے والوں کو مارنا پیٹنا شروع کر دیتا۔ وہ اُن غریبوں کو اتنی بے دردی سے مارتا کہ خدا کی پناہ! میں اسے سمجھاتا تو وہ میری بات سنی اَن سنی کر دیتا۔ اس کے چہرے پر ہمہ وقت وحشت چھائی رہتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مزدور ایک ایک کر کے بھٹے سے بھاگنے لگے۔ میں اِدھر اُدھر کے دیہاتوں میں جا کر مزدور ڈھونڈ کر لاتا، وہ بھی ایک دو دن بعد چوہدری کے رویئے سے بھاگ جاتے۔

ایک روز میں چوہدری کے کمرے میں گیا تو میں نے دیکھا کہ اس نے مٹی سے بنا ہوا ایک کھلونہ نما شیر رکھ ہوا ہے اور اس کو دیکھ کر شیر کی طرح غرا رہا ہے۔ اس کی آواز میں کچھ ایسی ہیبت تھی کہ میں خوف زدہ سا ہو کر لوٹ آیا۔ اس کے بعد اس نے وہ کھلونہ شیر اپنی جیب میں رکھنا شروع کر دیا۔ وہ دن میں کئی بار اس کھلونے کو جیب سے نکال کر دیکھتا اور پھر جیب میں ڈال لیتا اور کبھی اس کو ہاتھ میں پکڑے پکڑے ہی سو جاتا پھر جانے کیا ہوا کہ آہستہ آہستہ چوہدری کی غذا بھی کم ہوتی گئی۔ اس نے کھانا پینا نہایت ہی کم کر دیا تھا۔ میں اصرار کرتا تو کہتا کہ بھوک ہی نہیں ہے۔ کبھی کبھار وہ معمولی سا کھانا کھا لیتا اور کھاتا بھی تو عجیب طریقے سے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گوشت کی بوٹیوں کو منہ میں دبا کر نوچا کرتا بالکل ایسے جیسے جانور کھاتے اور نوچتے ہیں۔

میں اس کی ان حرکتوں پر حیران ہوتا اور سوچتا کہ چوہدری پہلے تو ایسا نہ تھا، اب اس میں یہ تبدیلی کیوں آ رہی ہے؟

ایک مزدور نے بتایا کہ چوہدری کو وہ کھلونا اُس مٹی میں سے ملا تھا جو وہ اینٹوں کے لیے ایک کلو... کے فاصلے پر سے کھود کر لائے تھے۔ جب ہم نے وہ مٹی بھٹے پر لا کر پھینکی تو چوہدری قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے وہ مٹی کا کھلونہ اٹھا لیا، اس کو صاف کیا اور غور سے دیکھنے کے بعد جیب میں ڈال لیا، تب سے چوہدری کی طبیعت میں یہ وحشیانہ پن سا آ گیا ہے اور اس کی آنکھوں میں بھی وحشت سی ناچتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، یوں لگتا تھا کہ جیسے کسی جانور کی روح اس کے جسم میں داخل ہو گئی ہو۔ اب وہ انسان کم اور درندہ زیادہ لگتا تھا۔

اُن ہی دنوں 'بوڑھا جنگل' میں ایک آدم خور شیر آ گیا۔ وہ بہت ہی خوفناک قسم کا تھا۔ ہفتہ دس دن میں وہ کسی نہ کسی مزدور کو ہلاک کر ڈالتا۔ اگر رات کو کوئی بھی مزدور جھونپڑی سے نکلتا تو وہ زندہ لوٹ کر نہ آتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک مرے ہوئے مزدور کی حالت دیکھی تھی۔ اس کا گلہ چبایا گیا تھا اور شیر نے اس کا خون پی کر لاش وہیں چھوڑ دی تھی۔ جب ایسے کئی واقعات متواتر رونما ہوئے تو چوہدری جمال بندوق اٹھا کر رات کو اُس کی تلاش میں نکل پڑتا لیکن چونکہ آدم خور کا کوئی خاص مقام نہیں تھا اس لیے شیر اور چوہدری کے مقابلہ کی نوبت ہی نہ آئی۔ ایک روز تمام مزدوروں نے مل کر جنگل میں اُس آدم خور شیر کو تلاش بھی کیا لیکن وہ جنگل تو بہت بڑا تھا، آدم خور شیر کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

ایک رات مزدوروں کا ٹھیکے دار بھی اُس کا شکار ہو گیا۔ اُس کی خوفناک چیخیں سن کر سب موقع پر پہنچے لیکن وہ مر چکا تھا۔ اس کا بھی گلہ چبایا گیا تھا۔ اس کے بعد ہم سیڑھی لگا کر کمروں کی چھت پر سونے لگے۔ تین ہفتوں کے وقفے کے بعد ایک اور مزدور ایسی ہی موت مارا گیا۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ وہ جھونپڑی کے اندر تھا اور اس کے دروازے کی کنڈی بھی لگی ہوئی تھی۔ اب مزدور یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ کوئی شیر نہیں بلکہ جن یا بھوت ہے......

چوہدری بھی پریشان ہو گیا تھا۔ وہ ایک ماہر شکاری تھا مگر اُس شیر کو مارنے میں اسے مسلسل ناکامی ہو رہی تھی۔ اس کی عقل اس معاملہ میں کام نہیں کر رہی تھی۔ وہ بھی یہی کہتا تھا کہ یہ کوئی بھوت یا جن ہے جو شیر کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور انسانوں کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔ بھٹہ پر مزدور کم ہو گئے تھے اس لیے اینٹیں بھی کم بن رہی تھیں۔

ایک روز میں نے چوہدری سے کہا کہ ہم یہ بھٹہ بند کر دیتے ہیں اور کسی اور جگہ چلتے ہیں مگر وہ نہ مانا۔

''جب تک میں اس آدم خور کی جان نہ لے لوں، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔'' اس کے لہجے میں غصہ اور وحشت نمایاں تھی لہٰذا میں خاموش ہو گیا اور اِدھر اُدھر کے گاؤں میں بھاگ دوڑ کر کے مزدوروں کا کوٹہ پورا کر لیا۔

چاندنی راتیں شروع ہو گئی تھیں۔ ایک روز پھر بھٹے کے قریب گلہ چبانے کا واقعہ پیش آیا۔ چوہدری غصہ کے عالم میں بندوق لے کر نکل گیا اور اگلی صبح جب وہ واپس آیا تو کہنے لگا۔

''میں نے شیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے مگر اس پر گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ وہ زندہ نکل گیا ہے مگر کب تک، آخر اس کی موت میرے ہاتھوں ہی ہو گی......''

میں نے پوچھا۔ ''وہ کس قسم کا شیر ہے؟''

''جیسے شیر ہوتے ہیں، ویسا ہی ہے البتہ انسانی خون پینے سے اس کا چمڑا کمرے کی دیوار پر لٹکانے کے قابل نہیں رہے گا۔''

ایک روز اس شیر نے گاؤں کے ایک آدمی کو مار ڈالا اور اس کا خون چوس کر فرار ہو گیا۔ گاؤں کے لوگ گروپ کی صورت میں چوہدری کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ تم ماہر شکاری ہو، تم ہی اس کو مارنے کا ذمہ لو۔ اس معاملہ میں ہم بھی تمہارا ساتھ دیں گے۔

چوہدری نے ان کی بات غور سے سنی اور کہنے لگا۔ ''میں تو خود اُس کی تلاش میں ہوں، اُس نے میرے کئی مزدوروں کو مار ڈالا ہے۔ آپ سب بے فکر ہو جائیں، میں شیر کو مارنے کے بعد اُس کی لاش آپ لوگوں کو دکھانے کے لیے آپ کے گاؤں لاؤں گا۔'' وہ لوگ مطمئن ہو کر واپس لوٹ گئے مگر اُن میں سے ایک آدمی وہیں رک گیا۔ جب چوہدری اِدھر اُدھر ہوا تو وہ میرے قریب آیا اور کہنے لگا۔

''منشی جی......! میں بھی چرواہا ہوں اور میرو مرحوم کا ساتھی بھی۔ میں اگر آپ کو شیر قریب سے دکھا دوں تو کیا آپ اُسے مار ڈالیں گے؟''

''تم چوہدری کو بتاؤ، وہ اُسے یقیناً مار ڈالے گا۔'' میں نے اسے ٹالنا چاہا۔

''میں چوہدری کی نہیں، آپ کی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے قریب کے ایک چشمہ کے کنارے ایک بڑے سے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ تنہا آج رات کسی کو بتائے بغیر اس درخت پر چڑھ جائیں اور بقیہ رات وہیں گزاریں تو صبح کو کسی بھی وقت وہ درندہ آپ کو چشمہ کا پانی پیتا ہوا مل جائے گا اور اس طرح آپ قریب ہونے پر اس کا آسانی سے شکار کر سکیں گے۔''

چرواہا چلا گیا اور میں اُس کی باتوں پر غور کرنے

لگا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں سونے کی غرض سے لیٹ گیا مگر نہ جانے کیوں نیند آنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ چرواہے کی باتیں دماغ میں گھوم رہی تھیں۔ میں نہ چاہنے کے باوجود بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور چشمے کے کنارے برگد کے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ چاندنی اپنے جوبن پر تھی اس لیے ہر چیز صاف اور واضح نظر آ رہی تھی۔ میں خوفزدہ بھی تھا کہ کہیں آج شیر کا شکار میں ہی نہ بن جاؤں۔ میں دل ہی دل میں قرآنی آیات کا وِرد بھی کر رہا تھا۔ رات خاموش تھی، ہر طرف سکوت طاری تھا اتنا کہ ہوا سے معمولی خشک پتے کے ہلنے کی آواز بھی بخوبی سنائی دیتی تھی اور اگر کوئی جنگلی چوہا اِدھر اُدھر بھاگتا تو اس کی کھڑکھڑاہٹ سے مجھے شیر کی آمد کا شبہ ہونے لگتا۔ تمام شب میری یہی حالت رہی۔ خدا خدا کر کے صبح کے آثار نمودار ہوئے۔ ابھی میں درخت سے اترنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ مجھے کوئی چیز آہستہ آہستہ پانی کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ وہ کوئی عجیب وغریب چیز تھی، میں اس کو دیکھ کر ششدر رہ گیا کیونکہ وہ شیر نہیں بلکہ ایک انسانی جسم تھا، وہ برہنہ تھا اور خونخوار شیر سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے اپنا خون آلود چہرہ اور ہاتھ پانی سے دھوئے اور جب اس نے جھاڑی کے اندر سے اپنے کپڑے نکال کر پہنے تو میں نے اسے پہچان لیا، جو کچھ میں نے دیکھا تھا، اس پر مجھے خود یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ وہ آدم خور چوہدری جمال تھا...... اس کی حالت خونخوار درندے جیسی تھی...... میرا جسم تھر تھر کانپنے لگا، چوہدری کا یہ بھیانک روپ دیکھ کر مجھے میرو اور اس کی دی ہوئی بددعا یاد آ گئی جو اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر چوہدری کو دی تھی۔

جب چوہدری جمال واپس بھٹہ کی طرف روانہ ہوا تو میں درخت سے اترا اور پیدل ہی سڑک کی طرف چل پڑا۔ میں نے ڈیرے پر پڑے ہوئے اپنے سامان اور رقم کی بھی پروا نہیں کی اور سیدھا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا کیونکہ مجھے اپنی جان عزیز تھی۔ میں چوہدری کا اگلا شکار نہیں بننا چاہتا تھا میں نے نہ صرف چوہدری کو بلکہ وہ علاقہ ہی چھوڑ دیا اور لوٹ کر کبھی اُس طرف نہیں گیا۔ بعد میں میں نے شہر میں ایک تعمیراتی کمپنی میں ملازمت کر لی اور چوہدری جمال کو ہمیشہ کے لیے بھول گیا۔

اس واقعے کو چھ ماہ گزر گئے تھے۔ ایک روز اخبار کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک خبر کی سرخی پڑھ کر میں چونک گیا۔

"آدم خور انسان کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا......"

میں نے خبر کی تفصیل پڑھی تو وہ چوہدری جمال کے بارے میں تھی۔ لکھا تھا کہ چوہدری جمال آدم خور بن گیا تھا۔ وہ کئی انسانوں کا خون پی چکا تھا مگر کسی کو معلوم ہی نہیں تھا۔ جب اس نے اپنی بیوی اور ایک بیٹی کا خون پیا تو تب حقیقت کا علم ہوا کہ چوہدری جمال آدم خور اور جنونی بن گیا ہے۔ اس نے اپنے گاؤں کے تین انسانوں کا بھی خون پیا تھا اس لیے گاؤں کے لوگوں نے اسے پکڑ کر زنجیروں سے باندھ دیا۔ اس نے پچاس کے لگ بھگ انسانوں کے خون پینے کا اقرار کیا تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے اسے گولیوں سے بھون ڈالا اور اس کی لاش جانوروں کی طرح ایک گڑھے میں دبا دی تھی۔

پوری خبر پڑھ کر مجھے چوہدری کے انجام پر دکھ ہوا کیونکہ میں اس کا نمک خوار رہا تھا مگر اس کا انجام بھی تو یہی ہونا چاہیے تھا...... کاش سائیں میرو کا دل نہ دکھاتا تو وہ انسان سے درندہ نہ بنتا۔

نعمان اسحاق

دردِ مشترک

نومولود کے رونے کی آواز کانوں سے ٹکرائی تو وہ ممتا کے محبت بھرے احساسات سے سرشار ہو گئی۔ آنے والا بیٹا تھا اور جب اس نے بیٹے کو دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی۔

ایک پری کی محبت کا حیرت انگیز اور ناقابل یقین ماجرا



بڑے سے آنگن کے انتہائی دائیں کونے میں بیت الخلا اور غسل خانے کے ساتھ پانی کی لال موٹر گھرر، گھرر کی آواز کے ساتھ چل رہی تھی۔ چند منٹوں میں غسل خانے کے اوپر رکھی نیلی ٹنکی بھر گئی اور پانی ترپ، ترپ کی آواز کے ساتھ کچے فرش کو گیلا کرنے لگا۔ گھرر گھرر اور ترپ ترپ کی آوازیں مل کر ایک عجیب سا شور آنگن میں پیدا کر رہی تھیں۔ آنگن کے بیچوں بیچ چارپائی پر بیٹھی فاطمہ کی ابھی سورۃ یوسف کی آخری آٹھ آیتیں رہتی تھیں کہ بادل ناخواستہ اسے موٹر بند کرنے اٹھنا پڑا۔ موٹر بند کرنے کے بعد وہ دوبارہ چارپائی پر آن بیٹھی اور سورۃ یوسف کی تلاوت کرنے لگی۔ سورۃ ختم ہوئی تو فاطمہ نے قرآن مجید بند کیا۔ ساتھ پڑے پانی کے گلاس میں پھونک ماری اور پانی کو گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ سورۃ یوسف کی فضیلت پر اسے پورا یقین تھا اسی لیے تو اپنے اور سلطان کے بیٹا ہونے کی خواہش کے پورا ہونے کا بھی یقین تھا۔ قرآن مجید اندر کمرے میں رحل میں رکھنے کے بعد اس نے ایک بار محبت پاش نظروں سے اپنے بڑھے ہوئے حاملہ پیٹ کو دیکھا اور مسکرا دی۔ سلطان کے آنے کا وقت ہو چلا تھا اسی لیے وہ باورچی خانے میں چلی آئی اور روٹیاں پکانے کی تیاری کرنے لگی۔

سلطان اور فاطمہ کی شادی کو پورے نو سال ہونے والے تھے۔ فاطمہ اس دوران پانچ بار حاملہ ہوئی تھی۔ تین بار بیٹیاں پیدا ہوئیں، ایک بار حمل گر گیا اور اب کے بار بھی حمل کو چھ مہینے کو آئے تھے۔ گاؤں کی سب سے بوڑھی اور سب سے جہاندیدہ خاتون نے اسے زچگی تک سورۃ یوسف کی تلاوت کی تلقین کرتے ہوئے کہا تھا۔

"قرآن مجید میں ہماری ہر مشکل کا حل موجود ہے۔ جب اکرم ہونے والا تھا تو میں سورۃ یوسف پڑھتی تھی۔ اسی طرح جب اکرم باپ بننے والا تھا تو اس کی بیوی کو بھی میں نے یہ سورۃ پڑھنے کو کہا تو بھی یہی پڑھا کر، انشاء اللہ، پتر ہی ہوگا۔" اور جب سے اس خاتون نے فاطمہ سے یہ کہا تھا، تب سے اب تک وہ دلجمعی سے سورۃ یوسف پڑھ رہی تھی۔

سلطان ایک صابر و شاکر مرد تھا، لوئر پنجاب کے اسی مکانوں پر مشتمل اس گاؤں کے تمام لوگ سلطان کی عزت کرتے تھے۔ ایک مربع کے لگ بھگ زمین اسے اپنے والد سے وراثت میں ملی تھی جس میں گزرتے سالوں کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ فاطمہ، سلطان کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی بیوی شادی کے پہلے سال ہی ہیضے کا شکار ہو کر چل بسی تھی۔ پنجاب کے اس دوردراز کے گاؤں میں طبی سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں اس لیے شرح اموات بھی زیادہ تھیں۔ الٹراساؤنڈ سے پانچویں مہینے میں بچے کی جنس کا تعین ہو جاتا ہے، اس بات سے بھی لوگ قریب قریب ناآشنا تھے۔

وقت تیزی سے بیت گیا اور زچگی کے تکلیف دہ مراحل سے گزرنے کے بعد جب فاطمہ کے کانوں سے نومولود کے رونے کی آواز ٹکرائی تو وہ ممتا کے محبت بھرے احساسات سے سرشار ہوگئی۔ آنے والا بیٹا تھا لیکن دائی کی آنکھوں میں حیرانی تھی اور جب فاطمہ نے بیٹے کو دیکھا تو اس کی چیخ ہی نکل گئی۔

اس کا بچہ عجیب شکل وصورت کا تھا، چہرے پر آنکھیں ایک دوسرے سے دور اور کانوں کے بہت قریب تھیں، ناک کی جگہ صرف دو نتھنے تھے اور اوپر والا ہونٹ بھی کٹا ہوا تھا، بازو سرے سے تھے ہی نہیں، کندھے سے انگلیاں جڑی ہوئی تھیں۔

فاطمہ زور زور سے رونے لگی۔ دائی نے باہر آ کر مبارکباد دینے کے بجائے مایوسی سے کہا۔

"خدا دی مرضی ہے جی......!"

بے قرار سا سلطان اندر کمرے میں آیا، روتی ہوئی فاطمہ کو دیکھ کر اس کا دل دھڑکنے لگا اور بیٹے پر نظر پڑی تو وہ ٹھٹک کر رہ گیا پھر وہ سنبھلا اور فاطمہ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"صبر کر فاطمہ، خدا دی مرضی تو غم نہ کر۔" فاطمہ کو دلاسہ دیتے ہوئے اس نے یہ بات اپنے آپ کو بھی باور کروائی تھی۔

•......•......•......•

فاطمہ نے ہتھیلی پر ٹالکم پاؤڈر ڈال کر اسے اچھی طرح ملا اور پھر حماد کے چہرے پر، سینے پر اور پشت پر آہستہ آہستہ ملنے لگی، آنکھوں میں سلائی بھر بھر کر سرمہ ڈالا، سفید لان کا پاجامہ پہنایا اور جھولے میں ڈال کر جھولا جھلانے لگی۔

شروع شروع میں فاطمہ کا خیال تھا کہ اسے حماد سے نفرت ہے لیکن اس کا خیال غلط تھا، اسے حماد سے محبت تھی جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ حماد کو دیکھتے ہی اس کی ممتا خود بخود عود آتی اور وہ حماد کو چٹاچٹ چومنے لگتی۔ اب تو اسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ حماد انسان کا بچہ نہیں لگتا۔ حماد اس کا بیٹا ہے، بس یہی ایک خیال ذہن کو گھیرے میں لیے رہتا کہ کچھ اور سوچنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔

حماد کی پرورش فاطمہ کے لیے مشکل ثابت ہو رہی تھی۔ اس کی تینوں بیٹیاں اپنی عمر کے پہلے سال میں بہت کم بیمار ہوئی تھیں لیکن حماد تو آئے دن بیمار رہتا تھا، الٹیاں، دست، بخار اور نہ جانے کیا کیا، جان ہی نہ چھوڑتا۔ وہ کبھی گاؤں کے واحد ڈاکٹر صاحب سے دوا لیتی تو کبھی اپنی ماں اور ساس کے بتائے گئے ٹوٹکوں پر عمل کرتی اور جو تھوڑا بہت افاقہ ہوتا، اس پر شکر کرتی۔

ایک اور بات جو فاطمہ کو وہم میں مبتلا کیے دیتی کہ حماد کی عادات بھی کچھ غیر فطری تھیں، رونے پر آتا تو پہروں روتا رہتا، ہنستا تو ہنستا ہی رہتا اور جب وہ ہنستا تو فاطمہ کو خوف محسوس ہوتا کیونکہ حماد کی ہنسی کسی طور فطری نہ ہوتی۔ فاطمہ نے اس بات کا تذکرہ سلطان سے بھی کیا اور جب ایک مرتبہ حماد کافی دیر اکیلا لیٹا ہنسے جا رہا تھا تو فاطمہ نے سلطان کو بھی دکھایا تھا۔ سلطان نے کچھ دیر ہنستے ہوئے حماد پر غور کیا، عجیب تو اسے بھی لگا لیکن اُس نے اِس پر زیادہ نہیں سوچا۔

"نیک بخت، تو فکر کیوں کرتی ہے، جیسے ہمارا بیٹا دوسرے بچوں سے الگ ہے، اسی طرح اس کی عادتیں بھی الگ ہیں۔"

فاطمہ کی ساس زیتون بیگم ایک سمجھدار اور معمر خاتون تھیں۔ حماد کی عادتیں اسے بھی پریشان کرتی تھیں۔ کافی عرصہ وہ کچھ کہنے سے گریزاں رہیں لیکن ایک دن انہیں کہنا ہی پڑا۔

"دیکھ بیٹی، جو بات میں کہنے والی ہوں، اس پر ناراض نہ ہونا۔ حماد میرا بھی پوتا ہے......" اتنا کہہ کر فاطمہ کی ساس خاموش ہو گئیں اور سر جھکا کر بیٹھی فاطمہ نے سر اٹھا کر اپنی ساس کو دیکھا تھا۔ زیتون بیگم نے کچھ بولنے سے پہلے ایک لمبا وقفہ لیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ حماد پر کسی شے کا سایہ ہے۔ میرا مطلب ہے، کسی جن یا پری کا......" فاطمہ اپنی ساس کو بس چپ چاپ دیکھتی رہ گئی۔ زیتون بیگم اور بھی بہت کچھ فاطمہ کو بتاتی رہیں اور سمجھاتی رہیں جس کا لب لباب یہی تھا کہ جن اور پریوں کی مخلوق بھی خدا کی بنائی ہوئی ہے جو اپنا وجود رکھتی ہے اور ان کے خیال کے مطابق حماد پر جس پری کا سایہ ہے، وہ کوئی شریر قسم کی نہیں اور نہ ہی حماد کو کسی قسم کا نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔ فاطمہ چپ چاپ ساس کی باتیں سنتی رہی البتہ اٹھنے سے پہلے انہیں اتنا کہا کہ اس بات کا ذکر کسی سے مت کیجیے گا۔

پہلے پہل تو فاطمہ، ساس کی باتیں جھٹلاتی رہی لیکن پھر حماد کی غیر فطری عادات نے اسے بھی شک میں مبتلا کر دیا اور اسی شک کے ہاتھوں مجبور ہو کر فاطمہ بنا کسی سے کچھ کہے، سورۃ جن اور سورۃ الناس پڑھ پڑھ کر گھر بھر کے کونے کھدروں میں پھونکیں مارنے لگی اور حماد کے گلے میں بھی ایک لاکٹ ڈال دیا جس پر اللہ کا نام کندہ تھا۔

دو تین ہفتے گزرے ہوں گے کہ ساتھ والے گاؤں سے سلطان کی خالہ صحت خاتون بہن سے ملنے کے لیے آئیں۔ فاطمہ کی ساس بھی بہن کے آنے سے خوش ہو گئیں۔ اب تو برآمدے میں بچھے تخت پر دونوں بہنوں کی لمبی لمبی نشستیں ہونے لگیں۔ صحت خاتون رعب دار شخصیت کی حامل تھیں۔ اللہ والی اور صوم وصلوٰۃ کی تو جوانی سے پابند تھیں۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ کسی زمانے میں جن بھی ان کے تابع تھے البتہ وہ خود اس موضوع پر بات نہیں کرتی تھیں۔ حماد کی پیدائش سے پہلے ایک بار فاطمہ نے اس بارے میں اپنی خالہ ساس سے پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن صحت خاتون نے اسے جھڑک کر خاموش کر دیا تھا۔

اپنی آمد کے پانچویں دن صحت خاتون نے زیتون بیگم کی موجودگی میں فاطمہ کو اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور رازداری سے بولیں۔ ”حماد پر ایک پری کا سایہ ہے مگر تو پریشان نہ ہو، وہ پری، حماد سے بہت پیار کرتی ہے۔ اصل میں اس پری کے ساتھ بھی حماد جیسا ہی مسئلہ ہے لیکن تو فکر نہ کر، وہ حماد کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ تو جو چپکے چپکے سورۃ جن اور سورۃ الناس پڑھتی ہے تو اسے کھلم کھلا پڑھا کر۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اگر تجھے کچھ کہنا ہے تو بتا؟“ فاطمہ کے پاس اپنی ساس اور خالہ ساس سے کہنے کے لیے کچھ نہ تھا ہاں البتہ چھپ چھپ کر بہانے کے لیے بہت سے آنسو تھے اور جب وہ آنسو بہا رہی تھی، تب ننھا حماد بلاوجہ مسکرائے جا رہا تھا۔ غصے میں آ کر اس نے حماد کے گال پر تھپڑ مار دیا۔ حماد پھر بھی مسکراتا رہا پھر روتے ہوئے اس نے حماد کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

”اے میرے خدا! یہ کیسی آزمائش ہے؟“

اس دن کے بعد فاطمہ نے ہر نماز کے بعد جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو خدا سے بس یہی درخواست کی تھی کہ اگر کسی پری یا پری جیسی مخلوق کا سایہ اس کے بیٹے پر ہے تو اسے اس سے نجات مل جائے۔

سردیوں شروع ہوئیں تو تیز بارشیں ہونے لگیں، ٹھنڈ بڑھتی چلی گئی اور اس ٹھنڈ نے حماد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کھانس کھانس کر اس کا برا حال تھا۔ منہ اور ناک سے ہر وقت لیس دار سفید پانی نکلتا رہتا۔ رنگت بھی زرد ہونے لگی تو وہ اور سلطان، بیٹے کو تیس کلومیٹر دور واقع مرکزِ صحت لے گئے۔

”ایسے بچوں کی قوتِ مدافعت ویسے بھی کم ہوتی ہے، بہت بیمار رہتے ہیں، آپ کے بیٹے کو نمونیہ ہے، آپ اس کا شہر میں معائنہ ضرور کروائیں۔“ ڈاکٹر صاحب نے ادویات لکھتے ہوئے کہا اور چیک اپ کروانے پر بھی زور دیا۔ مرکزِ صحت سے نکلتے ہوئے سلطان نے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ کل ضرور اپنے بیٹے کو بغیر پل والا دریا پار کر کے شہر کے ہسپتال لے جائے گا۔

ان دونوں کے گھر پہنچتے ہی دو دن سے رکی ہوئی بارشیں پھر سے شروع ہو گئیں اور ایسی شروع ہوئیں کہ بندہ گھر سے نکلنے کا نہ رہا۔ فاطمہ اور سلطان بارشوں کے ختم ہونے کا انتظار ہی کرتے رہے۔ بارشیں تو ختم ہو گئیں لیکن شہر جانے کی پھر بھی نوبت نہ آئی کیونکہ حماد بارشوں کے ختم ہونے سے پہلے ہی دنیا سے چلا گیا۔

ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے والے گاؤں والے شدید سردیوں کی بارشوں کی پروا کیے بغیر فاطمہ کا دکھ بانٹنے کے لیے تین دن تک فاطمہ کے گھر اکٹھے ہوتے رہے۔ حماد کی وفات کے وقت جنازہ اٹھنے سے پہلے زیتون بیگم اور دوسری گاؤں والی عورتیں ساڑی میں ملبوس ایک عورت کی موجودگی سے حیران تھے۔ اس گاؤں میں کوئی عورت ساڑی نہیں پہنتی تھی۔ اس عورت کا حلیہ بھی حیران کر دینے والا تھا۔ اس کی آنکھوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا اور آنکھیں، کانوں کے قریب تھیں، ناک کی جگہ صرف دو نتھنے تھے اور اوپر والا ہونٹ کٹا ہوا تھا۔

پوتے کے جنازے کے بعد زیتون بیگم اس عورت سے ملنا چاہتی تھی لیکن جنازہ اٹھتے ہی وہ ایسے غائب ہوئی کہ دوبارہ نظر نہ آئی۔ چند دنوں بعد زیتون بیگم نے فاطمہ سے پوچھا کہ کیا اس نے بھی اس ساڑی والی عورت کو دیکھا تھا جس کے نقوش حماد کی طرح تھے البتہ اس کے بازو اور ہاتھ حماد کی طرح غیر موجود نہیں تھے؟ فاطمہ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ بیٹے کے غم میں تو اسے اپنا ہوش نہیں تھا۔

سردیاں کم ہوئیں تو صحت خاتون بھی بہن کے گھر تعزیت کے لیے آئیں۔ اس عورت کے بارے میں سننے کے بعد صحت خاتون نے یہی کہا کہ یہ وہی پری تھی جو حماد سے محبت کرتی تھی اور حماد کی وفات کے بعد اس کے جنازے میں شامل ہونے آئی تھی۔

گاؤں کی ہر دوسری عورت اس ساڑی والی حماد جیسی شکل والی عورت کا چٹخارے لے کر ذکر کرتی نظر آتی تھی اور جب صحت خاتون نے اس عورت کے بارے میں کہا کہ وہ پری تھی تو فاطمہ کو یقین آ گیا تھا۔ اس بار جب فاطمہ حاملہ ہوئی تو وہ سورۃ یوسف بھی پڑھتی اور خدا سے یہ دعا بھی کرتی کہ اسے اس بار صحیح و سالم بیٹا دے جس پر کسی پری یا پری نما کا سایہ نہ ہو۔

* * *

غزل

اس نے جاتے ہوئے مڑ کر جو نہ دیکھا ہوتا
میں بھی چپ چاپ کہیں سائے میں بیٹھا ہوتا

مجھ کو معلوم ہے پانا تجھے ممکن ہی نہیں
کاش دل نے بھی مری بات کو مانا ہوتا

تیری فطرت میں ازل سے ہے کدورت پیارے
ورنہ دو چار قدم چل کے نہ چھوڑا ہوتا

میں تو آیا ہوں لئے دل کی ہتھیلی پہ تھکن
تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں کا سایہ ہوتا

میں تری دھوپ کو سایوں کی دیواریں دیتا
راستہ زیست کا مجھ کو بھی تو بھایا ہوتا

عمر بھر میرے رہے غیر ہی سائل ارشد
میری چوکھٹ پہ کبھی تو بھی تو آیا ہوتا



ارشد علی ارشد





صدف آصف

اُس کا چہرہ!

وہ ایک بندر کے چہرے جیسی بوڑھی عورت تھی جس نے کالے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اس کے گلے میں ہڈیوں کی مالا پڑی ہوئی تھی۔ میں خوف سے کھڑی ہوگئی، اس سے اپنی آستین......

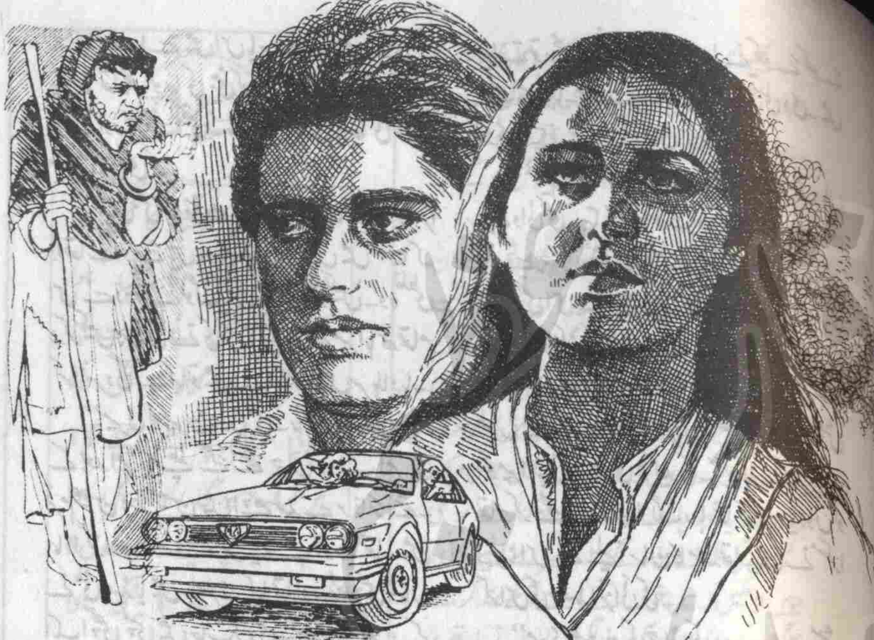
بدشگونی کی سزا بھگتنے والی ایک عورت کا دکھ بھرا ماجرا

میری خالہ زینب انڈیا گھومنے پھرنے اور اپنے رشتے داروں سے ملنے کی غرض سے جا رہی تھیں۔ انہیں یہ بات پتا تھی کہ مجھے بھی سیاحت کا بہت شوق ہے۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ اندھا کیا چاہے 'دو آنکھیں' میں نے بھی گھر والوں سے اجازت لی اور پھر قسمت سے ویزہ بھی مل گیا' سو اپنا سامان باندھا اور خوشی خوشی اُن کے ساتھ انڈیا روانہ ہوگئی۔

ہمارا پہلا قیام بمبئی میں تھا جو اب انڈیا میں ممبئی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہم لوگ وہاں پہنچ کر خالہ کے سسرالی رشتے داروں کے گھر ٹھہرے۔ یہ گھر زینب خالہ کی نند عارفہ آنٹی کا تھا۔ ان کی ایک بیٹی مونا تھی جو بڑی ملنسار لڑکی تھی۔ میری جلد ہی اس سے اچھی دوستی ہوگئی۔

دو دن بعد عارفہ آنٹی نے ہمارے اعزاز میں ایک ظہرانہ دیا اور چند رشتے داروں اور جاننے والوں کو مدعو کیا۔ سب لوگ ہم سے بہت محبت سے ملے۔ عارفہ آنٹی نے جب ایک قلم کار کی حیثیت سے میرا سب سے تعارف کرایا تو ان کے حلقۂ احباب نے تالیوں کی گونج میں میرا استقبال بڑے پرجوش طریقے سے کیا۔ میری فیلڈ اور پاکستان کے حوالے سے دلچسپ سوالات کیے۔ میں بھی ان لوگوں میں گھل مل گئی۔ کھانا لگنے پر سب جب مزے دار ڈشز کی طرف متوجہ ہوئے۔ مجھے وہاں پوری، بھاجی اور سبزیوں کے پکوڑے بہت پسند آئے تھے۔ میں نے ایک پوری اور پیالی میں تھوڑی سی بھاجی اور سوجی کا حلوہ نکالا اور بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگی۔ مجھے پوجا کے برابر کی نشست خالی نظر آئی تو میں اس کے برابر میں جا بیٹھی۔ پوجا' مونا کی پرانی سہیلی تھی' اس کی شخصیت میں کچھ ایسی کشش تھی جس نے دعوت کی شروعات سے ہی میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی۔

ایک لکھاری کی حیثیت سے لوگوں کا مشاہدہ کرنا میرے مشغلے میں شامل رہا ہے اسی لیے میں نے پوجا پر خصوصی توجہ دی۔ جانے کیوں اس کی سحر انگیز آنکھوں میں دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ اپنے اندر کوئی بڑا طوفان دبائے بیٹھی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی مگر ایسا لگا جیسے اس کے لب اس کا ساتھ نہیں دے پا رہے ہیں۔ وہ پوری دعوت میں کھوئی کھوئی سی رہی۔



جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی پراسرار طاقت ہے جس نے اس کی خوبصورت شخصیت کے گرد ایک غلاف سا لپیٹا ہوا ہے۔ میں نے اس سے ہلکی پھلکی بات چیت شروع کی۔ اس کا انداز بھی بہت دوستانہ تھا۔ وہ بہت خوش شکل لڑکی تھی۔ دعوت کے اختتام تک میری اس سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی اور یہ ہی تو میری منشا تھی۔

چلتے وقت اُس نے عارفہ آنٹی سے اصرار کیا کہ ہم سب کل کی چائے اس کے گھر پئیں۔ میں تو پہلے ہی اس کے ساتھ مزید وقت گزارنا چاہتی تھی تا کہ اس کی شخصیت پہ چھائے اسرار پر سے پردہ اٹھ سکے اس لیے فوراً حامی بھر لی مگر خالہ لوگوں کو ایک اور جگہ جانا تھا، تاہم اس بات کا حل مونا نے یوں نکالا کہ وہ میرے ساتھ پوجا کے گھر جانے پر راضی ہوگئی اور زینب خالہ نے عارفہ آنٹی کے ساتھ دوسرے رشتے داروں کی طرف جانے کا پروگرام سیٹ کر لیا۔

☆☆☆

دوسرے دن میں اور مونا تیار ہو کر شام چار بجے پوجا کے گھر پہنچ گئے۔ ہم نے گھنٹی بجائی تو ایک چھوٹی سی بچی نے دروازہ کھولا جس کی شکل انتہائی حد تک بندر سے مشابہ تھی۔ اس نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔

"یہ بچی کون تھی؟" میں نے مونا سے پوچھا۔

"یہ پوجا کی چھ سالہ بچی ونتی ہے۔" مونا نے افسردگی سے کہا تو میری چیخ نکل گئی۔ ابھی میں اس سے اس بارے میں کوئی اور سوال کرتی کہ پوجا خوبصورت گلابی ساڑھی پہنے اندر داخل ہوئی۔

"آپ لوگوں کی کرپا ہے جو آپ ہمارے غریب خانے پر پدھاریں۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر ہمیں پرنام کیا۔ وہ ہم سے بڑے تپاک سے ملی۔ ناشتے پانی سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اُس سے اس کی بچی کے بارے میں پوچھا جس کی وجہ سے پوجا کے حسین چہرے پر اداسیوں نے ڈیرا سا

جمالیا تھا۔ راستے میں اس بابت کچھ کچھ مونا سے بھی پتا چلا تھا پھر پوجا کی بیٹی کو دیکھ کر میرے اشتیاق کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ میں مکمل کہانی پوجا کی زبانی سننا چاہتی تھی۔

''میں بھی چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ جو پراسرا واقعات ہوئے ہیں، وہ تم کہانی کی شکل میں لکھو تا کہ اس سے دوسرے لوگ سبق حاصل کر سکیں۔ وہ غلطی نہ کر سکیں جو میں نے کی تھی۔'' پوجا نے میرا ہاتھ تھام کر افسردگی سے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میری لومیرج ہوئی تھی۔ رمیش اور میں وِیواہ کے بعد امریکا چلے گئے تھے جہاں وہ ایک امریکی فرم جیسن اینڈ جیسن میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ہمارا گزارہ بہت اچھے طریقے سے ہو رہا تھا۔ میں نے ملٹی میڈیا میں ماسٹرز کیا تھا اور مجھے بھی وہاں ایک اچھی کمپنی میں جاب مل گئی۔ جیون خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھول رہا تھا کہ ہمارے پریم بھری زندگی پر کسی بری نظر کا سایہ پڑ گیا۔'' پوجا بولتی جا رہی تھی اور میں ایک کاغذ پر ساری باتوں کو تحریر کر رہی تھی۔

''میرے سسر کو سات سال قبل اچانک ہارٹ اٹیک ہوا۔ ہم کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ واپس ممبئی لوٹنا پڑا جہاں رمیش کا یہ پرکھوں کا مکان تھا جس میں اس کے ماتا پتا اور بھائی بہن رہتے تھے۔ رمیش اپنے پتا جی سے بہت اٹیچڈ تھے۔ ہمارے انڈیا واپس آ جانے کے دوسرے دن ہی ان کا دیہانت ہو گیا۔ رمیش کے لیے یہ بات جیسے روگ بن گئی، ان کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ رمیش کی ماتا اپنے پتی کی ارتھی اٹھنے کے ساتھ ہی بستر سے لگ گئیں۔

گھر کے بڑے بیٹے ہونے کی حیثیت سے اب رمیش کا یہاں رہنا ضروری تھا۔ اسی کارن ہم نے ہمیشہ یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ کاش، ہم واپس چلے جاتے تو مجھے وہ غم نہ ملتا۔'' پوجا نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ مونا نے ہاتھ دبا کر اسے تسلی دی۔ میں بڑی دلچسپی سے اس کی کہانی سن رہی تھی۔

''ہم جب ممبئی لوٹ کر واپس آئے تو میں ماں بننے والی تھی۔ پتا جی کی موت اور ماتا جی کی بیماری کی وجہ سے جہاں رمیش ڈسٹرب تھے، وہیں میں بھی بہت اداس تھی اسی لیے اپنی دیکھ ریکھ اس طرح نہیں کر رہی تھی جیسا کہ ڈاکٹر کی ہدایات تھیں۔ بچے کی پیدائش کا سمے قریب آ رہا تھا مگر فرسٹریشن کے کارن میں بری طرح سے بیمار پڑ گئی تو ڈاکٹر نے خصوصی طور پر رمیش کو میرا خیال رکھنے کی تاکید کی۔'' پوجا نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے بتایا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان یادوں کو دہرانا اس کے لیے آسان کام نہ تھا۔ میں نے مسکرا کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔

''میری طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اب رمیش میرا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگے تھے۔ ایک دن ڈنر کے بعد جانے کیوں مجھے ایسیڈیٹی کی پرابلم ہو رہی تھی۔ وہ مجھے ہمارے گھر سے نزدیک واقع ایک پارک میں چہل قدمی کے لیے لے گئے جس کا نام ''ہنومان جی پارک'' ہے۔ اس وقت رات کا سمے تھا، ساڑھے نو بج رہے تھے۔ یہ رات عام دنوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی اندھیری تھی اسی لیے پارک میں لوگوں کی موجودگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں نے جیسے ہی پارک کا مین گیٹ کراس کیا، کسی پرندے کی خوفناک اور مکروہ آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں ایک دم خوف زدہ ہو گئی۔ میں نے رمیش کی طرف دیکھا، وہ بڑے نارمل انداز میں میرے ساتھ چل رہے تھے۔ میں نے ان سے پرندے کی آواز کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے ہنستے ہوئے اسے میرا وہم قرار دیا کیونکہ بقول ان کے، انہوں نے تو ایسی کوئی آواز نہیں سنی۔

مجھے اس بات سے دکھ پہنچا کہ وہ میری بات کا وشواس نہیں کر رہے۔ جانے کیوں میرا دل اس جگہ سے اچاٹ ہو گیا۔ میں نے اپنے پتی سے فوراً وہاں سے گھر واپسی کی ضد کی تو وہ تھوڑا ناراض ہو گئے کہ ابھی تو آئے ہیں۔

میں ان کی ناراضگی کے کارن خاموشی سے ان کے ساتھ واک کرنے لگی مگر میرا من اس جگہ سے جانے کیوں بے زار ہو رہا تھا۔ مجھے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ رمیش نے جب میری حالت دیکھی تو ان کو بھی میری چنتا ہونے لگی کہ کہیں میری طبیعت بگڑ نہ جائے۔ انہوں نے مجھے کونے میں پڑی ایک بنچ پر بٹھایا اور پارک کے دوسرے کنارے پر بنی کینٹین کی طرف بڑھ گئے تاکہ میرے لیے پانی یا جوس لا سکیں۔ میں خوف کے مارے آنکھ بند کر کے بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگی۔'' پوجا نے ماتھے پر آنے والا پسینہ پونچھا۔ موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا مگر یہ واقعہ دہراتے ہوئے پوجا کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ مونا نے اٹھ کر اسے پانی پلایا۔ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''اس سمے رات کا سناٹا مجھے خوف زدہ کر رہا تھا۔ اچانک کسی نے میری آستین پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ ایک بندر جیسے چہرے والی بوڑھی عورت تھی جس نے کالے رنگ کا لمبا سا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں ہڈیوں کی مالا پڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ لال سرخ ہو رہا تھا جو اس اندھیری رات میں بھی چمک رہی تھیں۔ میں خوف سے کھڑی ہو گئی۔ جلدی سے اس سے اپنی آستین چھڑائی۔ اس کے چہرے پر ایک خوفناک مسکراہٹ تھی۔ میرا نواں مہینہ چل رہا تھا۔ وہ مسلسل میرے پیٹ پر نگاہیں جمائی ہوئی تھی پھر اس نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ میرے پیٹ پر رکھنا چاہا تھا۔ خوف جیسے میرے اندر سرایت کر گیا تھا۔'' پوجا نے آنکھیں بند کر کے جھرجھری سی لی۔ میں اور مونا دلچسپی سے اس کی آپ بیتی سن رہے تھے۔

''اس کے بعد کیا ہوا؟'' خاموشی کے طویل وقفے سے گھبرا کر میں نے پوجا کے کاندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ وہ جیسے نیند سے جاگی۔

''میں نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ وہ کون ہے اور کیا چاہ رہی ہے؟ میں نے اسے زور کا دھکا دیا تھا۔ وہ گھاس پر منہ کے بل جا گری تھی۔ میرے منہ سے جانے کیا کیا مغلظات نکلنے لگی تھیں۔ اس سمے جیسے میں اپنے حواس کھو چکی تھی۔'' پوجا بتاتے بتاتے ہانپنے

غزل

یوں تو اک شہنشاہ کا قتل ہوا
درحقیقت گواہ کا قتل ہوا
پھر سے ابلیس نے شرارت کی
پھر کسی بے گناہ کا قتل ہوا
کوئی منزل پہ کیسے پہنچے گا؟
ہر طرف سیدھی راہ کا قتل ہوا
علم کے دیپ کیسے روشن ہوں؟
جابجا درس گاہ کا قتل ہوا
عام لوگوں پہ خوف طاری ہے
جب سے عالی پناہ کا قتل ہوا

علی شاہ......بھکر

لگی۔

''ان سب باتوں کے بعد اس کا ردعمل کیسا تھا؟'' مونا نے پوچھا۔

وہ جوانوں جیسی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی عجیب سی لکڑی کی نوک میرے پیٹ میں چبھوئی تھی اور بولی تھی۔ ''میں تو اس لیے آئی تھی تاکہ تجھے ہونے والے بچے کی بدھائی دوں لیکن اب تجھے میری یہ بدصورت شکل سدا یاد رہے گی۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا تھا اور وہاں سے دور چلی گئی تھی۔ میری طبیعت بری طرح سے بگڑنے لگی تھی۔'' اب آنسو پوجا کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے تھے۔ ہم نے اسے دوبارہ پانی پلایا تھا۔

''میری خراب حالت دیکھ کر رمیش نے گاڑی تیزی سے بھگائی تاکہ ہم جلدی سے گھر پہنچ سکیں۔ اتنے میں سگنل کی بتی سرخ ہوگئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو مجھے وہ ہی بندر جیسے چہرے والی بڑھیا کھڑی نظر آئی۔ ''رمیش، دیکھو، وہ ہی بڑھیا۔'' میں نے راستے میں رمیش کو پارک والا واقعہ سنا دیا تھا اسی لیے چیخ کر اسے دکھانے لگی مگر جب انہوں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو انہیں کوئی نظر نہ آیا تھا۔

دوسرے دن رمیش کے آفس جانے کے بعد میں بیڈ پر بیٹھی چائے پی رہی تھی جو کام والی بائی نے مجھے بنا کر دی تھی کہ اچانک مجھے شدید سردی لگنے لگی۔ میں باقاعدہ کپکپا رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے ایسا لگا کہ کسی نے میرا نام لے کر پکارا ہو۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو سامنے وہ ہی بڑھیا کھڑی تھی۔ میرا خوف سے دم نکلنے لگا۔ میں نے چیخنا چاہا مگر میری آواز حلق میں جیسے اٹک گئی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا پورا جسم منجمد ہوگیا ہو۔ میں نے دیکھا کہ اس بڑھیا کا ایک ہاتھ اچانک لمبا ہونا شروع ہوگیا تھا۔ اس نے وہ ہاتھ میرے پیٹ پر پھیرا۔ اسی خوفناک پرندے کی مکروہ آواز مجھے دوبارہ سنائی دی۔ شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ مجھے ایسا لگا کہ میری آتما پرلوک سدھارنے والی ہے۔ میں نے ایک دلدوز چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئی۔'' پوجا نے حقیقتاً کپکپاتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی کہانی سن کر میرے دل کی حالت بھی عجیب ہورہی تھی۔

''اس کے بعد کیا ہوا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''مجھے جب دوبارہ ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ سب اداس سے میرے اردگرد کھڑے ہیں۔''

''بدھائی ہو، آپ ایک بیٹی کی ماں بن گئی ہیں۔'' نرس نے رسمی طور پر مجھ سے کہا۔ سب کی خاموشی خصوصاً رمیش کے چہرے پر چھائی سنجیدگی سے میں نے یہ مطلب لیا کہ وہ بیٹی کے پیدا ہونے سے خوش نہیں ہیں حالانکہ وہ تو خاصے آزاد خیال تھے لیکن اصل میں ان کی اداسی کا کارن مجھے تب سمجھ میں آیا جب نرس نے فیڈ کروانے کے لیے وہ بچی مجھے لا کر دی۔ اف...... اس کو دیکھ کر تو میرے بولنے کی شکتی ہی ختم ہوگئی تھی۔'' پوجا دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ ہم دونوں کے آنسو بھی اس کا رونا دیکھ کر بہنے لگے۔

''ہے بھگوان...... میری بیٹی کا چہرہ اسی ہنومان پارک والی بوڑھی عورت کا سا بندر جیسا تھا۔ میں اپنی بچی کو دیکھ کر دوبارہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس بوڑھی کی بات سچ ثابت ہوئی تھی۔ اب وہ میری بیٹی کی صورت میں ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔ یہ زندگی بھر کا روگ ہے جس نے میری خوشیوں بھری زندگی کو چتا کی آگ دے دی ہے۔

* *

فاطمہ بلگرامی

جن آنکھوں میں خواب بسے تھے

شاہد بخاری کا خیال

اب وہاں یادوں کا بکھرا ہوا ملبہ ہی تو ہے
جس جگہ عشق نے بنیاد مکاں رکھی تھی

سچی کہانیاں کی معروف سینئر لکھاری کا دلچسپ و تحیر خیز سلسلہ۔ قسط نمبر 8

خلاصہ: داؤد عرف ڈیوڈ کی ماں میری ایک انگریز عورت تھی جس نے ایک ایشیائی افتخار الملک نامی شخص سے شادی کی تھی...... اس رشتے کی پاداش میں میری کے ارب پتی باپ لارڈ ڈلفی نے اسے جائیداد سے عاق کردیا تھا۔ اسی دوران حالات نے اسے اپنے شوہر سے جدا کردیا...... اس کے بعد میری نے اپنے بیٹے کے ساتھ لندن میں بہت مشکل زندگی گزاری اور مر گئی۔ لارڈ ڈلفی کی موت کے بعد یہ وصیت سامنے آئی کہ اس نے اپنی تمام جائیداد کا وارث میری کے بیٹے ڈیوڈ کو قرار دیا ہے لیکن داؤد عرف ڈیوڈ یہ جائیداد قبول کرنے سے انکار کردیتا ہے جب کہ لارڈ ڈلفی کی اس جائیداد پر ایک یہودی گروپ کی بھی نظر ہے۔ داؤد کی اس گروپ سے ایک جھڑپ بھی ہوتی ہے۔ لندن میں ہی بہن بھائی جیسے رشتوں سے محروم داؤد کی ایک پاکستانی فیملی سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ اس فیملی کی ایک لڑکی کو بہن بنالیتا ہے لیکن وہ لڑکی داؤد کو بھائی نہیں سمجھتی اور ایک ایسا قدم اٹھاتی ہے کہ داؤد کی عزت داؤ پر لگ جاتی ہے۔ حالات کا مارا داؤد پاکستان اپنے باپ افتخار الملک کے پاس جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جہاں وہ شادی کے بعد ایک بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہ رہا ہے۔ جہاز میں سفر کے دوران اس کی ملاقات فاطمہ نامی ایک نہایت موڈ لڑکی سے ہوتی ہے جو اسے پاکستان میں ملنے کے لیے وزیٹنگ کارڈ بھی دیتی ہے۔ داؤد پاکستان آتا ہے تو اسے باپ ہی نہیں اپنی سوتیلی ماں اور اس کی بیٹی فہمیدہ سے بہت پیار، محبت اور شفقت ملتی ہے۔ داؤد اپنی دولت کے ذریعے ان لوگوں کی زندگی میں آسانی اور آسائش لانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پاکستان میں داؤد کی اپنے باپ سے جڑے رشتے داروں سے ملاقات ہوتی ہے۔ انہی میں ایک بہت خوبصورت ذہین اور حاضر جواب لڑکی عنبر بھی ہے جو داؤد کو اچھی لگتی ہے...... اور ایک رشتے دار رابیل اختر سے بھی ملاقات ہوتی ہے جس نے پولیس آفیسر ہونے کے باوجود جیل کاٹی ہے اور وہ منشیات کا عادی بھی رہ چکا ہے۔ پاکستان میں داؤد کو اس لڑکی راحیلہ کا ایک طویل خط ملتا ہے، جسے داؤد نے بہن سمجھا ہوتا ہے لیکن وہ داؤد کو محبوب سمجھ کر اُس کی بدنامی کا باعث بن گئی تھی۔ یہ خط راحیلہ نے مرنے سے پہلے تحریر کیا ہے۔ داؤد جہاں ایک طرف اِس بات سے خوش ہے کہ عنبر اس کی ذات میں دلچسپی لے رہی ہے، وہاں اس کے لیے یہ بات بھی حیرانی اور پریشانی کا باعث ہے کہ موم نے آخر فہمیدہ سے جو اس کی بہن ہے اس کے رشتے کے بارے میں سوچا بھی کیسے...... داؤد کی ملاقات رابیل سے ہوتی ہے جو اسے اپنی کہانی سناتا ہے اور یہ کہانی کردار در کردار آگے بڑھتی ہے، رابیل خود اپنے بارے میں بتاتا ہے کہ اُسے ایک سازش کے ذریعے ہیروئن کا عادی بنایا گیا...... اور پولیس کی نوکری سے نکلوایا ہی نہیں، اُس سے مجرمانہ عمل کرانے کی بھی کوشش کی۔ یہاں تک کہ وہ جیل پہنچ گیا...... اور پھر جیل سے فرار ہوتا ہے: **اور اب آگے پڑھیے:**

وہاں سے آنے کے چوتھے روز خبر آگئی کہ ان لوگوں کی تیاری مکمل ہوگئی ہے۔ ویزا بھی مل گیا ہے۔ تحسین خالہ کے بیٹے مشکور نے اپنی بیوی سلمٰی کو بھی ساتھ کر دیا تھا۔ جبکہ مشکور کا بیٹا ابھی صرف سوا سال کا تھا۔ دراصل سلمٰی بھابی کے بھی کچھ رشتے دار انڈیا میں رہتے تھے۔ وہ بھی ان لوگوں سے ملنے کو بے چین ہوگئی تھیں۔ عنبر تو ساتھ تھی ہی۔

☆......☆

ہم سب بذریعہ ہوائی جہاز دہلی کے پالم ایئرپورٹ پر اترے اور پھر وہاں سے نئی دلی جنکشن پہنچے۔ اس عظیم الشان اسٹیشن کے ایئرکنڈیشنڈ ویٹنگ روم میں چار گھنٹے رکے، نہا دھو کر تازہ دم ہوئے اور پھر راج دھانی ایکسپریس سے پٹنہ کے لئے چل پڑے، کیونکہ راج دھانی ایکسپریس سیدھی نکل جاتی تھی جب کہ ہمیں صاحب گنج لوپ لائن کی گاڑی پکڑنی تھی۔ رات بارہ بجے تک میں کھڑکی سے لگا بیٹھا رہا پھر سو گیا۔ صبح آٹھ بجے ہم مغل سرائے کے اسٹیشن پر پہنچے۔ یہاں کافی دیر گاڑی کو رکنا تھا۔ اب تک اسے الیکٹرک انجن چلا رہا تھا مگر اب اس میں کوئلے کا انجن جوڑا جا رہا تھا۔ یہاں سے اسے لوپ لائن پر مڑنا تھا اور اس لائن پر الیکٹرک انجن چل نہیں سکتا تھا، کیوں کہ اب تک اس ٹریک پر تار نہیں لگایا گیا تھا۔ میں نے یہاں اتر کر رابیل کے کہنے پر پہلی بار پان کھایا۔ خالہ نے اتنی بار تعریف کی تھی کہ بنارس کے پان کا کیا کہنا۔ حلوا ہوتا ہے حلوا اور میں نے کھا لیا تھا۔

جو پان کے عادی ہوں گے انھیں ضرور اچھا لگتا ہوگا مگر میرا تو منہ کڑوا ہو کر رہ گیا۔ خیر وہاں سے گاڑی چلی تو آرا، بکسر، دانا پور ہوتی ہوئی پٹنہ پہنچی۔ خالہ نے بتایا کہ یہ شہر مغلوں کے دور میں عظیم آباد کہلاتا تھا۔ اس سے پہلے پاٹلی پتر اور اب پٹنہ کہلاتا ہے۔ یہیں سکھ مذہب کے چھٹے گرو گوبند سنگھ کی سمادھی ہے اس وجہ سے اسے سکھ مذہب والے بہت اہمیت دیتے ہیں۔

پٹنہ میں ہی شام ہوگئی تھی۔ اس لیے ہم سب پٹنہ جنکشن سے رکشا کے ذریعہ سبزی باغ آئے اور پٹنہ لوجنگ میں ایک رات کے لیے رک گئے۔ ہمارے پاس کافی وقت تھا کیونکہ بھاگل پور کی جانب جانے والی ٹرین صبح کو ملتی۔ میں نے نوابوں کے اس حسین شہر کی سیر کا پروگرام بنایا اور سب کو لے کر چل پڑا۔ ہماری اصل رہبر خالہ تھیں۔ ان پر تو جیسے جوانی آگئی تھی۔

ہم نے باہر کھڑے سائیکل رکشوں کی قطار میں سے دو رکشے لئے اور ان پر سوار ہو کر بانکی پور کی رنگینی دیکھنے چل پڑے۔ گاندھی میدان، الفسٹن، مراد پور غرض کہ ہر اس جگہ کی سیر کر ڈالی جسے دوبارہ دیکھنے کی خالہ کو حسرت تھی۔ اس سیر سپاٹے میں بارہ بج گئے۔ کھانا ہم نے سبزی باغ کے ایک صاف ستھرے ہوٹل میں کھایا تھا اور پھر پٹنہ لاجنگ کی جانب لوٹ چلے تھے۔

پٹنہ لوجنگ میں لوٹے تو سب تھکن سے چور تھے۔ سلمٰی نے کہا "بھئی میں تو چلی سونے" اور وہ کمرے میں چلی گئی۔ خالہ کچھ دیر تک تو اپنی راگنی الاپتی رہیں کہ یہ بہت پرانا شہر ہے۔ حضرت عیسٰی سے بھی قبل یہ شہر آباد تھا۔ سمراٹ اشوک کے دادا نے اس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ بھی سونے چلی گئیں۔ اب ٹیرس پر صرف میں اور رابیل باقی رہ گئے تھے۔ بازار میں اب تک چہل پہل باقی تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ سائیکل رکشا کی گھنٹی رہ رہ کر بج رہی تھی۔ میں نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا "رابیل صاحب ایسا کریں کہ اس دن آپ نے جہاں سے کہانی چھوڑی تھی وہیں سے سنا دیں۔"

"گویا آپ کو میری آپ بیتی اچھی لگی ہے؟" رابیل بولا۔
"تجسس ہی اتنا ہے اس کہانی میں کہ میرے جیسا آدمی جو کہانی قصے میں دل نہیں لگا تا وہ بھی دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔"
"تو سنیں، جیسے ہی اس نے کہا کہ میں ہی شیر خان ہوں تو ہم سب پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ کمرے میں ایسی گہری خاموشی طاری ہو گئی تھی کہ اگر سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز دور تک سنائی دیتی۔
اس خاموشی کو کمال نے توڑا۔ "شیر خان! تم نے ہمیں قیدی بنایا ہے؟"
"نہیں بیٹے! میں دنیا والوں کے لئے شیر خان ہوں مگر تم لوگوں کے لئے وہی سہیل ہوں میرے بچو! تم تو مجھ سے نفرت نہ کرو۔"
"تم سے نفرت کیسے نہ کروں؟ تم نے مجھے اور شگفتہ کو ہیروئن کا عادی بنایا۔ وہ تو جیل کی سختی اور ہماری قوت ارادی تھی کہ ہم نے اس لت کو چھوڑ دیا۔"
"یقین کرو بیٹے! میں نے تمہیں ہیروئنچی بنایا نہ شگفتہ کو۔ یقیناً یہ شوشہ عثمانی نے چھوڑا ہوگا کیونکہ اب......" سہیل انکل بولتے بولتے خاموش ہو گئے۔
"اب کیا؟ بولو ناں؟" شگفتہ کا نفرت بھرا جملہ گونجا۔
"میں تمہیں ابتداء سے بتاتا ہوں۔ مجھے خود پتا نہیں چلا کہ میں کیسے ترقی کی منازل طے کرتا ہوا شیر خان بن گیا۔ دراصل جب مجھے خبر ملی کہ عثمانی بہت بڑا تاجر بن گیا ہے اور اسی شہر میں ہے تو میں عقل کا دامن چھوڑ بیٹھا اور اس سے ملنے پہنچ گیا۔ کئی سال پہلے سنا تھا کہ اسے رشوت لینے کے جرم میں محکمے نے نکال باہر کیا ہے۔ پھر اس کی خبر نہیں ملی۔ وہ منظر سے بالکل غائب ہو گیا تھا۔ شاید اس لیے بھی مجھے خبر نہیں ملی کہ میں خود بھی مصروف زندگی گزار رہا تھا۔ وہ تو اتفاقاً اس کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا اسی لئے صبر نہ کر سکا اور اس کے بنگلے پر پہنچ گیا۔"
"آپ ہمارے بنگلے پر پہنچے تھے؟"
شگفتہ کا سوال سن کر سہیل انکل خیالوں میں کھو گئے۔ جیسے گزرے ہوئے واقعات کو اپنے ذہن میں ترتیب دے رہے ہوں۔ پھر یوں بتانے لگے۔
"میں تمہارے اسی بنگلے پر پہنچا تھا جہاں تم رہتی ہو۔ وہاں پہنچ کر خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ واقعی اس نے بہت ترقی کر لی تھی۔ بڑے سے گیٹ پر باوردی چوکیدار موجود تھا۔ میں نے اپنا کارڈ نکال کر اسے دیا۔ کارڈ لے کر اس نے دیکھا پھر ایک نوکر کے ساتھ مجھے اندر بھجوا دیا۔ عثمانی فائلوں کے انبار میں کھویا ہوا تھا۔ میں نے کمرے میں قدم رکھتے ہی کہا "جیو بادشاہ! خوب ترقی کی ہے۔"
بے تکلف جملہ سن کر وہ چونک گیا اور سر اٹھا کر میری جانب دیکھنے لگا۔ پھر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک نمودار ہوئی اور وہ بول اٹھا "تم؟"
میں نے اسے بے تکلفی سے کہا "بڑا بے مروت آدمی ہے تو۔ پندرہ سال بعد مل رہا ہوں اور تو دیکھنے کے بعد بھی بیٹھا ہوا ہے۔ گلے تو لگ جا ظالم!"

اس کے چہرے پر ہنوز حیرت طاری تھی۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا "تم سہیل ہی ہو نا؟"
میں نے جھڑکا۔ "کیا تم تم لگا رکھی ہے ویسے ہی بول ناں جیسے پندرہ سال پہلے بولتا تھا۔ اسی تھانے دار کے اکھڑ لہجے میں۔"
وہ فوراً ہی اٹھ گیا اور میرے سینے سے لگتے ہوئے بولا۔ "واقعی تو سہیل ہے مگر مجھے تو اب بھی یقین نہیں ہو رہا ہے۔" وہ مجھے ساتھ لے کر صوفے کی جانب بڑھا مگر میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے لہجے میں وہ جوش نہیں ہے جو اس کا خاصہ تھا۔ وہ صرف رسم نبھانے کے لئے بول رہا تھا۔ "تو اب تک کہاں تھا؟"
میں یہ سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے اپنے سے کمتر سمجھ رہا ہے اسی لیے میں وہ غلطی کر بیٹھا۔ "تو بہت بڑا تاجر بن گیا ہے تو میں بھی تجھ سے پیچھے نہیں ہوں۔ میں بھی کنگ آف انڈر ورلڈ بن گیا ہوں۔ شیر خان میرا ہی خفیہ نام ہے۔"
وہ اچھل سا گیا "کیا..... تو شیر خان ہے؟"
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں اگر تجھے شک ہے تو چل میرے ساتھ، میں تجھے اپنی طاقت دکھاتا ہوں۔"
اس دن میں شیخی بھگارنے میں اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ عقل کوسوں پیچھے چھوٹ گئی تھی۔ اس نے جب پوچھا تو اتنا بڑا مجرم کیسے بن گیا تو میں نے سینہ پھیلا کر کہا تھا "تو بھول رہا ہے عثمانی کہ تیرا یہ یار اس کھیل میں تبھی سے ماہر ہے جب شیخو پورہ میں معمولی سا شراب بیچنے والا تھا۔"

میرے جواب سے اسے تسلی نہ ہوئی اور وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ تو اتنی بڑی تنظیم کا سربراہ کیسے بن گیا۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے کسی نے سربراہ بنایا نہیں ہے بلکہ میں نے خود اس تنظیم کی بنیاد رکھی ہے۔ پوری کہانی تو بہت لمبی ہے۔ اختصار میں سن لو۔ میں نے اس شہر میں دھندا شروع کیا تو کئی لوگ آڑے آئے جنھیں میں نے ٹھنڈا کر دیا۔ میرے مقابل چھوٹی چھوٹی کئی تنظیمیں تھیں۔ ایک دن میں نے سوچا کہ اگر ان تنظیموں کو یکجا کر کے میں باس بن جاؤں تو میری طاقت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں نے خان سینڈیکیٹ کی بنیاد رکھی اور پھر ایک نئے حلیے میں خوف کی علامت بن کر ان پر چھا گیا۔ آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے گروہ اپنا تشخص ختم کر کے میرے ساتھ شامل ہونے لگے اور خان سنڈیکیٹ ملک کا ایک بڑا گروہ بن گیا۔

عثمانی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا کہ ''سنڈیکیٹ کا ہیڈ آفس کہاں ہے؟'' میں نے جواب میں محل وقوع بتا دیا۔ دوستی کی تجدید کے نام پر ہم نے اس شام ڈھیروں باتیں کیں۔ وہ جو جو پوچھتا گیا میں بتاتا گیا۔ پتا نہیں اس دن میری عقل کو کیا ہو گیا تھا کہ میں نے اسے ایسی ایسی بات بتا دی جو خود میرے لیے پھانسی کا پھندا بن سکتی تھی۔ شاید یہ شراب کا اثر تھا۔ وہ پلاتا گیا اور میں پیتا گیا۔ رات گئے گھر لوٹا تو خود اپنا ہوش نہ تھا۔ رات میں تو میں ہوش سے بیگانہ رہا مگر جب صبح اٹھا اور رات کی باتوں پر غور کیا تو اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ میں نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ قانون کی نظر میں، میں مجرم تھا لیکن اسے ثابت کرنا مشکل تھا' وہ قانون کی مدد لے کر میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ مگر میرے گروہ کو توڑ سکتا تھا۔ جس دن وہ میرا راز کھول دیتا' میری جان کے لالے پڑ جاتے۔ اپنی اس غلطی کو چھپانے کے لئے اسے مٹھی میں رکھنا ضروری تھا۔ مجھے اس کی کمزوری تلاش کرنا تھی سو میں اس کی تلاش میں جت گیا۔ ایک دن میں اس کے گھر میں چور بن کر گھسا اور تجوری کی تلاشی لی تو یہ خطوط اور تصویریں ملیں میں سمجھ گیا کہ یہ وہی احسان فراموش ہے جس نے دوستی کو ڈسا ہے''۔ سہیل اتنا بتا کر رک گئے۔ وہ خاموش ہو کر دیوار کو تک رہے تھے ایسے گویا وہاں سینما کا پردہ ہو اور اس پر سین نظر آ رہا ہو۔

انھیں خاموش دیکھ کر آصفہ نے پوچھا ''پھر کیا ہوا؟''

''ان خطوط کو حاصل کرنے کے بعد میں اگلے روز اس سے ملنے پہنچا' وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ میں در آنا گھس گیا۔ مجھے اپنے بیڈ روم میں دیکھ کر وہ چونک گیا۔ ''کیسے آنا ہوا'' اس نے پوچھا۔

جواب میں میں نے تصویر بڑھا دی اور بولا ''یہ بتانے آیا ہوں کہ اب تمھارا راز کھل گیا ہے اگر اس راز کو چھپائے رکھنا چاہتے ہو تو اپنا منہ بند رکھنا۔''

وہ بڑے زور سے ہنسا تھا اور اٹھ کر یوں میرے قریب آیا گویا سینے سے لگا لے گا مگر نزدیک پہنچتے ہی اس نے ٹی وی پر رکھا گلدان اٹھایا اور سرعت سے میرے سر پر دے مارا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ میرا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔ پتا نہیں کتنی دیر تک میں بے ہوش رہا۔ ہوش آیا تو میں عجیب حالت میں لٹکا ہوا تھا۔ میرے پیر رسی سے بندھے تھے اور رسی چھت کے کنڈے میں پھنسی ہوئی تھی۔ میرا سر زمین سے دو ڈھائی فٹ نیچے ہو گا۔ عثمانی میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے صرف پیر نظر آ رہے تھے یا پھر آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ لفافہ کہاں چھپایا ہے۔ میں جانتا تھا اسی لفافے میں میری جان ہے اگر لفافہ اسے دے دیا تو وہ مجھے جان سے مار دے گا۔ میں نے بتانے سے انکار کر دیا۔ وہ بھی کم نہ تھا اس نے میرے سر کے نیچے آگ دہکا

دی۔ میرے بال جلنے لگے' چہرہ جھلسنے لگا لیکن میں نے کچھ نہیں بتایا۔ اذیت کی انتہا نے خود ہی مجھے اذیت سے نجات دلا دی۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ دوبارہ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک کھلی جگہ میں پڑا تھا۔ میرے چہرے پر شدید جلن ہو رہی تھی۔ شاید اس نے مردہ سمجھ کر مجھے پھینک دیا تھا۔ میں شہر میں ہوں یا شہر کے باہر مجھے خبر نہ تھی۔ کیوں کہ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تبھی میری سماعت سے پیروں کی آہٹ ٹکرائی اور میں سہم گیا۔ میں سانس روکے دبکا پڑا تھا کہ کسی بچے کی آواز آئی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا کہ ایک آدمی پڑا ہے' پھر مجھے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ قدموں کی آہٹ میرے نزدیک آ کر رک گئی۔ وہ میرے بدن کو ٹٹولنے لگا پھر بڑبڑایا۔ ارے یہ تو زندہ ہے' شاید اسے مجھ پر رحم آ گیا تھا۔ اس نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور اپنی جھونپڑی میں لے آیا۔ میں نے اس کی جھونپڑی میں کئی دن گزارے۔ اسی نے میرا الٹا سیدھا علاج کیا جس سے اتنا فائدہ ہوا کہ آہستہ آہستہ میرے چہرے کی جلن کم ہو گئی' مگر زخم اب بھی باقی تھے۔ میں آنکھیں کھولنے کے قابل ہو گیا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ آنکھیں سلامت تھیں۔ تقریباً ایک ماہ بعد میں اس قابل ہو گیا کہ اٹھ کر چہل قدمی کر سکوں۔ مجھے حیرت تھی کی عثمانی نے مجھے جب کے علاقے میں کیوں پھینکا لیکن پوچھتا تو کس سے؟ اس لیے کہ میرا گلا بیٹھ گیا تھا۔ گلے سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ مجھے یقین تھا ایسا جلنے سے نہیں ہوا ہو گا۔ غنودگی کی حالت میں میں نے عثمانی سے پانی مانگا تھا یقیناً اس نے پانی میں کچھ ملا کر مجھے پلا دیا تھا۔ اس طرح میری آخری امید بھی دم توڑ گئی تھی۔ میرے گروہ کے لوگ مجھے میری آواز ہی سے پہچانتے تھے۔ ان سے رابطے کا ذریعہ میری آواز ہی تھی۔ اب یہ رابطہ ہی ختم ہو گیا تھا۔ جوانی کی اہمیت بڑھاپے میں ہوتی ہے۔ آواز کی اہمیت گونگے بن جانے پر ہوئی تھی۔ میں مکمل طور پر گونگا نہیں ہوا تھا۔ آواز بھرا گئی تھی۔ خاصا زور لگانے کے بعد گلے سے بہ مشکل پھنسی پھنسی سی آواز نکلتی تھی۔ خود اپنی آواز پہچانی نہیں جاتی تھی۔ جب میں کچھ بہتر ہوا تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب اس غریب پر بوجھ نہ ڈالوں۔ پھر ایک روز میں واپس شہر آ گیا۔ شہر کی ہماہمی وہی تھی۔ رونق میں کمی نہ تھی صرف مجھ میں کمی آئی تھی۔ میرے اندر کتنی کمی آ چکی تھی یہ دیکھنے کے لئے ایک سیلون میں جا پہنچا۔ آئینہ دیکھتے ہی میں بے ساختہ چیخ پڑا۔ یہ تو اچھا ہوا اس غریب کے گھر آئینہ نہ تھا یا تھا بھی تو اس نے چھپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ جھوٹ بولا کرتا تھا' مگر آئینہ کیسے بولتا۔ سیلون میں ہر طرف لگے آئینے نے مجھے سچائی بتا دی۔ مجھے جتا دیا کہ میں اب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ میری گردن پر زندگی بھر کے اعمال کا عذاب چہرے کی صورت میں نمایاں ہو گیا ہے۔ اپنی مکروہ صورت دیکھ دیکھ کر عثمانی پر سخت تاؤ آ رہا تھا۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ عثمانی سے بھرپور انتقام لوں گا اسے اس کی اوقات بتانا ہے۔ میں اس کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ وہاں میں عثمانی سے مقابلہ کرنے نہیں گیا تھا۔ خطوط اور تصویر لینے گیا تھا۔ میں نے خطوط اور تصویر کو اپنے گھر میں یا ہیڈ کوارٹر میں چھپانے کے بجائے اسی کے لان میں چھپایا تھا۔ بنگلے کے پیچھے والی دیوار میں مجھے ایک سوراخ نظر آیا تو اسے دیکھ کر ایک خیال سوجھا۔ یہ ان چیزوں کو چھپانے کی بہترین جگہ تھی۔ عثمانی کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی خفیہ چیزیں اسی کے گھر میں پوشیدہ ہیں۔ میں نے اس سوراخ کو مزید بڑا کیا اور اس میں خطوط وغیرہ رکھ کر گیلی مٹی کا پلستر لگا دیا تھا۔

میں ابھی لفافہ نکال ہی رہا تھا کہ عثمانی نظر آیا۔ وہ اپنی کار پر بیٹھا کہیں جا رہا تھا۔ میں دیوار پھلانگ کر تیزی سے سڑک پر پہنچا۔ میری جیب میں اس وقت کل ڈھائی سو روپے تھے۔ جو میں نے اس محسن کے گھر سے چوری

کیے تھے۔ جس نے مجھے پناہ دی تھی، میرا علاج کرایا تھا۔ اتنے روپے ٹیکسی کے لئے کافی تھے۔ میں نے ایک اشارے سے ٹیکسی کو روکا اور اس کا تعاقب کرنے لگا۔ جب وہ چورنگی سے دائیں جانب مڑا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہ راستہ میرے ہیڈ کوارٹر کی طرف جاتا تھا۔ کچھ دیر بعد تصدیق بھی ہوگئی۔ اس نے اپنی کار کو اس بلڈنگ کی پشت پر روکا تھا جس میں میرا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس وقت تو میں اچھل پڑا جب وہ خفیہ دروازے کی سمت بڑھا۔ وہ ایک عام سا دروازہ تھا مگر برابر والے گھر کا خفیہ راستہ اسی گھر کے اندر سے تھا۔ میں نے ٹیکسی والے کو فارغ کیا اور اسی دروازے پر پہنچ گیا۔ خفیہ بٹن دبا کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ کوریڈور پار کیا۔ اندر کمرے میں پہنچا۔ یہ وہی کمرا تھا جس میں، میں کبھی آرام کیا کرتا تھا اس کے بعد ایک اور کمرا تھا۔ وہ کمرا سب سے اہم تھا۔ ایک سو ساٹھ گز کے اس کمرے کو ہال کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اس ہال کا دروازہ دوسری جانب مین گیٹ کی طرف کھلتا تھا۔ عام کارکن ادھر سے ہی آتے تھے۔ ہال میں یہاں سے وہاں تک قطار در قطار صوفے بچھے تھے۔ اس پر کارکن بیٹھتے تھے۔ ان کا رخ اس کمرے کی جانب ہوتا تھا۔ اس کمرے کے بعد والا حصہ ہال کا ہی حصہ تھا۔ درمیان میں فائر پروف شیشے کی دیوار تھی۔ شیشہ دھندلا تھا تاکہ شیر خان کو کوئی پہچان نہ لے۔ میں شیشے کے اس پار سفید داڑھی مونچھیں اور ہرے کنٹیکٹ لینس لگا کر بیٹھتا تھا اور مائک پر اپنے کارکنوں سے مخاطب ہوتا تھا، انھیں حکم دیتا تھا، لیکن اس دن میری خاص کرسی پر عثمانی بیٹھا تھا اس نے اندر جاتے ہی میک اپ کر لیا تھا اور میرے مخصوص کرخت قبائلی لہجے میں کارکنوں کا حکم دے رہا تھا۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ میرے سارے پتے پٹ گئے تھے۔ میری برسوں کی محنت پر اس نے قبضہ کر لیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آج انسپکٹر رابیل نے تڑپ چال چلی ہے۔ میں نے جیمس اینڈ جیوبز کو دیکھا ہے وہاں کوئی کیمرا نہیں ہے۔ یقیناً لڑکیوں کو پھانسنے کے لئے اس نے رپورٹر کمال کے ساتھ مل کر چال چلی ہے۔ اسے ناکام کرنا ضروری ہے۔ میں چودھری کو یہ ڈیوٹی سونپتا ہوں کہ وہ ان لڑکیوں کو رابیل کے چنگل سے چھڑا لائے۔ ایسی عقل مند لڑکیوں کی ہمیں ضرورت ہے۔ سنڈیکیٹ کو میں کئی دوسرے ممالک میں بھی پھیلانا چاہتا ہوں۔ اس کام میں یہ لڑکیاں اہم کردار ادا کریں گی۔'' سہیل بولتے بولتے رکے اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔ ''تمھیں یاد ہوگا رابیل کہ اس دن ایک گمنام فون آیا تھا؟''

''ہاں!'' میں نے کہا۔ ''کسی نے فون پر اطلاع دی تھی کہ شیر خان کو شبہ ہے کہ لڑکیاں تم سے ملنے تمہارے بنگلے پر آئیں گی۔ وہ انھیں اپنے قبضے میں کرنا چاہتا ہے۔ تم ہوشیار رہنا۔''

وہ میں ہی تھا۔ جب تم نے چودھری کو گرفتا کر لیا تو میں نے پھر عثمانی کا تعاقب کیا تھا اور ہیڈ کوارٹر کے اسپیشل روم تک پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس نے اپنے خاص آدمی اشفاق سے کہا تھا کہ وہ خود چودھری کو چھڑانے جائے گا۔ میں نے اپنے دور میں کبھی کسی مشن کو خود انجام نہیں دیا مگر وہ زعم میں نکل پڑا۔ وہ بھی اس کے پیچھے تھا اسے ناکام کرنے کے لئے میں نے ہی شگفتہ کو بھیجا تھا۔''

''آپ نے مجھے حکم دیا تھا؟'' شگفتہ نے قطع کلامی کی۔

''ہاں میں نے لیکن تمھیں فون آصف نے کیا تھا۔ آصف سنڈیکیٹ کا خاص آدمی ہے۔ میں نے اس کی بیوی بچوں کو ریوالور کی زد پے لے کر تھانے فون کرنے کو کہا تھا۔ جب اس نے رابیل سے بات کر لی تو میں نے دوسرا فون شگفتہ کو کرایا تھا۔ شگفتہ کو ہیروئن کی عادت کالج سے لگی تھی۔ بعد میں وہ آصف سے خریدنے لگی۔ عثمانی تو میری طرح پردے میں تھا اس لیے آصف جان نہ سکا کہ وہ اپنے چیف کی بیٹی کو ہیروئن سپلائی کر رہا ہے۔ مفت

ہیروئن کی لالچ میں شگفتہ تیار ہوگئی۔ میں نے آصف کے ذریعے اسے وہ مکالمے بھی بتا دیے جو اس نے تھانے میں کہا تھا۔ اس مکالمہ کو سنتے ہی عثمانی پاگل ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں نے شگفتہ کو اس کے کالے کرتوت بتا دیے ہیں۔ وہ جلد بازی میں اپنا پلان بھول گیا اور پستول کے زور پر چودھری کو لے بھاگا کیوں کہ اس وقت لڑکیوں سے زیادہ اسے چودھری ہی اہم نظر آیا تھا۔ یوں بھی وہ سنڈیکیٹ کا اہم رکن تھا۔ وہ بھاگ کر کہاں چھپا تھا۔ میں نے جلد ہی پتا لگا لیا اور اسے گرفتار کروا دیا۔''

''لیکن انکل!'' آصفہ نے کہا۔ ''عثمانی کی جگہ وہ کون تھا جو جیل میں سزا کاٹنے پر تیار ہو گیا تھا۔ جسے آپ نے جیل کے دروازے پر گولی ماردی تھی؟''

''بیٹی۔ وہ سنڈیکیٹ کا ایک پیادہ تھا۔ میں نے اپنے گروہ میں چن چن کر لوگ جمع کیے تھے۔ ان میں ایک غنی بھی تھا۔ غنی کے بارے میں مجھے اطلاع ملی کہ وہ آج عثمانی سے ملنے اسپتال جائے گا۔ عثمانی بیمار بن کر اسپتال آگیا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ فرار ہونا چاہتا ہے۔''

''لیکن یہ اطلاع آپ کو ملتی کیسے تھی؟'' صادقہ نے پوچھا۔

''گروہ میں ایک شخص ایسا بھی ہے جسے میں نے احسانوں تلے دبا رکھا ہے۔ ابھی صرف اسے پتا ہے کہ عثمانی نقلی باس بن کر بیٹھا ہے۔ میں نے وہ احسان اسے یاد دلا کر بتایا تھا کہ اصل باس میں ہوں۔ اسے تاکید بھی کر رکھی ہے کہ وہ کسی سے بات نہ کہے۔''

''پھر کیا ہوا؟'' نجمہ نے پوچھا۔

''غنی سنڈیکیٹ میں آنے سے پہلے اسٹیج آرٹسٹ تھا۔ ایک منجھا ہوا ایکٹر وہ ہر ایک کی کامیاب نقل اتار لیتا تھا اس کا قد کاٹھ بھی عثمانی جیسا تھا، اس نے سر پر ہیٹ لگا رکھا تھا جس کا کونا جھکا ہوا تھا' آدھا چہرہ ڈھکا تھا وہ ڈاکٹر کے بہروپ میں اسپتال پہنچا۔ اس کے تعاقب میں میں خود تھا لیکن مجھے اسپیشل وارڈ کے اندر گھسنے کا موقع نہیں ملا۔ اسپیشل وارڈ میں ایک سپاہی کی ڈیوٹی تھی۔ پتا نہیں کس چال بازی سے اسے بھی باہر کر دیا گیا تھا۔ وہ دروازے کے باہر بیٹھا تھا۔ دروازے کے باہر میں بھی تھا مگر دور دور، تقریباً آدھے گھنٹے بعد غنی باہر نکلا۔ ڈاکٹروں والا بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ تیز قدموں سے باہر آ گیا میں پھر اس کے تعاقب میں لگ گیا۔ وہ سیدھا ہیڈ کوارٹر کے پیچھے کی طرف پہنچا اور خفیہ دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ میں بھی دبے پاؤں تعاقب میں تھا۔ مجھے حیرت بھی تھی کہ ایک عام کارکن کو اس دروازے کا پتا کیسے چلا؟ لیکن اندر کا منظر دیکھتے ہی ساری بات سمجھ میں آ گئی، وہ عثمانی تھا۔ یقیناً غنی نے اپنا میک اپ اس پر کر دیا تھا۔ یعنی خود تو اندر رہ گیا اور اسے اپنے کپڑے پہنا کر بھیج دیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کسی کا دھیان نہیں جاتا اور یہی چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے جرم کو جنم دیتی ہیں۔ جیل میں واپس لے جاتے وقت کسی نے خیال بھی نہ کیا ہوگا کہ یہ داڑھی نقلی ہے۔ داڑھی کے پیچھے جو چہرہ ہے اسے بلیچ کریم کے ذریعے گورا کیا گیا ہے اور جو سر پر جو ٹوپی ہے وہ چہرے کے خدوخال تبدیل کرنے کے لیے پہنی گئی ہے۔ اگر کوئی بغور دیکھتا تو غنی کو پکڑ لیتا لیکن وہاں تو تعداد دیکھی جاتی ہے، خدوخال نہیں۔'' سہیل سانس لینے کو رکے۔ جلدی جلدی بولنے سے انکی سانس رکنے لگی تھی۔ وہ رک کر سانسیں درست کرنے لگے۔

''لیکن میں نے تو غور کیا تھا۔ وہ عثمانی ہی تھا۔'' میں نے کہا۔

''دراصل تم اسے ایک زمانے تک دیکھتے رہے ہو۔ ہلکی سی جو تبدیلی آئی اس پر تم نے توجہ نہ دی۔ تم نے غور کیا

ہو گا تمھارا ایک دوست جو دن بدن صحت مند ہو رہا ہے اس کی تبدیلی تم محسوس نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تمھارا لاشعور بھی اس کی تبدیلی کو اسی طرح قبول کرتا رہتا ہے۔ اسی لیے تم نے بھی اس کی تبدیلی محسوس نہیں کی۔"

"ہاں یہ ممکن ہے۔" آصفہ نے کہا۔ "لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ ہم میں دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔"

"بات یہ ہے بیٹے!" سہیل بولے۔ "تمام نشیلی ادویات کی ماں افیون ہے اور افیون کی کاشت صوبہ سرحد کے پار ہوتی ہے۔ اس کام پر مافیا کی اجارہ داری ہے۔ شیر خان سنڈیکیٹ کو افیون خریدنے کے لئے مافیا کو منہ مانگی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ پلان میرا ہی تھا کہ کسی طرح وہاں کی مافیا کو شکست دے دی جائے۔ کسان ہم سے براہ راست سودا کریں لیکن یہ کام آسان نہیں۔ اس کے لئے تو دماغ لڑانے کی ضرورت ہے۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ وہ تم چھے جیالوں سے وہ کام لے گا۔"

"اور آپ کا مشن کیا ہے؟" آصفہ نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

"میرا مشن اپنا عہدہ واپس لینا ہے۔" سہیل مسکرائے۔

"دیکھئے انکل، ہم پیشہ ور مجرم نہیں ہیں۔ جرم کرتے ہیں ایڈونچر کے لئے اور آپ پیشہ ور مجرم ہیں۔ پھر آپ قوم کو ناکارہ کرنے کے لئے زہر بانٹ رہے ہیں۔" آصفہ کی بات میرے دل کو لگی میں نے بھی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ہمارا یہ ملک بہت قیمتی ہے۔ پوری دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ ایک بھی ملک ایسا نہیں ملے گا اس ملک کے لئے جتنی قربانیاں دی گئی ہیں کسی اور ملک کے لئے نہیں۔ تاریخ اٹھا کر دیکھیں ایک دو نہیں لاکھوں کی تعداد میں لاشیں گری تھیں، معصوموں کے خون سے گارا بنا کر اس ملک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ ہزاروں بہنوں کی عزت کے بدلے ہمیں یہ وطن ملا ہے اور اس کی قیمت ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کو آج بھی چکانا پڑ رہی ہے۔ ہم یہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ اس ملک کے نوجوان ناکارہ ہو جائیں۔"

"بیٹے! تم جوش کے عالم میں ہو۔ بغور دیکھو۔ ملک کے اس کونے سے اس کونے تک کیا ہو رہا ہے۔ ملک کے لئے کون سوچ رہا ہے۔ سب اپنی بلڈنگ بنانے کی فکر میں ہیں۔"

"انکل، یہ سراسر غلط ہے۔ غلط بات جلدی نظر آ جاتی ہے۔ اس ملک میں وطن پرستوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن وہ خاموش مجاہدین ہیں۔ خاموش رہ کر وطن کی خدمت کرتے ہیں۔ غداروں کا کام کالا ہوتا ہے اور سیاہی جلدی نظر آ جاتی ہے۔"

"اور ایسے ہی مفاد پرستوں کو ہم آلہ کار بناتے ہیں۔" سہیل مسکرائے۔

"لیکن ہم مفاد پرست نہیں ہیں۔" صادقہ جھنجلائی۔

"یہ بحث بعد میں ہو گی۔ فی الحال تم سب مجرم ہو۔ قانون سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے ہمارا ساتھ دو، بعد میں اگر چاہو تو الگ ہو جانا۔"

"ہاں یہ ممکن ہے۔" میں نے کہا۔

"یوں بھی ہمیں پرانا حساب چکتا کرنا ہے۔" کمال نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے تو میں نے تم لوگوں کو چنا ہے۔ عثمانی صرف میرا ہی نہیں تم لوگوں کا بھی دشمن ہے۔"

"ہاں وہ ہم سب کا دشمن ہے اس کی بوٹیاں نوچوں گی میں۔" نجمہ کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"انکل! کیا عثمانی جانتا ہے کہ ہم آپ کے ساتھ مل گئے ہیں؟" صادقہ نے پوچھا۔

"اگر نہیں جانتا ہو گا تو اب جان جائے گا۔ تمھیں یہاں پہنچا کر میں ہیڈ کوارٹر کے اسی خاص کمرے میں گیا تھا۔ عثمانی نہیں تھا۔ اس کے لئے خط چھوڑ آیا ہوں۔"

"کیسا خط؟" شگفتہ بولی۔

"اس کی ایک فوٹو کاپی یہ رہی۔" سہیل نے خط بڑھایا۔

ہم سب ایک ساتھ جھک گئے۔ خط پڑھتے ہی شگفتہ نے کہا۔ اس کا مطلب ہے آپ شیر خان سے ملے ہوئے ہیں؟ اس کے چہرے پر غصے کی جھلک تھی۔

"کیسے؟" سہیل مسکرائے۔

"اس طرح کہ آپ شیر خان کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ آپ اسے بہت جلد عثمانی کی لاش دیں گے یعنی عثمانی شیر خان نہیں ہے کوئی اور ہے۔"

"اس کا ایک مطلب اور ہے۔" کمال بولا۔ "عثمانی ہماری مدد سے سنڈیکیٹ کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ مسٹر سہیل شیر خان سے ملے ہوئے ہیں۔ اسے اطلاع دے رہے ہیں کہ وہ فکر نہ کرے اور سہیل وغیرہ میرے قبضے میں ہے۔"

سہیل کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ چھائی رہی انھوں نے کچھ توقف کے بعد پوچھا۔ "کیا سب کا خیال یہی ہے؟"

"نہیں۔" آصفہ نے کہا۔ "میں اس خط کا راز جان چکی ہوں۔"

"اور میں بھی؟" میں نے جواب دیا۔

"تب انھیں بتا دو۔" سہیل بولے۔

میں نے قلم نکالا اور اس خط پر نشان لگانے لگا۔

شیر خان!
پہلے کی طرح پریشان ہو گئے۔
لیکن یقین رکھو ہم بہت طاقت ور ہیں۔
اب تو یہ چھے جاں باز بھی میرے قبضے میں ہیں۔
اب وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔
سمجھ سکتے ہو کہ اب میں جلدی تمھیں
عثمانی کی لاش دوں گا۔ سوچ رہا تھا کہ
تمھیں مار کر اپنی ریاست واپس لے لوں گا۔ اب وہ خود ہمارے جال میں پھنس گیا ہے۔
تم جانتے ہو کہ یہ چھے جان باز چاہیں تو تمہاری سنڈیکیٹ میں چار چاند لگا سکتے ہیں اور دشمن کی۔ ریاست جلا کر خاک کر سکتے ہیں۔
تمھارا خیر خواہ
موت کا ہرکارہ

"بہت خوب!" سہیل نے تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا۔

اس میں حیرت انگیز تو کچھ نہیں ہے۔ایسے خطوط تو عام طور سے بچے ایک دوسرے کو لکھتے ہیں۔'' آصفہ نے کہا۔''ایک ایک سطر چھوڑ کر پڑھتے چلے جایئے۔''

''تمہاری بات سچ ہے۔ایسے خطوط نو جوانی میں ایک دوسرے کو لکھتے تھے۔عثمانی کو خاص شوق تھا۔اتنے سال بعد ہم نے پھر اسی شوق کو دھمکی کے لیے استعمال کیا ہے۔''

''اب یقیناً تمہاری تلاش شروع ہوگئی ہوگی؟'' آصفہ نے مسکرا کر کہا۔

''صرف میری نہیں تمہارے ساتھیوں کی بھی۔'' سہیل مسکرائے۔

''آپ نے ایک بہت بڑی غلطی کر دی ہے انکل۔'' میں نے کہا۔

''غلطی؟ کیسی غلطی؟''

''اب آپ اس کمرہ خاص میں کبھی نہیں جاسکیں گے اگر کبھی کوشش کی تو وہ آپ کا آخری دن ہوگا۔''

''واقعی میں نے اس پوائنٹ پر سوچا ہی نہیں تھا۔'' سہیل کا چہرہ بجھ سا گیا۔''اب کیا کروں تم لوگ ہی بتاؤ۔''

''اس کا حل ڈائریکٹ ایکشن ہے اور ایکشن کے لئے ہیڈ کوارٹر کا مکمل جغرافیہ معلوم ہونا ضروری ہے۔''

''ہیڈ کوارٹر چائنیز ہوٹل کی عمارت کے نیچے ہے اور اس کا راستہ کچن سے ہو کر گزرتا ہے وہ ایک بارہ بائی بارہ کا کمرا ہے ظاہر میں وہ ایک اسٹور روم ہے اور اس میں کاٹھ کباڑ بھرا رہتا ہے لیکن وہ ایک بڑی سے لفٹ ہے۔ ہیڈ کوارٹر میں جانے والے کو کچن سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔کچن میں کام کرنے والے شیر خان سنڈیکیٹ کے سکیورٹی آفیسر ہیں۔اس دستے میں تقریباً بائیس افراد ہیں۔ان کے سربراہ کا نام جاگیر خان ہے۔یہ نام بھی شیر خان کی طرح فرضی ہے سکیورٹی دستے کے افراد سنڈیکیٹ کے ہر ممبر کو پہچانتے ہیں۔اس کے باوجود وہ پوری طرح چیک کرنے کے بعد ہی میٹنگ ہال میں جانے کی اجازت دیتے ہیں۔نیچے کی جانب ٹی وی اسکرین ہے۔جس پر ہر وقت ایک آدمی نظر رکھے رہتا ہے کہ اب کسے نیچے جانے کا اشارہ ملا۔اشارہ دیتا ہے جاگیر خان۔وہ دانتوں میں خلال کرتا ہے۔ٹی وی کے سامنے بیٹھا شخص لفٹ کا بٹن دبا دیتا ہے۔

''لفٹ رکتی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بیس فٹ نیچے۔لفٹ رکتے ہی ممبر خود کو گیلری میں پاتا ہے۔گیلری دو فٹ چوڑی اور تیس فٹ لمبی ہے۔ وہاں گارڈ کھڑے رہتے ہیں اور لفٹ سے باہر آنے والے کی تلاشی لی جاتی ہے۔جیب خالی ہونے کے بعد ہی وہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔گیلری کے آخری کونے پر ایک کمپیوٹر ہے۔اسے میں نے خاص آرڈر پر جاپان سے بنوا کر منگوایا ہے۔اس کی اجازت کے بغیر کوئی بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔''

کمپیوٹر اجازت کیسے دیتا ہے؟''

''وہ کمپیوٹر کسی دروازے کی طرح گیلری کے آخری سرے پر فکس ہے۔سنڈیکیٹ کا ایک بھی ایسا ممبر نہیں ہے جس کا بائیو ڈیٹا اس کمپیوٹر میں فیڈ نہ ہو۔کمپیوٹر کے آگے فرش پر دو بائی دو کا ایک فولادی چبوترا ہے۔ٹھیک ویسا جیسا وزن کرنے والی مشین کا ہوتا ہے۔اندر جانے والے کو اس پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔کمپیوٹر خود چیک کر کے سبز بلب جلا دیتا ہے اور اگر سرخ بلب جل جائے تو گیلری میں کھڑا گارڈ فوراً اسے حراست میں لے لے گا۔''

''کمپیوٹر کے کام کرنے کا طریقہ؟''

آگے کا احوال جاننے کے لیے
آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں

حنیف سحر

گردشِ رنگِ چمن

رسا چغتائی کا خیال

صرف مانع تھی حیا بند قبا کھلنے تلک
پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

اس عورت کا حقیقی روپ سامنے لاتی کہانی جسے زمانہ طوائف کہتا ہے، پانچواں حصہ



"جی!" میں نے دیکھا ایک نہایت موٹا تازہ بھرے بھرے جسم کا مالک ایک نوجوان مجھ سے مخاطب تھا میرے روبرو تھا مگر اس کا سوال کہ آپ اکیلی ہیں میری جان نکالنے کے لیے کافی تھا اس کی خوب صورت من موہنی سی شخصیت دیکھ کر کوئی اور وقت ہوتا تو میں شاید کچھ دیر کو محظوظ ہو لیتی مگر یہ تو ایسا وقت تھا کہ میری زندگی ایک کٹی پتنگ کی طرح بن چکی تھی جو خود کو لٹنے سے بچانا بھی چاہے تو بچا نہ سکے... بس مجھ میں اور ایک کٹی پتنگ میں اتنا ہی فرق تھا کہ میں خود کو بچانے کا سوچ سکتی تھی کچھ تدبیریں بھی کر سکتی تھی بھلے ان سوچوں ان تدبیروں کے بعد بھی میرا انجام وہ ہی کیوں نہ ہو جو کٹی پتنگ کا ہوتا ہے پھر بھی میں ایک انسان تھی اور اپنی اس فطرت سے مجبور بھی تھی کہ خود کو ہر وقت ہر لمحہ جیسے بھی ممکن ہو بچاتی رہوں.... اس وقت میرا دل چاہا کہ کاش میں ایک پتنگ ہی ہوتی جس کے لٹنے کا کوئی احساس بھی کسی کو نہیں ہوتا... دل تو چاہا اس لڑکے سے پورے وجود کی تلخی سے پوچھوں کہ اسے کیا تکلیف ہے میں اکیلی ہوں یا نہیں ہوں... مگر پھر یہ سوچ کہ خاموش رہی کہ میری پوزیشن ایسی نہ تھی کہ میں کسی سے چھوٹی سی بھی دشمنی مول لے سکتی... دنیا ویسے بھی بہت عجیب جگہ ہے یہاں لوگ بلاوجہ بھی دشمن ہو جایا کرتے ہیں...

"جی آپ نے کیسے جانا...؟" میں نے قدرے ملائمیت سے پوچھا

"عموماً ان ریلوے کے اسٹالوں پر خواتین خریداری نہیں کرتیں... یا تو اکیلی خواتین بحالت مجبوری ایسا کرتی ہیں یا پھر جن کے ساتھ جوان لڑکیاں ہوں انھیں ایسا کرنا پڑتا ہے۔" اس نے لہجہ بدلا اور پھر بولا۔ "آپ کے ساتھ کوئی جوان لڑکی تو ہو نہیں سکتی کیوں کہ ابھی تو آپ خود ہی جوان ہیں تو میں سمجھ گیا کہ آپ اکیلی ہو سکتی ہیں۔"

"بڑی گہری نظر ہے آپ کی ریلوے اسٹیشنوں اور ٹرینوں میں سفر کرنے والی خواتین کے بارے میں!"

"میں اکثر آتا جاتا رہتا ہوں... کہیں آپ مجھے غلط نہ سمجھ رہی ہوں اس لیے میرا خیال ہے مجھے جلدی سے یہ بتا دینا چاہیے کہ میں ایسی اکیلی خواتین کی مدد کر دیا کرتا ہوں... میرا نام احسن ہے' آپ کو کیا چاہیے لائیے میں لے دیتا ہوں... آپ اپنی سیٹ پر جا کے بیٹھ جائیں میں وہیں لاتا ہوں..."

"میں نے اس کی معصومیت پر فوراً اعتبار کرتے ہوئے اسے پیسے دیے اور اپنے لیے چائے اور چپس لانے کو کہا، اس نے پھر کچھ نہیں کہا اور جلدی سے میری مطلوبہ چیزیں لینے چلا گیا... میں اسی جگہ کھڑی رہی جہاں وہ مجھے کھڑا چھوڑ گیا تھا کچھ دیر میں وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں دو چپس کے پیکٹ اور دو چائے کے ڈسپوزیبل گلاس تھے...

"لگتا ہے آپ کو مجھ پہ اعتبار نہیں تھا؟" وہ مجھے چائے دیتے ہوئے بولا۔

"کیوں ایسا کیوں کہا آپ نے...؟"

"آپ اب تک یہیں جو کھڑی ہیں' میں نے کہا تھا آپ اپنی سیٹ پر چلی جائیں۔" وہ سرسری انداز سے بولا۔

"ایک سو کا نوٹ ہی تو دیا تھا میں نے اسے لے کر آپ بھاگ بھی جاتے تو کون سا میرے اعتبار کا خون ہو جاتا، دنیا میں تو بڑے بڑے اعتبار تنکوں کی طرح ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔" خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کے باوجود میرے اندر کا دکھ میرے لہجے میں جھانکنے لگا۔

"آپ بہت دکھی لگتی ہیں..؟"

مجھے معلوم تھا اس کا اگلا سوال یہی ہوگا.. اس

لیے اسے نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "آپ کیا کرتے ہو احسن؟"

"میں فی الحال تو اپنے رزلٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے ایسے کہا جیسے وہ اپنے بارے میں زیادہ بات نہ کرنا چاہتا ہو۔

"کراچی کیوں جا رہے ہو؟" میں نے پھر ایک سوال صرف اس لیے جلدی سے کر دیا کہ کہیں وہ میرے بارے میں کوئی سوال نہ کر بیٹھے میرے پاس بتانے کو تھا ہی کیا۔ جو تھا' اس میں کچھ ایسا نہ تھا جو کسی کو بتایا جاتا کم سے کم کسی اجنبی کو تو بالکل بھی نہیں..

"میں اس لیے کراچی جا رہا ہوں کیونکہ میں کراچی میں رہتا ہوں۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ میں کچھ جھینپ سی گئی اور جیسے کوئی اور سوال جلدی سے کرنے کی جو ہوشیاری میں دکھا رہی تھی' وہ بھی بھول گئی۔

"اور آپ کہا جا رہی ہیں؟"

"میں بھی کراچی جا رہی ہوں۔" میں نے کتنی بھی جلدی میں کہا اور کتنے بھی اعتماد سے کہا مگر اس میں یہ ایک بات بہر حال تھی کہ میں آپ ہی آپ یہ سوچ رہی تھی کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے اس بندے سے جس کا نام احسن ہے مزید کوئی مدد لینی چاہیے اُس سے یا اب تھوڑی دیر کی شناسائی کو یہیں روک دینا چاہیے اگر میں ایسا کرتی ہوں تو اس اجنبی شہر میں میں آخر جاؤں گی کہاں.. ہو سکتا ہے یہ میری کوئی مدد کر سکے..

"کراچی میں آپ کہاں جا رہی ہیں؟ ہو سکتا ہے میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں.. مائنڈ مت کیجیے گا میں نے صرف اس خیال سے کہا کیوں کہ آپ کے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے' آپ اکیلی ہیں آپ کو اسٹیشن سے باہر نکلنے کے لیے بھی سامان وغیرہ اٹھانے کے واسطے کسی نہ کسی کی مدد تو لینی ہی ہوگی۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں.. مجھے آپ کی مدد لینی ہی ہوگی۔ میرے پاس سے میرے انکل کا ایڈریس کھو گیا ہے.. اور میں کراچی میں انھیں کیسے ڈھونڈوں گی یہ سوچ رہی ہوں بہت دیر سے..."

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا' ٹرین روانہ ہونے کی سیٹی بج گئی اور میں اس کے ساتھ جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی اپنے ڈبے میں آ گئی گفتگو کے درمیان چائے ہم دونوں ہی پی چکے تھے اس لیے گلاس وہیں پھینک دیے گئے البتہ چپس اب بھی ہمارے ہاتھوں میں تھے اور حسب دستور وہ اپنے زیادہ تر چپس کھا چکا تھا میرے چپس زیادہ بڑی مقدار میں ابھی باقی تھے۔ گاڑی میں پہنچ کر ہمیں اس طرح کی گفتگو کرنے کا موقع نہ ملا' وہ بیس بائیس سال کا خوبصورت لڑکا بھی پوری طرح ایسے معاملات سے واقف تھا.. بس ایک بے چینی سی تھی جو غالباً دونوں طرف تھی میرے پاس اس پہ اعتبار کرنے کے علاوہ اور چارہ بھی کوئی نہیں تھا وہ کتنا بھی دھوکے باز کیوں نہ ہو میرے ساتھ کیسا ہی سلوک کیوں نہ کرے کراچی پہنچ کر میں مجبور تھی کہ اس کی مدد لوں اور دیکھوں کہ اب زندگی میرے ساتھ کیا کرتی ہے۔

اگلا اسٹیشن آتے ہی اس نے مجھ سے بھی زیادہ عجلت دکھائی اور ہم پلیٹ فارم پر اتر گئے وہ میری توقع سے زیادہ مطمئن تھا لہٰذا نہایت سکون سے بولا کیا کھائیں گی؟ اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔ "آپ میری مدد کریں گے؟"

"کیوں نہیں' بالکل کروں گا' آپ کہاں جائیں گی؟" اس نے پوچھا..

آج سوچتی ہوں تو کتنی حیرت ہوتی ہے کہ مجھ میں وہ ہمت بے غیرتی اور بے باکی کہاں سے آ گئی تھی میں نے اپنی ساری حالت کا خوب اچھی طرح اندازہ کر کے کہا تھا۔

''مجھے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو؟'' اس نے بڑی غضب کی حیرانی سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''مذاق کر رہی ہیں آپ؟'' وہ مسکرایا۔

''نہیں، میں مذاق نہیں کر رہی، میں پوری طرح سچ بول رہی ہوں۔''

''گھر سے بھاگ کر آئی ہیں آپ؟'' وہ میرے کچھ قریب آ کر سرگوشی میں بولا۔

''کسی بھی سوال کا جواب کراچی پہنچ کر دوں گی، مجھے بس یہ بتا دو، مجھے لے چلو گے یا نہیں؟''

''جی، لے چلوں گا۔'' یہ مختصر سا جواب دے کر وہ کسی سوچ میں پڑ گیا اور اتنی دیر میں پھر گاڑی کی وسل بج گئی ہم دونوں پھر سے ٹرین میں سوار ہو گئے۔ میری سوچوں کی ٹرین اس ٹرین سے بھی زیادہ تیز دوڑ رہی تھی اور مجھے سوچنے کی نئی راہیں سجھائی دینے لگی تھیں کہ اب جانے میری زندگی میں کیا ہونے والا ہے ٹرین میں ملے ایک نوجوان سے اس طرح بے دست و پا ہو کر مدد مانگنا ظاہر ہے خود کو بے قیمت بنانے کے مترادف تھا مگر میں جن حالات سے گزر رہی تھی، ان میں ایک بے یار و مددگار عورت اور کر بھی کیا سکتی تھی خود کو حالات کے بہاؤ پر چھوڑنے کے علاوہ میرے پاس اور چارہ بھی کیا تھا۔ اس کے بعد جتنے بھی اسٹیشن آئے ہم دونوں میں ایک قسم کی بے تکلفی سی مسلسل بڑھتی رہی اور ایسا میری طرف سے نہیں بلکہ احسن کی طرف سے زیادہ ہو رہا تھا۔ وہ برابر میرے قریب ہونے میرا ہاتھ پکڑنے اور مجھے کسی نہ کسی بہانے چھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب اگر میں کوئی ایسی لڑکی ہوتی جو نئی نئی جوان ہوئی ہو جس کے پاس خوابوں کا ایک میلہ سا لگا ہو تو جھٹا پٹ اس بے حد من موہنے لڑکے کے عشق میں مبتلا ہو جاتی، وہ کچھ اسی طرح کے اشارے اور ایسی ہی

حرکات کا مظاہرہ کر رہا تھا جس کا سیدھا مطلب یہ ہی تھا کہ اسے مجھ سے ایک سطحی انداز کی محبت ہو چکی ہے اور اب میں ساری کی ساری اس کی ہوں.. ممکن ہے اس کے ذہن میں کچھ ایسے منصوبے بھی بن رہے ہوں کہ وہ مجھے لے جا کر میرے ساتھ کیسے دلفریب لمحے بتانے والا تھا.. سارے راستے وہ میری بڑی غضب کی دیکھ بھال کرتا رہا ٹرین کے سفر میں ایک لڑکی کو جس قسم کی حاجتیں پیش آتی ہیں، وہ ان سب میں میرا مددگار بن گیا اور کچھ گھنٹوں پہلے بلقیس نامی جو لڑکی ٹرین میں اکیلی سوار ہوئی تھی، وہ اب اکیلی نہ رہی تھی بلکہ اس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا چنانچہ جو لوگ مجھے اکیلا دیکھ چکے تھے، وہ جز بز ہوئے کہ یہ کیسے ہوا کہ یوں یکا یک ایک تنہا لڑکی ایک اجنبی لڑکے سے گھل مل گئی... ایک صاحب تو کافی دیر سے یہ تماشہ ملاحظہ کر رہے تھے ان کی برداشت جواب دے گئی اور انھوں نے احسن سے پوچھ ہی لیا کہ میں اس کی کون ہوں.. تب احسن نے انھیں بتایا کہ میں اس کی فرسٹ کزن ہوں اور اسٹیشن پر ہم الگ الگ پہنچنے کی وجہ سے ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ پتا نہیں انھیں کتنا اور کس قدر یقین آیا مگر وہ چپ ہو گئے مگر جتنی دیر ان کا سفر ہمارے ڈبے میں رہا میں نے ہمیشہ انھیں اپنی طرف متوجہ پایا... اور یہ میری توقع کے عین مطابق تھا کہ ایک اور اسٹیشن پر جب احسن کچھ دور سے میرے لیے کوئی کھانے کی چیز لینے گیا تو وہ اس موقع کی تلاش میں تھے اور جھٹ میرے قریب آ کر بولے۔

''یہ لڑکا آپ کو بے وقوف بنا رہا ہے، میں نے اکثر ایسے لڑکیوں کو اسی طرح ورغلاتے دیکھا ہے، اس کا تو یہ کام ہے لڑکیوں کے ساتھ مسخری کرنا اور انھیں بے وقوف بنانا۔''

میں نے انہیں غور سے دیکھا، وہ ایک چالیس

کے لگ بھگ والی عمر کا بندہ تھا شکل سے شریف آدمی لگا حالانکہ میں کون سی بڑی جہاندیدہ تھی کہ شکلوں سے انسانوں کو پہچاننے لگوں... پھر بھی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا... اصل میں کچھ لوگ اپنی فطرت سے عجیب خدائی فوجدار قسم کے ہوتے ہیں وہ دوسروں کو کسی گڑھے میں گرتے دیکھ کر دل سے چاہتے ہیں کہ گرنے والے کو بچا لیں.. ایسا کرتے وقت کتنی ہی بار انھیں ایسا بھی لگتا ہے کہ کیوں پرائی آگ میں کودیں پھر انھیں آخری سطح کی کوئی کوشش کرنے میں ہی چین ملتا ہے کہ انھوں نے اپنے ضمیر کے مطابق کوشش تو کی، آگے ڈوبنے والے کا نصیب وہ اپنی جانب سے اپنے اندر لگی عدالت سے بری ہو گئے اور وہ جو آرڈر آرڈر کی آواز انھیں بے چین کیے ہوئے تھی، اس سے بھی کسی نہ کسی طرح نجات مل گئی لیکن میرے جواب نے تو ان کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے۔ میں نے ان سے کہا تھا۔ ''میں جانتی ہوں کہ وہ بس دل لگی کر رہا ہے اور میں بھی کوئی سنجیدہ نہیں ہوں مگر اس بات کی ضمانت آپ دے سکتے ہیں نہ میں دے سکتی ہوں کہ پتا نہیں کب ہم دونوں سنجیدہ ہو جائیں لہٰذا آپ پریشان نہ ہوں میں ٹھیک ہوں اور اس قسم کے حالات سے نمٹنا جانتی ہوں..''

انھوں نے عجیب برے سے منہ کے ساتھ مجھے دیکھا اور جیسے غصے سے چلے گئے انھوں نے کہا نہیں مگر میں نے سن لیا کہ وہ کہہ رہے تھے، ہمیں معلوم نہ تھا کہ وہ لونڈا تو ہے ہی بگڑا ہوا مگر آپ اس کی بھی خالہ ہیں... یا پھر انھوں نے سوچا ہو گا کہ عورت کس قدر گر چکی ہے آج کے زمانے میں... احسن نے اسے مجھ سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا اس لیے اس کا پوچھنا لازمی تھا... جب میں نے احسن کو بتایا تو وہ ایک دم سے ہتھے سے اکھڑنے لگا اور بولا کہ میں

ابھی اس کو درست کر کے آتا ہوں..

''مت بھولو کہ اس وقت میں تمہارے ساتھ ہوں اور جھگڑا بڑھنے کی صورت میں اگر بات پولیس وغیرہ تک پہنچ گئی تو ہم کیا بتائیں گے کہ ہم کون ہیں..'' یہ سنتے ہی احسن غصے میں تنتناتا تو رہا مگر چپکا رہا اور پھر کچھ ہی دیر میں میں نے اس کا موڈ ٹھیک کر لیا، وہ اجنبی ہمدرد اب بھی مسلسل ہماری نگرانی کر رہا تھا وہ جس قدر دیکھتا، میں اسی قدر احسن کے قریب ہوتی چلی جاتی تاکہ وہ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دے کیوں کہ شریف لوگ کیسے ہی ہمدرد کیوں نہ ہوں وہ دل میں کتنی بھی بڑی خواہش کیوں نہ رکھتے ہوں کہ ہر برائی ان کے چاہنے سے ختم ہو جائے... مگر ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ برائیاں محض سوچنے سے اور چاہنے سے ختم نہیں ہو سکتیں ان کے لیے عملی قدم اٹھانا پڑتا ہے اور شریف لوگ ایسا یا تو کرتے نہیں ہیں یا پھر کر کے ساری عمر پچھتاتے رہتے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ غریب مجھے صرف خبردار نہ کرتا بلکہ سہارا دینے کی پیشکش بھی کرتا، سچ پوچھیں تو میں نے اس کی شرافت پر اس کے بعد ہی یقین کیا جب اس نے مجھے صرف خبردار کرنا ہی اپنا پورے فرض کی ادائیگی سمجھا، میں ڈوب بھی رہی تھی تو کیا... مجھے سر چھپانے کو ایک ایسا سہارا ہر قیمت پر چاہیے تھا جو مجھے سڑکوں پر بنا مول کے مسلی جانے والی عورتوں کے طبقے میں شامل ہونے سے بچا سکے، یوں سمجھیے کہ میں اس وقت اس کیفیت میں تھی کہ گناہ اگر میرا مقدر بن چکا تھا تو میں اسے کھلے آسمان کے نیچے کرنے سے بہتر محفوظ گناہ کا راستا ڈھونڈ رہی تھی، کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے دنیا کا ہر انسان گناہ کرنے پر آمادہ ہے بس اس کی ان کہی شرط یہ ہے کہ اسے محفوظ گناہ کی آفر ملے جو اس شریف آدمی کو بھی ملتی تو وہ بھی ضرور کر گزرتا... کچھ لوگوں نے اپنے گناہوں اور جرائم کو کور

دینے کے لیے ایک کہاوت یہ بنا رکھی ہے کہ ہر آدمی گناہ کرنا چاہتا ہے' بس یوں ہے کہ جو گناہ کو برا سمجھتے ہیں' وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جنھیں گناہ کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا... سچ پوچھیے تو گناہ گار لوگ بھلے ہی اس بات کو اپنے لیے بطور ڈھال استعمال کرتے ہوں مگر یہ پورا جھوٹ ہے بھی نہیں۔ پتا نہیں' دنیا گناہوں اور ثواب کے پھیر میں کب تک یوں ہی الجھی رہے گی اور کب تک لوگ اپنے گناہوں پر ساری ساری عمر پچھتاتے رہیں گے' پتا نہیں۔۔۔

احسن جس عمر کا تھا' اس میں وہ اتنا خود مختار نہیں ہوسکتا تھا کہ مجھے اپنے گھر میں لے جا کر دھڑلے سے یہ کہے کہ یہ بلقیس ہیں اور اب یہ میرے ساتھ ہی رہیں گی۔

''تو پھر کیا کہنے والے ہو اپنے گھر میں؟''

''بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کو اپنے گھر نہ لے جاؤں بلکہ ایک دوست کے گھر لے چلتا ہوں میں نے اس سے بات کرلی ہے۔''

''دوست سے بات کرلی ہے' کب کرلی یہ بات؟ سارا وقت تو تم میرے ساتھ ہو؟''

''جب میں آپ کے لیے بن کباب لینے گیا تھا تب میں نے اس سے فون پر بات کی تھی ادھر پی سی او سے۔''

''اور تمہارا دوست فوراً مان گیا' اس نے کچھ پوچھا نہیں؟''

''میں نے اس سے کہا ہے کہ آ کے بتادوں گا وہ سمجھ رہا ہے کہ میں کوئی لڑکی بھگا کے لا رہا ہوں۔''

''کیا کرتا ہے تمہارا دوست؟'' میں نے یوں ہی اپنی معلومات بڑھائے رکھنے کو پوچھا...

''وہ جوب کرتا ہے اور بہت ہی آزاد خیال ہے' اکیلا رہتا ہے اسی لیے اکثر دوست اس کے پاس جمع رہتے ہیں۔''

میرے دل میں اب بھی سوالوں کی ایک پوری محفل لگی تھی مگر میں خود احتیاط سے کام لینا چاہتی تھی.. کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ ہوجائے کہ احسن کا سہارا جو ابھی تک ایک تنکے کا سہارا ہے' وہ بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے... اس لیے میں نے چپ رہ کر باقی کا سفر طے کیا ہم دونوں ہی ابھی تک ایک ایسی احتیاط کا دامن پکڑے ہوئے تھے جسے صرف محسوس کیا جاسکتا تھا اور وہ یہ کہ اپنی اپنی زندگیوں میں کم سے کم جھانکیں تا کہ یہ بے نام سا جو رشتہ ہمارے درمیان قائم ہوا ہے' وہ پوری طرح بنا رہے' احسن سے زیادہ میں احتیاط کررہی تھی...

صبح کوئی گیارہ بجے کے لگ بھگ ہم کراچی پہنچ گئے اسٹیشن سے ایک رکشے والے کو احسن نے کوئی پتا سمجھایا میں اس سے قبل کبھی کراچی نہیں آئی تھی یہ محض اتفاق تھا کہ ہمارا کوئی رشتے دار کراچی میں نہیں تھا اگر دور پرے کا کوئی تھا بھی تو اسے میں نہیں جانتی تھی... یہ شہر کس قدر کشادہ اور صاف ستھرا اور خوبصورت تھا کسی اور وقت اچھے حالات میں آتی تو پتا نہیں کتنی خوش ہوتی میں کراچی کو دیکھ کر مگر اس وقت جس کیفیت سے گذر رہی تھی اس میں میرا دل کسی طرف دیکھنے کو نہ چاہتا تھا ان دیکھے ان جانے ڈرانے والے ہیولے مجھے اپنی طرف بڑھتے ہوئے محسوس ہوتے تھے ایسا لگتا تھا کہ میں دھیرے دھیرے کسی ایسی تنگ کوٹھری میں سے گذرتے کسی تہہ خانے میں میں اتر رہی ہوں جو ایک سرنگ کی طرح بس گہرا ہی گہرا تھا اور میں ایسے اتاری جارہی تھی جیسے کوئی لاش ہوں... اور یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی لمبی اور لامتناہی قبر کی طرح ہے جس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں ہے.. جب میں اپنے اس چھوٹے سے علاقے ڈسکہ سے چلی تھی تو میں نے دل میں یہ

طے کیا تھا کہ کراچی پہنچ کر کسی سے سمندر کا پتا پوچھوں گی اور اس میں کود کر جان دے دوں گی ساری زندگی یوں قطرہ قطرہ مرنے سے بہتر ہے کہ میں ایک ہی دفعہ ایک ہی جھٹکے میں اپنی جان لے لوں اور ان سارے عذابوں سے چھٹکارہ حاصل کرلوں جو میری روح کو مسلسل چھلنی کیے دیتے ہیں... لیکن قسمت کو جانے کیا منظور ہے یوں غیر متوقع یہ لڑکا احسن مل گیا اور اس چند گھنٹوں کے سفر میں اس نے مجھ سے ایک ایسا رشتہ بھی استوار کرلیا جسے میں چاہوں بھی تو کوئی نام نہیں دے سکتی... اور ابھی تو یہ فیصل کی طرح ہوس اور جسم کا رشتہ بھی نہیں ہے۔ ٹرین میں ملے دو مسافروں میں کیا رشتہ ہوسکتا ہے اور یوں بھی اس وقت مجھے نئے رشتے بنانے میں کیا دلچسپی ہوسکتی تھی جس کے اپنے سب رشتے چھین لیے گئے ہوں وہ اب اجنبی اور نئے رشتوں پر کیا بھروسہ کرے..

رکشہ ایک سنسان سے علاقے میں آ کے رک گیا احسن اترا تو میں بھی اتر گئی عجیب علاقہ تھا بڑے بڑے بلند بالا گھر بھی ایک قطار سے دوسری قطار تک جا بجا نظر آرہے تھے اور قریب ہی نہایت مفلوک الحال بستی بھی تا حد نگاہ زمین کی چھاتی پہ دھری ہوئی تھی... احسن نے کچھ دیر چلنے کے بعد ایک دو منزلہ عمارت کی بیل بجائی اور بولا۔ ''ساجد فرسٹ فلور پر رہتا ہے۔'' ہم دونوں کے پاس سفری بیگ تو تھے نہیں میں جن حالات میں آئی تھی اس کی وجہ سے میں نے صرف قیمتی چیزیں ہی ان دونوں عزت کے لٹیروں کے پاس سے اٹھائیں باقی کا سامان وہیں چھوڑ دیا البتہ اتنی احتیاط ضرور کی میں نے کہ اپنی کوئی نشانی وہاں نہ چھوڑی تھی تا کہ کسی قسم کے شک وشبہات سے بچی رہوں کیوں کہ میں اب بھی فیصل سے اپنی بربادی کا انتقام لینا چاہتی تھی... سفری بیگ نہ



بہت کچھ یاد ہے اپنی ہی صدا یاد نہیں
دعا میں کیسے کروں حرفِ دعا یاد نہیں

کسی خوشی کا گزر بھی نہیں میرے دل میں
ہوئی ہے مجھ سے کوئی کیسی خطا یاد نہیں

میرے وجود کا احساس بھی نہ کر پائے
میری وفا کا صِلہ کیوں ہے جفا' یاد نہیں

تمام عمر سجائے چراغ پلکوں پر
کہاں پہ کھو گئی امیدِ صبا یاد نہیں

قدم قدم پہ لٹاتا رہا میں خوشیوں کو
صلے میں مجھ کو ملی کیوں یہ سزا یاد نہیں

سِسک سِسک کے جیتا رہا ہوں ہر پل میں
میری حیات کی کیوں ہے یہ ادا یاد نہیں

میرے تو گرد خاموشیوں کے سائے ہیں
جانے کس کس نے مجھے دی ہے صدا یاد نہیں

ادریس کاوش

ہونے سے اس علاقے میں بھی کسی نے ہمیں دیر تک اور کھوج کے ارادے سے نہ دیکھا جس کی وجہ سے مجھ سے زیادہ احسن مطمئن ہوا تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں احسن کا دوست ساجد آیا اس نے میرا بغور جائزہ لیا اور سلام کر کے ہمیں اوپر لے آیا... اس گھر کا ماحول بڑا ہی پراسرار سا تھا اور اس بات کا احساس بھی ہو جاتا تھا کہ یہ ایک بے تکلف قسم کی رہائش گاہ ہے کیوں اس کا جواب دینا مشکل ہے جہاں صرف مردوں کے رہنے کی وجہ سے نفاست اور قرینہ مفقود تھا.. احسن نے مجھے منہ ہاتھ دھونے کو کہا اور پھر کھانے پینے کا بندوبست کرنے کا کہہ کر وہ دونوں باہر چلے گئے' اب اس گھر میں میں اکیلی تھی میں نے یوں ہی باہر کی طرف کھلنے والے دروازے کو چیک کیا تو وہ باہر سے بند تھا یعنی ان دونوں نے مجھ پہ اتنا اعتبار نہ کیا تھا کہ گھر کھلا چھوڑ کے چلے جاتے۔

ساجد مجھے احسن کے مقابلے میں زیادہ ہوشیار اور سمجھدار معلوم ہوا.. وہ احسن کی طرح حسین تو نہ تھا مگر مردوں میں جو ایک عجیب سی رعونت ہوتی ہے وہ ساجد میں بھی تھی وہ احسن کی طرح نرم طبیعت کا نہ تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم تینوں باتیں کرتے رہے مجھے ان دونوں نے ایسے لیا جیسے میں ان کی کوئی پرانی بے تکلف دوست ہوں ... مگر یہ بے تکلفی ہر تھوڑی دیر بعد ایک دبیز اور پراسرار خاموشی میں بدل جاتی تھی ایسا لگنے لگتا جیسے کمرے میں کوئی موجود ہی نہ ہو... احسن اور مجھ میں کوئی ایسا عہد و پیمان نہ ہوا تھا کہ اسے میں کسی امید سے جڑا ہوا رشتہ سمجھنا شروع کر دیتی... لیکن میری چھٹی حس کہتی تھی کہ آنیوالی رات میرے دامن میں اب ویسے ہی انگارے بھرنے والی ہے جیسے اب تک میرے وجود میں سلگتے رہے تھے' کیا دنیا میں عورت کا مرد کے ساتھ بس یہی ایک رشتہ ہے؟ میں خود ہی سوال کرتی اور خود ہی کبھی جواب دیتی اور کبھی نہ دیتی ...اور پھر پتا نہیں کیوں اور کس کام سے احسن کہیں باہر چلا گیا اب کمرے میں میں اور ساجد تھے...

''آپ آرام کرنا چاہیں تو کر سکتی ہیں، یہاں برابر میں ایک کمرا ہے' وہ میرا بیڈ روم ہے' آپ اس میں چلی جائیں۔''

ساجد کی بات سن کر میں چپ چاپ اٹھی اور اس بیڈ روم میں آ گئی... یہ ایک سادہ سا کمرا تھا جہاں ایک بیڈ پڑا ہوا تھا ساتھ ہی ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر ایک خوبصورت سا ایش ٹرے دھرا تھا ایک دیوار پر بڑا سا آئینہ فکس تھا اور... ایک کونے میں دیوار کے اندر بنی ہوئی ایک الماری تھی میں نے وہ الماری کھولی او یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ اس میں کتنے ہی کپڑوں کے سوٹ عورتوں کے تھے... کیا مطلب یہاں کوئی عورت بھی رہتی ہے؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا اور بے اختیار ہو کر میں ساجد کی طرف بڑھی تا کہ اس سے پوچھ سکوں کہ یہ کس کے کپڑے ہیں اور کیا عارضی طور پر میں یہ کپڑے استعمال کر سکتی ہوں...

کمرے کا دروازہ ایک تنگ سی راہداری میں کھلتا تھا اور اس کے ساتھ دوسرے سرے پر وہ دوسرا کمرا تھا جہاں کچھ دیر پہلے میں ساجد اور احسن کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی... ساجد اب بھی اکیلا تھا وہ نہایت پراسراریت سے سگریٹ پی رہا تھا میں نے دروازے پر دستک دی تو اس نے اندر سے ہی کہا۔

''آپ وہ کپڑے پہن سکتی ہیں...''

میں یہ سن کر واپس چلی آئی اور الماری میں سے ایک معمولی سا جوڑا نکال کر اٹیچ باتھ میں گئی، حسب توقع وہ مجھے کافی گندہ دکھائی دیا دل تو چاہا کہ ابھی کہ ابھی اس کی صفائی کر دوں کیوں کہ مجھے گندے باتھ روم بہت ہی وحشت زدہ کر دیتے تھے مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ میری زندگی ایک مستقل گٹر بننے والی تھی... جیسے تیسے میں نے کپڑے چینج کیے اور اس اکلوتے بیڈ پر آ کے لیٹ گئی سوچوں نے پھر سے مجھ پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ پتا نہیں اماں اور مدیحہ کیسے ہو نگے۔ اپنی بربادی کا سوچ کے پھر آنکھوں سے ساون بھادوں برسنے لگے اور میں اس انجان کمرے میں، اجنبی شہر میں میسر آئے ہوئے اس بستر کے تکیوں سے خوب لپٹ لپٹ کے روئی... جانے کب تک روتی رہی کچھ خبر نہ تھی مجھے سب سے زیادہ اپنے باپ کو یاد کر کر کے رونا آتا تھا، لوگوں سے سنا تھا کہ بیٹیوں سے بھلے ان کی مائیں کتنی بھی قریب ہوں، اندر باہر کا سب حال ماؤں کو ہی معلوم ہوتا ہے مگر اس رات پہلی بار مجھے یہ احساس کچوکا بن بن کے ٹیس پہنچاتا رہا کہ میں بھی اپنے ابو سے ہی دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرتی تھی اور سب بیٹیوں کی طرح... میرا باپ اگر مجھے سو بار بھی اپنی عزت اور مجبوریوں کی بھینٹ چڑھا دیتا تو میں چڑھ جاتی اور اف تک نہ کرتی بلکہ ساری عمر اس بات کو لے کر فخر کرتی کہ میں نے اپنے باپ کی عزت بچانے کو خود کو قربان کر دیا۔ جن سے ہم محبت کرتے ہیں ان کی خاطر قربانی دینا کیسی راحت ہے.. یہ میں نے اس کے باوجود جان لیا کہ میں تو وہ ابھاگن تھی جس نے اپنے باپ کی عزت کو سرے عام نیلام کر دیا تھا۔ اف میرے رب کہ تو میری ساری بربادی کے صلے میں بس یہ ایک میری بات مان سکتا کہ میرے باپ کو کبھی پتا نہ چلے کہ اس کی لاڈلی بیٹی پر دنیا نے ایک بھول کے بدلے میں کیسے کیسے ستم توڑے ہیں نہ جینے کی آرزو ہے نہ اپنوں سے ملنے کی تمنا جانے اس دنیا میں کب کس پر ایسے ظلم ٹوٹے ہوں گے ابا کی یاد آئی تو دل چاہا کہ خود کو اپنی ہی چھری سے اتنے زخم لگاؤں کہ میرے جسم کا کوئی حصہ زخمی ہونے سے باقی نہ بچے... بس روتی جاتی تھی اور بے بسی سے یوں تڑپتی جاتی تھی کہ کوئی احساس بھرا دل مجھے اس حال میں دیکھ لے تو سمجھو چلتے چلتے رک جائے... پھر پتا نہیں کب نیند آ گئی یاد نہیں اس قسم کے حالات میں کسی بے غیرت اور بے حس کو ہی نیند آ سکتی تھی اور میں جو یہ کہوں کہ میں بے حس یا بے غیرت تھی تو کوئی مانے یا نہ مانے یہ سراسر غلط ہوگا کیوں کہ میں اپنے دل کا حال خود جانتی تھی اور اس نیند کا اس کے علاوہ کوئی اور جواز نہیں کہ جب کوئی انسان ایسی حالت میں ہو جیسے کہ اس وقت میں تھی تو یہ قدرت کا بھید ہے کہ اگر مجھے نیند نہ آتی تو صدمے سے میری موت واقعہ ہو سکتی تھی اور قدرت مجھ جیسی نصیبوں جلی کو ابھی مزید زندہ رکھنا چاہتی تھی کیوں کہ میرے ذریعے اسے ایسی بھول اور غلطی کی طرف بڑھتی ہوئی عورتوں کو سبق دینا مقصود تھا اور ابھی شاید عبرت کی داستان مکمل نہ ہوئی تھی ورنہ آپ جو یوں اچانک اس اذیت بھری۔ کہانی کو سننے کے لیے مجھ سے آن ملے ہیں تو مجھے خود اسی سمے میں اندازہ ہوا کہ مجھ پر اتنے بے حساب ستم کیوں توڑے گئے' کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ مجھ سے میرے گناہ سے زیادہ حساب لیا گیا ہے سزا ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتی پر اب سوچتی ہوں کہ جو کہیں درمیان میں پھر سے ہری بھری ہو جاتی اور زندگی پھر سنور جاتی تو اس قسم کی بھول کرنے والی عورتوں کو یہ امید لگی رہتی کہ کبھی نہ کبھی ان کی تقدیر بھی ضرور بلقیس کی طرح بدلے گی اور آج مجھے احساس ہوا کہ ایسا ناقابل معافی جرم کرنے والی میری جیسی کسی بھی عورت کو یہ امید کبھی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ پھر سے سنور جائے گی، سمٹ جائے گی... سچ کہتی ہوں اچھا ہی ہے جو میں نہ سنوری... سنورنی بھی نہیں چاہیے... یہ جو میں نے کیا ایسا گناہ اور جرم ہے کہ اس کی جتنی بھی سزا ملے کم ہے سو پھر جوڑتی ہوں کہانی کا سرا وہیں سے

میں روتے روتے سوگئی تھی اور بے خیالی میں دروازہ بند کرنا بھی بھول گئی تھی جو میری طرح خالی اور فقیر کے کاسے کی طرح اجڑی ہوئی ہوں ان کو خیال رہ بھی کیسے سکتا ہے یہ تو باکرہ باعصمت اور شریف زادیوں کا کو زیب دیتا ہے ایک مجھ سی لٹی ہوئی ڈوھنڈار خالی پڑی عمارت میں سے کوئی کیا لوٹ لے جائے گا.. تھا ہی کیا میرے پاس... سو اس وقت بھی میری آنکھ نہ کھلی جب میرے اوپر احسن کا دوست ساجد اس حد تک جھک آیا کہ اس میں اور مجھ میں ہر قسم کا فاصلہ ختم ہو گیا مگر اس عجیب معمّے کو میں اس وقت قطعی حل نہ کر سکی کہ اس نے مال غنیمت وہ بھی یوں آسانی سے ہاتھ آنے والی شہ کو ہاتھ تک نہ لگایا اور میری آنکھ اس وقت کھلی جب وہ دونوں میرے قریب کھڑے خوب زور زور سے لڑ رہے تھے.. میں گہری نیند سے جاگی اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگی کہ آخر ماجرہ کیا ہے تب ساجد میرے قریب آکر بولا۔

''تمہیں میرا یقین نہیں ہے تو انھی سے پوچھ لو' میں نے ان کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

یا الٰہی! یہ دونوں مجھ پر لڑ رہے تھے..

''تم نے ضرور کوئی نشے کی چیز پلائی ہوگی اور اس بے چاری بے خبر کو پتا تک نہیں چلا ہوگا کہ اس کے ساتھ کیا ہوگیا ہے' میں تمہیں خوب اچھی طرح جانتا ہوں بہت ہی ندیدے اور وحشی ہو تم..'' احسن اس پر بری طرح ناراض ہو رہا تھا۔ کچھ دیر میں میرے حواس بحال ہوئے تو میری سمجھ میں سب کچھ آگیا میں نے احسن کو یقین دلایا کہ مجھے ساجد نے نہ ہی کچھ پلایا نہ ہی کوئی نازیبا حرکت کی...

''تو پھر یہ یہاں آیا کیوں تھا..؟''

''میں دیکھنے آیا تھا کہ یہ اگر جاگ گئی ہوں تو کچھ باتیں کرلوں میں بہت دیر سے اکیلا بور ہو رہا تھا۔''

''مگر میں نے تمہیں بلقیس پر جھکے ہوئے دیکھا تھا؟'' احسن بدستور غصے سے بولا۔

''پتا نہیں تم شاید یقین نہ کرو مگر میں بالکل سچ بول رہا ہوں مجھے لگا کہ یہ بہت دیر تک روتی رہی ہے تو میں بس یہ دیکھنے کو جھکا تھا کہ کہیں میں غلط تو نہیں سوچ رہا اسی وقت تم آگئے اور مجھے معلوم ہے تمہارے دل میں چور ہے تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے اسی لیے تم چوروں کی طرح داخل ہوئے گھر میں..''

''میں گھر میں اسی طرح داخل ہوا جیسے ہمیشہ داخل ہوتا ہوں تم کچھ زیادہ ہی بزی تھے..''

''اچھا چلو اب چھوڑو اس بات کو تم کھانا لے آئے؟'' ساجد نے پوچھا جس پر احسن نے اس طرح جواب دیا کہ اثبات میں جواب بھی دے دیا اور لفظ بھی کوئی ادا نہ کیا... وہ دونوں چیخ پکار کر کے اس کمرے سے چلے گئے جس میں اس وقت میں تھی اور میں دیر تک یہ سوچتی رہی کہ آخر یہ دونوں کیوں اور کس بات پہ لڑ رہے تھے۔ سوچوں میں عجب بھنور پڑتے رہے مگر میں یہ نہ جان سکی کہ یہ معاملہ ہے کیا؟ دونوں ہی معقول انسان تھے احسن دکھنے میں زیادہ اچھا تھا مگر جسمانی اعتبار سے ساجد بہتر تھا ساجد کی نیت اگر خراب نہ تھی تو وہ میرے کمرے میں کیوں آیا تھا اگر وہ سچ بول رہا تھا کہ بور ہونے کی وجہ سے محض باتیں کرنے آیا تھا تو پھر احسن جو یہ کہہ رہا تھا کہ اس نے ساجد کو میرے اوپر جھکے ہوئے دیکھا تھا تو پھر وہ کیا تھا؟ کیا ساجد کی نیت خراب تھی وہ مجھے اکیلی اور بے سہارا سمجھ کر اپنی ناپاک خواہشات کی تکمیل کا ارادہ باندھ رہا تھا اور عین موقع پر احسن نے آکر اس کے ارادوں کو پورا نہ ہونے دیا.. اگر یہ سچ بھی تھا تب بھی مجھے ایک بات اب بھی پریشان کر رہی تھی کہ آخر ساجد نے اپنی کسی بھی خواہش کی تکمیل کے لیے اتنا

بہت سا وقت کیوں ضائع کیا اور اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے ایسے وقت کا انتخاب کیوں کیا جس میں ہر لمحے احسن کے آنے کا خوف اور دھڑکا موجود تھا.. اگر یہ سب سچ تھا تو اس کا مطلب ہے احسن کو مجھ سے کسی ایسے رشتے نے باندھنا شروع کر دیا ہے جس میں اپنا پن ہوتا ہے، وہ محض اسی وجہ سے اپنے دوست سے بگڑ رہا تھا کہ وہ اس کمرے میں کیوں آیا جس میں میں اکیلی تھی.. ورنہ جس طرح ان حرام زادوں نے میری بوٹیاں نوچ نوچ کے ایک دوسرے کے ساتھ پورے سلوک سے میری روح تک کو چھلنی کیا تھا جو فیصل کے کچھ لگتے تھے ایسا ہی یہ دونوں بھی کر سکتے تھے اگر احسن کی وجہ سے ساجد ٹھٹھکا رہا تو پھر یہ دونوں ان دونوں خبیثوں کی طرح نہیں ہیں جنھوں نے میری روح پر اتنے زخم لگائے تھے کہ اب ساری عمر بھی ان پہ مرہم لگاتی رہوں تب بھی ان زخموں پر کھرنڈ نہیں آئے گا... میں اپنی سوچوں کے صحراؤں میں بھٹک رہی تھی کہ احسن مجھے کھانے کے لیے بلانے آگیا.. وہ جانے کے لیے مڑنے لگا تو میں نے اس سے کہا ٹھہرو... وہ رک گیا.. اور میری طرف دیکھنے لگا.. ''ایک بات پوچھوں' سچ سچ بتاؤ گے؟''

''ہاں' پوچھو...''

''تمہیں ساجد کا میرے کمرے میں آنا اتنا برا کیوں لگا؟''

''تو کیا تمہیں اچھا لگا ہے؟'' اس نے الٹا مجھ سے ہی سوال کر دیا۔

''یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' میں نے کہا...

''کیا سننا چاہتی ہو؟''

''پھر سوال..؟''

''تمہاری بات کا ابھی بس یہ جواب ہے کہ یہ اچھی بات نہیں ہے اس لیے مجھے برا لگا۔''

''اچھا!'' میں نے قدرے مایوسی سے کہا پتا نہیں کیوں میں اس وقت اس کے منہ سے یہ سننا چاہتی تھی کہ اسے اس لیے ساجد کا کمرے میں آنا اچھا نہیں لگا تھا کیوں کہ وہ مجھے پسند کرنے لگا ہے مگر اس نے ایسی کوئی بھی بات کہنے سے جیسے صاف انکار کر دیا تھا.. جس قسم کے حالات سے میں دوچار تھی' وہ میرے اندر عدم تحفظ کے ایک ایسے احساس کو جنم دے چکے تھے کہ مجھے اپنی زندگی چوراہے پہ رکھا کوئی ایسا زیور معلوم ہوتی تھی جسے کوئی بھی آسانی سے چرا سکتا تھا مگر میرے چاہنے سے کیا ہوتا تھا جب کوئی خود سے ہی اپنی محبت اور پسندیدگی کے بارے نہ بتانا چاہے تو میں کیا کر سکتی تھی عورت کی فطرت میں قدرت نے ایک ایسی جھجک رکھ چھوڑی ہے کہ وہ اگر طوائف بھی ہو تو اس طرح کے معاملوں میں مرد کے پہل کرنے کا انتظار کرتی ہے۔ اب میں بھی اسی طرح کی پہل کا انتظار کر رہی تھی مگر یہ کچھ ایسی عجیب اور نہ سمجھ میں آنے والی صورت حال تھی کہ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ان لوگوں کے دلوں میں کیا ہے اور میں یہاں محفوظ ہوں یا غیر محفوظ۔

احسن کے ساتھ میں نے ساجد کے مقابلے میں زیادہ وقت گذارا تھا جس کی وجہ سے میں اس سے زیادہ مانوس تھی مگر جب سے میں یہاں آئی تھی اور ساجد سے احسن کی ملاقات ہوئی تھی مجھے ان دونوں کے بیچ ایک عجیب سی پراسراریت محسوس ہوتی رہی تھی جس پر اس وقت میں نے کوئی توجہ نہ دی تھی کیوں کہ میں بہت تھکی ہوئی اور غموں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی... مزید کچھ کہنا سننا نہ چاہتی تھی بس اپنے آپ کے ساتھ کچھ وقت گذارنا چاہتی تھی.. لیکن میرے سوجانے کے بعد اور پھر اٹھنے کے بعد جو کچھ ہوا تھا اس نے میرے عدم تحفظ کے احساس کو مزید بھگاتا

شروع کر دیا تھا..اسی لیے میں نے یہ چاہا کہ احسن کو اگر میری محبت میں ساجد کا کمرے میں آنا برا لگا تھا تو وہ اس کا جلد سے جلد اظہار کر دے تا کہ میں بھی ساجد کے اور اپنے درمیان ایک حد قائم کر لوں اور خود کو احسن کی امانت سمجھ کر یہاں جو بھی وقت گزرے اسے گزاروں... مگر احسن نے عجیب ہی رویہ رکھا نہ ہاں کی اور نہ ہی نا کی' میں خجل سی ہو گئی..

''تم جتنے خوش مزاج ٹرین میں لگے تھے' اب اس طرح کے نہیں ہو' بدل گئے ہو...'' جب اس نے میری اس بات کا بھی کوئی جواب نہ دیا تو میں نے پھر سے کہا۔ ''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟'' وہ پھر بھی چپ رہا اور کھانے والے کمرے کی طرف جانے کے لیے چل پڑا...

''آخر تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے؟''

''کہہ دیا نہ ابھی نہیں یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔'' اس کا جواب سن کے میں ایک لمحے کو ٹھٹک کے رہ گئی نہ ہی یہ وہ احسن تھا نہ ہی اس کا لہجہ اور اس کی آواز...اب میں کسی قدر سہم گئی۔ ہر چند کہ میرے پاس موت سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ میں تو نکلی ہی مرنے کے لیے تھی مگر احسن کے ملنے کے بعد شاید کہیں بہت چپکے سے جینے کی آرزو سر اٹھانے لگی تھی..

☆☆

مجھے وہاں ان دونوں کے پاس رہتے ہوئے دو دن ہو چکے تھے اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر میری زندگی کا اب آگے کیا ہونے والا ہے میں کیا ساری زندگی اس طرح گذار سکتی ہوں؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا اور میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ میں احسن سے اکیلے میں تنہائی میں ملنے کا موقع ڈھونڈ رہی تھی جو کسی بھی طرح مجھے مل ہی نہیں رہا تھا کیوں کہ اس پہلے دن کے واقعہ کے بعد دونوں ہر وقت ساتھ رہتے تھے اور ساتھ ہی باہر جاتے تھے اور پھر بڑی مشکل سے مجھے اس وقت احسن سے بات کرنے کا موقع مل گیا جب ساجد باتھ روم میں گیا تھا مگر یہاں بھی اٹیچ باتھ تھا' میں کتنا بھی آہستہ کیوں نہ بولوں' آواز ساجد کے کانوں تک ضرور چلی جاتی تھی' میں نے احسن کو جیسے زبردستی کمرے سے باہر نکالا اور نسبتاً ایک چھوٹے کمرے میں لائی۔

''مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے؟''

''بولو کیا پوچھنا ہے؟''

''آخر میں کتنے دنوں تک اس طرح اس گھر میں بند پڑی رہوں گی؟''

''کیا چاہتی ہو؟ میں تمہیں کوئی بھگا کے نہیں لایا نہ ہی میں نے تم سے کوئی وعدہ کیا ہے' تم نے کہا تھا کہ مجھے اپنے ساتھ لے چلو اور میں لے آیا اب آرام سے رہو تمہیں پریشانی کیا ہے؟''

''تو کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے یہ محض میری غلط فہمی ہے؟'' اس نے آنکھوں کو اوپر کی طرف چڑھایا اور کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا ''تم نے یہ کیسے اندازہ لگایا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں میں نے ایسا کچھ کہا تو نہیں تھا..''

''تو وہ جو سارے راستے مجھے ایک ایسے خمار اور پیار بھری نظروں سے دیکھتے آئے تھے وہ سب کیا تھا ان نظروں کا مطلب کوئی بھی لڑکی یہی نکالے گی جو میں نے نکالا ہے۔''

''وہ اس وقت کے لیے تھا اور اس وقت کے لیے جو ٹھیک ہے میں وہ ہی کر رہا ہوں''

''میں سمجھی نہیں...''

''اتنی جلدی کیا ہے' سمجھ جاؤ گی''

یہ کہہ کر وہ جلدی سے واپس چلا گیا اور میں وہیں کھڑی یہ سوچتی رہ گئی کہ یا اللہ اب میں کس قسم کے لوگوں میں پھنس چکی ہوں۔ ہوا میں ڈولتے کاغذ اور پانی پہ تیرتی کاغذ کی کشتی کی طرح کتنی بے سمت اور بے قیمت ہو گئی تھی میں کس سے کہوں اور کیا کہوں بس رہ رہ کر امی کی یاد آتی تھی ایسی بے وطنی اور ترک وطن کسی نے کب کیا ہوگا ہر ایک گام پر ایسے لوگ مل رہے تھے جن کی نظر میں میری کوئی حیثیت ہی نہ تھی ...اب سے چند دن پہلے تک میں میاں کی چھتری کے سائے میں کیسی اتراتی پھرتی تھی جو چاہتی وہ کرتی جیسا چاہتی ویسا پہنتی یہ سب چند دنوں کی موج مستی کی سزا تھی جو ختم ہونے میں نہ آتی تھی.. میں نے کیا کچھ گنوا دیا ایسا سستا سودا بھلا کون بے وقوف ہوگا جو کرے گا!

احسن اور ساجد کے رویے میری سمجھ سے باہر ہوتے جا رہے تھے اس کے جانے کے بعد اکیلی کھڑی روتی رہی اور یادوں سے الجھتی رہی پھر رات پر سراتی ہوئی آ گئی میں تو یوں بھی ایک قسم کی قید میں تھی.. نیند اب رات گئے تک آتی نہ تھی اس لیے میں کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں جاگ رہی تھی کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے کے باہر دو سے زیادہ لوگ ہیں میں تھوڑا سا چونکی اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگی کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے دماغ چاہے جیسے ہی تجسس میں پڑا تھا مگر دل کہتا تھا کہ چپ چپاتے پڑی رہوں جانے کیا مصیبت آنے والی تھی احسن کے اجنبی ہوتے رویے سے مجھے خوف آنے لگا تھا پتا نہیں یہ سب کیا ماجرا تھا..

اچانک دروازے پر پراسراری دستک ہونے لگی اور میں جیسے پورے وجود سے کانپ کر رہ گئی۔ مرنے کے لیے ہر وقت کی تیار بلقیس پر اس وقت ایسا خوف طاری ہوا کے میں بستر میں سکڑی سمٹی تھر تھر کانپے جاتی تھی۔ دو سے تین بار دستک ہوئی پھر

چار اشعار

ہو رات کیسی ہی تاریک' سحر تو ہوگی ضرور
دِیا امید کا لیکن سدا جلا رکھنا
وہ دن جو ہم نے گزارے تھے اپنی جنت میں
کہ ان کی یاد سے دل کا چمن سجا رکھنا
وہ ملک میرا چمن' میری جنتِ ارضی
کہ اس چمن کو الٰہی! ہرا بھرا رکھنا
اے عازمینِ سفرِ حج تمہیں مبارک ہو
میرے وطن کو بھی تم شاملِ دُعا رکھنا

عندلیب سلمیٰ۔ کراچی

خاموشی چھا گئی...ایسا پرہول سناٹا جیسے راتوں میں گورستانوں میں ہوتا ہے کچھ دیر تک میں یوں ہی بیٹھی رہی اور یہ سوچتی رہی کہ یہ کیا جگہ ہے کیا یہ ان دونوں لڑکوں کا گھر ہے یا کچھ اور ہے...پھر اسی خوف کے عالم میں دھیرے سے اٹھی اور دبے پاؤں چلتی ہوئی اس کمرے تک آئی جہاں سے آوازوں اور سرگوشیوں کا ایک ہیبت ناک شور سا گونج رہا تھا... میں نے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے ایک ادھ کھلی کھڑکی سے اندر جھانک کے دیکھا دو نہیں وہ چار لوگ تھے جن میں سے دو تو مجھے آدھے ادھورے دکھنے کے باوجود میری پہچان میں آ گئے وہ احسن اور ساجد تھے مگر باقی دو لوگ میں نے کافی دیر تک کوشش کی مگر ان کی پشت میری طرف ہونے کی وجہ سے میں پہچان نہیں پا رہی تھی اور انھیں دیکھنے کی طلب ایسی تھی جیسے کئی میلوں سے کوئی بھوکا پیاسا انسان غذا کے لیے بلک رہا ہو پھر ان میں سے ایک نے سگریٹ اٹھانے کو خود کو ہلکا سا موڑا تھا تو میرے پیروں تلے زمین نکل گئی تھی۔

(باقی آئندہ)





خلیل جبار

محبوب قدموں میں

''کون بھائی...... میرا کوئی بھائی نہیں، تم میرے دشمن ہو، میں تمہیں ختم کر دوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اس کی جانب بڑھی۔ کامران تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ وہ اس کے پیچھے......

جادو ٹونے سے اپنی محبت حاصل کرنے والے ایک عاشقِ نادان کا عبرت اثر واقعہ



کامران نے گھر سے نکلنے سے پہلے الماری سے بوتل نکالنا چاہی تو وہ دھک سے رہ گیا' بوتل الماری میں موجود نہیں تھی۔ گھبراہٹ میں اس نے الماری کی درازوں' اندرونی خانوں تک کو کنگھال ڈالا لیکن بوتل کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بوتل کہاں گئی؟ وہ ایک باہر پھر اٹھا اور دل کی تسلی کے لیے الماری میں بوتل کو تلاش کرنے لگا لیکن بوتل الماری میں ہوتی تو نظر آتی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے وہ بوتل الماری میں ہی رکھی تھی اور اس کا ارادہ تھا کہ گھر سے نکلتے ہوئے بوتل لے جائے گا۔

فرزانہ سے اس کا دوپہر میں ملاقات کا پروگرام تھا۔ فرزانہ ایک پرائیویٹ اسکول میں ملازمت کرتی تھی۔ کامران کا ارادہ تھا کہ اسکول سے چھٹی ہونے پر اسے بہانے سے اپنے دوست ندیم کے اسکول لے جائے گا اور ندیم ان کے اسکول پہنچنے پر کولڈ ڈرنک کا آرڈر دے گا۔ اسکول کا ملازم بوتل لائے گا اور کامران کی دی ہوئی بوتل فرزانہ کے آگے رکھ دے گا اور فرزانہ کے بوتل پیتے ہی کامران کا کام ہو جائے گا۔

کامران اور فرزانہ کی دوستی موبائل کی مرہون منت تھی۔ ہفتوں ان کی بات چیت موبائل پر ہوتی رہی۔ ایک دن فرزانہ کی کال آنے پر کامران نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

''فرزانہ' ہماری دوستی کو کئی ہفتے ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک ہماری ملاقات نہیں ہو سکی ہے حالانکہ ہم ایک ہی شہر میں رہتے ہیں۔''

''ہاں' یہ تو ہے' ہم ایک ہی شہر میں رہتے ہیں اور ابھی تک موبائل پر ہی بات چیت چل رہی ہے۔'' فرزانہ نے کہا۔

''پھر کیا خیال ہے؟'' کامران نے پوچھا۔

''کس بارے میں؟'' فرزانہ چونکی۔

''ارے بھئی' ملاقات کرنے کے لیے؟''

''اوہ ہاں' واقعی ہماری ملاقات ہونا ضروری ہے۔ ہم دونوں کے خیالات اور عادتیں ایک جیسی ہیں پھر ہمیں ایک دوسرے کو دیکھنا چاہیے۔'' فرزانہ نے کہا۔

''ہو سکتا ہے' ہم دونوں ایک دوسرے کو اتنے بھا جائیں کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں۔'' کامران نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ چونکی۔

''کیوں نہیں ہو سکتا' جب لڑکا' لڑکی راضی پھر کیا کرے گا قاضی۔'' کامران نے قہقہہ لگایا۔

''کامران' شادی کے لیے والدین کا راضی ہونا بھی ضروری ہے ورنہ کس طرح شادی ہو سکتی ہے؟'' فرزانہ نے کہا۔

''کس دور کی بات کر رہی ہو' آج کل اخبار اور میڈیا میں پریمی جوڑوں کے بارے میں جو دکھایا جا رہا ہے' وہ تمہاری نظروں سے نہیں گزرا؟ جب والدین راضی نہ ہوں تو کورٹ میرج کر لینی چاہیے۔'' کامران جوش میں کہتا چلا گیا۔

''ہاں' ان دنوں یہ وبا چل رہی ہے' لڑکے اور لڑکیاں والدین کی مرضی کے خلاف شادی کر لیتے ہیں لیکن ان کا انجام کیا ہوتا ہے' دردر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور حکومت سے قانونی تحفظ فراہم کرنے کی التجا کرتے ہیں کہ جان کا خطرہ ہے۔'' فرزانہ نے کہا۔

''ارے' ارے' فرزانہ' تم تو بہت ہی جذباتی ہوتی جا رہی ہو' میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہم بھی ایسا قدم اٹھائیں جس سے ہمارے والدین کی بدنامی ہو اور خود بھی جان بچانے کو بھاگتے پھریں؟'' کامران نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ ''تم بے فکر رہو'

ہم نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا تو کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے جس پر ہمیں پچھتانا پڑے۔''

''میں بھی یہی چاہتی ہوں' ہم جذبات میں آ کر کوئی غلط فیصلہ نہ کریں۔'' فرزانہ نے کہا۔

''میں رشتے کی بات کرنے کے لیے اپنی امی کو تمہارے گھر بھیجوں گا' یہ تم سے میرا وعدہ ہے۔''

''ایسا ہی ہونا چاہیے' والدین کی رضامندی سے ہمیں حقیقی خوشیاں ملیں گی۔'' فرزانہ نے کہا۔

''پھر کب ملاقات کا ارادہ ہے؟'' کامران نے کہا۔

''میرے اسکول کا تمہیں پتا ہی ہے' ایسا کرو' چھٹی کے وقت آ جاؤ' ہم وہاں کسی بھی ریسٹوران میں مل لیں گے۔''

''ٹھیک ہے' میں کل آ رہا ہوں۔'' کامران نے کہا۔

دوسرے دن کامران اسکول پہنچ گیا اور موبائل پر کال کر کے فرزانہ کو بلا لیا۔ فرزانہ اس کی توقع سے بڑھ کر خوبصورت تھی۔ چند لمحے تک وہ ایک ٹک اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے قطعی امید نہیں تھی کہ فرزانہ اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے۔ کامران کے مسلسل گھورنے پر فرزانہ جھینپتے ہوئے بولی۔

''کیا ارادے ہیں' یہیں کھڑے رہنا ہے یا کہیں اور بھی چلنا ہے؟''

''اوہ...... سوری...... آؤ چلتے ہیں۔'' کامران نے قدم آگے کو بڑھائے۔ اس کا رخ ایک فیملی ریسٹوران کی طرف تھا۔

''میں کیسی لگی تمہیں؟'' فرزانہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کامران کو دیکھا۔

''آ...... ہاں...... میری توقع سے بڑھ کر خوبصورت ہو تم لیکن کیا میں تمہیں پسند آیا ہوں؟'' کامران نے کہا۔

''ہاں' مناسب ہو۔'' فرزانہ نے بے دلی سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے' میں تم کو پسند نہیں آیا؟'' کامران نے اداسی سے کہا۔

''تم مجھے پسند آئے ہو جبھی یہاں تک آ گئی ہوں۔'' فرزانہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''تم بھی ناں...... اچھا مذاق کر لیتی ہو۔'' کامران کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ' کیا چلے گا' کولڈ ڈرنک؟'' کامران نے پوچھا۔

''تمہیں کیسے معلوم کہ میں کولڈ ڈرنک پیوں گی؟'' فرزانہ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''خواتین زیادہ تر کولڈ ڈرنک پیتی ہیں اس لیے میں نے سوچا......''

''اس کا مطلب ہے' تمہیں خواتین کا بہت تجربہ ہے۔'' فرزانہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''نن...... نن...... نہیں' مجھے...... مجھے کیسے ہوگا تجربہ' میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔'' کامران اس کے حسن سے بہت مرعوب ہو چکا تھا اس لیے بار بار جھینپ اور شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فرزانہ پر اس کی شخصیت کا غلط تاثر پڑے۔

''میں تو مذاق کر رہی تھی' تم سنجیدہ کیوں ہو رہے ہو؟'' فرزانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا' تمہارے لیے کولڈ ڈرنک منگاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے کامران نے بیرے کو بلا کر دو کولڈ ڈرنک کا آرڈر دے دیا۔

اس پہلی ملاقات میں وہ فرزانہ کو دل دے بیٹھا تھا اور واپسی پر اپنے دل میں تہیہ کر چکا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے' وہ ضرور فرزانہ سے ہی شادی کرے گا۔

اب کامران اور فرزانہ کی اکثر ملاقاتیں ہونے لگی تھیں۔ وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا اور ایک دن سے زیادہ فرزانہ سے دور نہیں رہ سکتا تھا اس لیے ایک دن کے وقفے سے ان کی ملاقات ہوتی تھی۔ کامران کے گھر والے خاندان میں اس کی شادی کرنا چاہتے تھے لیکن وہ ڈٹ گیا کہ فرزانہ ہی سے شادی کرے گا' مجبوراً والدین کو فرزانہ کے گھر رشتے کے لیے جانا پڑا لیکن انہیں مایوس لوٹنا پڑا۔ فرزانہ کے والدین اپنی برادری میں ہی بیٹی کا رشتہ کرنا چاہتے تھے۔ کامران کا خیال تھا کہ وہ ایک اچھی جاب پر فائز ہے اس لیے فرزانہ کے گھر والے اس رشتے پر فوری راضی ہو جائیں گے۔ اس انکار پر وہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے فرزانہ سے کیوں ملاقات کی؟ نہ وہ اس سے ملتا نہ ہی اس کے عشق میں گرفتار ہوتا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی اچھی جاب بھی اسے فرزانہ دلانے سے قاصر تھی۔ اس دن اس نے فرزانہ سے موبائل پر رابطہ کیا۔

''فرزانہ' میں نے سوچ لیا ہے' چاہے کچھ بھی ہو جائے' میری شادی تم سے ہی ہوگی۔''

''کامران' یہ ممکن نہیں ہے۔ میرے والد نے سختی سے اس رشتے کی مخالفت کر دی ہے۔''

''کیوں......؟ آخر کیوں......؟ کیا میں اپاہج ہوں' بے روزگار ہوں' کیا کمی ہے مجھ میں؟'' کامران پھٹ پڑا۔

''کامران' سمجھنے کی کوشش کرو' ہمارے یہاں برادری سے باہر رشتے نہیں کیے جاتے۔ مجھے ابو سے امید تھی کہ شاید وہ اس رسم کو توڑ دیں گے۔ وہ مجھے بہت چاہتے ہیں لیکن ان کے انکار سے مجھے بھی بہت شدید دھچکہ لگا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے غصے میں آ کر ایسا کیا ہو' میں پوری کوشش کر رہی ہوں کہ انہیں اس رشتے پر راضی کر لوں۔'' فرزانہ نے کہا۔

''فرزانہ' تم تیار ہو جاؤ' ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں' بعد میں جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔'' کامران نے کہا۔

''کامران' شادی بیاہ گڈے گڑیا کا کھیل نہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میں ابو کو راضی کر لوں گی لیکن کچھ وقت لگے گا۔ وہ مان جائیں گے۔'' فرزانہ نے کامران کو سمجھانے کی کوشش کی۔

کامران نے غصے میں موبائل کو دیوار پر دے مارا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا جبکہ موبائل کئی حصوں میں ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ فرزانہ اس کے حواس پر یوں چھا گئی تھی کہ اسے پانے کے لیے وہ ہر جائز و ناجائز کام کرنے کو تیار تھا۔ چنانچہ دوستوں کے کہنے پر اس نے عملیات کی کتابوں سے مختلف جادو ٹونے اپنے طور پر پڑھ کر کرنا شروع کر دیئے تھے لیکن کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔

اُس روز کامران دفتر سے جلدی اٹھ گیا تھا۔ وہ بازار سے پیدل گزر رہا تھا کہ بے اختیار اس کی نظر دیوار پر لکھی اس عبارت پر پڑی۔

'محبوب آپ کے قدموں میں' ہر تمنا پوری ہوگی' پروفیسر غیاث الدین کے پاس تمام مسائل کا حل موجود ہے۔'

کامران اس طرح کے اشتہاروں پر کبھی توجہ نہیں دیتا تھا اور انہیں فراڈ سمجھتا تھا لیکن آج یہ اشتہار دیکھ کر اس کے دل کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ خوشی سے ناچنا شروع کر دے۔ اسے نہ جانے کیوں یقین ہو چلا تھا کہ اب فرزانہ کو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا' فرزانہ اس کی ہو کر رہے گی۔ کامران نے اشتہار پر درج موبائل نمبر پر رابطہ

کیا اور پروفیسر غیاث الدین سے ملاقات کا وقت طے کر کے وقت مقررہ پر اس کے پاس پہنچ گیا۔

پروفیسر غیاث الدین ایک بھاری بھرکم شخص تھا' اس نے پہلی ملاقات میں کامران کو اپنا گرویدہ بنالیا اور وہ آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کرنے لگا تھا۔ پروفیسر غیاث وقتاً فوقتاً ٹھیک ٹھاک رقم بٹورنے لگا اور کامران اسے رقم دیتا رہا مگر اچھی خاصی رقم خرچ کرنے پر بھی جب اس کا کام نہیں بنا تو وہ اس روز غصے میں بھر کر پروفیسر غیاث الدین کے پاس پہنچا۔ وہ کامران کا چہرہ دیکھ کر معاملہ بھانپ گیا' اس سے پہلے کامران لڑمرنے کو تیار ہوتا' پروفیسر غیاث الدین نے اس سے کہا۔

''میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا' سمجھ لو تمہارا کام ہو گیا ہے۔''

''کام ہو گیا' کیا واقعی؟'' کامران حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں بولا۔

''ہاں' تم کوئی بھی کولڈ ڈرنک کی بوتل لے آؤ' میں اس پر ایک عمل کر کے دے دیتا ہوں' تمہیں کسی طرح وہ بوتل فرزانہ کو پلانی ہے۔ بوتل پی کر فرزانہ وہی کرے گی جو تم اسے کہو گے۔''

''کیا واقعی' ایسا ممکن ہے؟'' کامران کو یقین نہیں آرہا تھا کہ منزل اس طرح قریب آجائے گی۔

''ایک بات کا خیال رہے کہ وہ شربت صرف فرزانہ کو ہی پلانا ہے' کسی اور کو نہیں ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔''

''کک...... کک...... کیسی گڑبڑ؟'' وہ چونکا۔

''میں نے ایک ایسا عمل کیا ہے کہ اس عمل کی بدولت ایک بدروح میرے قبضے میں آگئی ہے۔ فرزانہ جب اس شربت کو پیے گی تو وہ بدروح اس کے ذہن پر قبضہ کر لے گی اور جو تم کہو گے' وہی کرے گی لیکن اگر کسی اور نے بوتل پی لی تو وہ بدروح غصے میں کسی قسم کا نقصان پہنچا سکتی ہے اس لیے اچھی طرح دھیان سے کام ہونا چاہیے۔'' پروفیسر غیاث الدین نے کہا۔

''بابا...... فکر ہی نہیں کرو' جیسا کہو گے' ویسا ہی ہو گا۔'' کامران نے خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے کہا۔

پروفیسر غیاث نے کولڈ ڈرنک کی بوتل پر دم کر کے بوتل کا ڈھکن دوبارہ سے لگا دیا۔ کامران وہ بوتل لے کر گھر چلا گیا اور بوتل الماری میں رکھ دی تاکہ دوسرے دن اس پر عمل ہو سکے۔ کامران نے اپنے دوست ندیم کو بھی اس منصوبے میں شامل کر لیا تھا۔ وہ اس کا ساتھ دینے کو تیار تھا۔

آج اسے فرزانہ کو اسکول چھٹی کے بعد ندیم کے اسکول لے جانا تھا لیکن جو بوتل پلانی تھی' وہی غائب تھی۔ کامران نے کمرے میں بھی تلاش کی لیکن بوتل ہوتی تو ملتی۔ اسے یہ سوچ کر بڑی گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ کہیں گھر کے کسی فرد نے بوتل نہ پی لی ہو۔ وہ اپنا شک دور کرنے کو اپنے کمرے سے باہر آیا' صحن میں میمونہ بیٹھی تھی اور خالی بوتل اس کے ہاتھ میں تھی۔

''میمونہ...... یہ بوتل......'' کامران نے کہنا چاہا۔

''بھائی جان...... طبیعت گھبرا رہی تھی اس لیے میں نے یہ بوتل پی لی۔'' میمونہ نے لاپروائی سے کہا۔

''یہ بوتل میں نے الماری میں رکھی تھی پھر یہ تمہیں کیسے ملی؟''

''میں کمرے کی صفائی کر رہی تھی' دل میں آئی کہ الماری کی بھی صفائی کر لوں۔ صفائی کرتے ہوئے بوتل نظر آئی۔ وہ میں نے فریج میں رکھ دی تھی۔ ابھی گھبراہٹ سی ہوئی تو بے اختیار مجھے یاد آیا کہ میں نے فریج میں بوتل رکھی تھی اس لیے نکال کر پی لی۔'' میمونہ نے بتایا۔

''تمہیں یہ بوتل نہیں پینی چاہیے تھی۔'' کامران نے بے بسی سے کہا۔

''کیوں' کیا یہ کوئی خاص بوتل ہے جو مجھے نہیں پینا چاہیے تھی؟'' میمونہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں' یہی سمجھ لو خاص بوتل تھی جو کسی اور کو دینی تھی۔'' کامران نے افسردہ ہوتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو یہ عام سی بوتل ہی لگی' اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔''

''تم نہیں سمجھو گی۔'' یہ کہتے ہوئے کامران باہر نکل گیا۔ اس کا رخ پروفیسر غیاث الدین کے آستانے کی طرف تھا۔ پروفیسر غیاث اسے اچانک دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''کامران میاں...... خیریت ہے نا' اتنی صبح صبح کیسے؟''

''خیریت نہیں ہے' آپ نے جو بوتل دی تھی' وہ میری بہن نے پی لی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اب کیا ہو گا؟'' کامران نے کہا۔

''یہ بہت برا ہوا' تمہیں بوتل کا خیال رکھنا چاہیے تھا' یہ سب تمہاری لاپروائی کے نتیجے میں ہوا ہے۔'' پروفیسر غیاث نے غصے سے کہا۔

''کچھ کریں ورنہ...... ورنہ...... نہ جانے میری بہن کے ساتھ کیا ہو جائے......'' کامران فکرمندی سے بولا۔

''ابھی تم جاؤ اور دیکھو کہ تمہاری بہن کیا کرتی ہے؟ اگر کوئی ایسی ویسی حرکت کرے تو مجھے آکر بتاؤ پھر اس کا علاج ہو گا۔'' پروفیسر غیاث نے فکرمندی سے کہا۔

کامران' پروفیسر غیاث کے آستانے سے چلا آیا اور کمرے میں آکر خاموشی سے لیٹ گیا۔ اس کی

پیار کی باتیں

پھر انہی دوشیزہ دلدار کی باتیں کریں
راشدہ کے صادقہ کے پیار کی باتیں کریں

نفرتیں جو کاشت کرتے ہیں، مبارک ہوں انہیں
ہم یہاں پر چاہتوں کی پیار کی باتیں کریں

اب پپیہا ہے نہ کوئل ہے نہ بلبل ہے یہاں
پھر بھی دل میں ہے، گل و گلزار کی باتیں کریں

شہر میں ہر سمت سناٹا ہے جاری موت کا
ایسے سناٹے میں تیرے پیار کی باتیں کریں

لوٹ کر آجائیں شاید پھر سنہرے رات دن
راشدہ کے حسنِ نغمہ بار کی باتیں کریں

شاید ہلکی اس سے ہو جائے مرے دل کی کسک
صادقہ کے عشق دل آزار کی باتیں کریں

ڈوبتا جاتا ہے میرا دل نہ جانے کیوں فہیم
دوستوں کی ہمدموں کی ہار باتیں کریں



محمد فہیم

سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟

رات میں جب اس کی آنکھ لگی تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کا گلہ دبا رہا ہے۔ اسے اپنا سانس بند ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ گلہ دبانے والے کو دیکھ کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس کی اپنی بہن میمونہ اس کا گلہ دبا رہی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ انتہائی ڈراؤنا لگ رہا تھا‘ بال بکھرے ہوئے تھے‘ آنکھیں باہر کو ابلی پڑ رہی تھیں‘ زبان بھی منہ سے باہر نکلی ہوئی تھی اور اس حد تک نکلی ہوئی تھی کہ اب گری کہ تب گری......

’’میں تیرا خون پی جاؤں گی......‘‘ وہ غراتے ہوئے بولی۔ اس کی آواز میں بھاری پن تھا۔

’’مم......مم...... مجھے چھوڑ دو میمونہ......‘‘ کامران نے ایک جھٹکے سے اپنا گلہ چھڑایا اور اچھل کر دور کھڑا ہوگیا۔ ’’میمونہ...... تمہیں کیا ہوگیا ہے‘ تم کیوں اپنے بھائی کی جان کی دشمن ہوئی جا رہی ہو؟‘‘

’’کون بھائی...... میرا کوئی بھائی نہیں‘ تم میرے دشمن ہو اور میں تمہیں ختم کیے بغیر نہیں رہ سکتی......‘‘ یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر وہ اس کی جانب بڑھی۔

کامران تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگی۔ وہ مسلسل چیخ رہی تھی۔

’’میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی......‘‘

شور شرابہ ہونے سے گھر کے سب افراد جاگ گئے تھے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے میمونہ کو قابو کیا۔ امی‘ ابو اور گھر کے سب ہی افراد حیرت زدہ تھے کہ میمونہ کو اچانک کیا ہوگیا ہے؟ کامران کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟ وہ سوتے میں اسے گلا دبا کر ہلاک کرسکتی تھی۔ میمونہ میں پراسرار طور پر بہت زیادہ طاقت آ گئی تھی۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

’’میمونہ...... کیا بات ہے‘ ہمیں بتاؤ‘ تم کیوں کامران کو تنگ کر رہی ہو؟‘‘ ابو نے پوچھا۔

’’میں اس کو نہیں چھوڑوں گی...... اس نے اچھا نہیں کیا ہے......‘‘ میمونہ نے جیسے پھنکارتے ہوئے کہا۔

’’کیا ہوا ہے‘ کچھ ہمیں بھی بتاؤ؟‘‘ امی جان نے پوچھا۔

’’میں ایک بری آتما ہوں اور کئی انسانوں کا خون پی کر انہیں ہلاک کر چکی ہوں۔ ایک بزرگ نے میری بے چین آتما کو قرار دے کر سکون کی نیند سلا دیا تھا لیکن اس نے ایک کالے علم کرنے والے کے ذریعے مجھے قابو کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا عمل غلط ہوگیا ہے اور اب جب تک میں کامران کا خون نہ پی لوں‘ میری آتما کو قرار نہیں آئے گا۔‘‘ میمونہ نے کہا۔

امی اور ابو کا چہرہ فق ہوگیا اور وہ حیرت سے کامران کی طرف دیکھنے لگے۔ کامران نے شرمندگی سے اپنی گردن جھکالی۔ اس بدروح نے اس کا راز فاش کردیا تھا۔ چھوٹے بہن بھائی بھی اپنے شرمندہ بھائی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

صبح ہونے پر کامران سب سے پہلے پروفیسر غیاث کے آستانے پر پہنچا۔ وہ کامران کے چہرے کی بدلی رنگت دیکھ کر سمجھ گیا۔

’’لگتا ہے‘ معاملہ خراب ہے‘ رات کو کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے؟‘‘

’’ہاں‘ رات میمونہ نے میرا گلہ دبا کر مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی اور اس نے دھمکی دی ہے‘ میرا خون پینے سے اسے سکون نصیب ہوگا......‘‘ کامران نے بتایا۔

’’مجھے اس کا اندازہ تھا‘ بری آتما پر کیا ہوا عمل غلط ہوجائے تو عامل یا کام کروانے والے کو وہ بری آتما ہلاک کیے بغیر نہیں چھوڑتی۔ فی الحال میں یہ

تعویذ دے رہا ہوں‘ اسے اپنے گلے میں ڈال لینا‘ یہ تعویذ جب تک تمہارے گلے میں ہوگا‘ وہ تم پر حملہ نہیں کرسکے گی۔‘‘ پروفیسر غیاث نے ایک تعویذ دیتے ہوئے کہا۔

کامران نے گھر آ کر وہ تعویذ پہن لیا۔ میمونہ جیسے ہی اس کے سامنے آئی‘ وہ غصے سے کامران کو دیکھنے لگی۔ وہ اس پر حملہ کرنا چاہ رہی تھی لیکن کوئی غیبی طاقت اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔

میمونہ غصے سے بولی۔ ’’تو کیا سمجھتا ہے‘ بچ جائے گا......؟ میں تجھے نہیں چھوڑوں گی۔‘‘

’’وہ وقت کبھی نہیں آئے گا‘ پروفیسر غیاث تیرا کام تمام کردیں گے......‘‘ کامران نے بھی غصے سے کہا۔

’’ہاہاہا...... یہ وقت بتائے گا کہ کون کس کو شکست دیتا ہے......‘‘ میمونہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور پھر گھر کا سامان اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگی۔ شور کی آواز پر گھر میں موجود سب کمرے میں آگئے اور بڑی مشکل سے میمونہ کو قابو کیا گیا۔

یہ روز کا معمول بن گیا تھا‘ میمونہ جب کامران کو دیکھتی‘ غصے سے بے قابو ہوجاتی اور گھر میں توڑ پھوڑ مچا دیتی۔ ایسے میں کامران خود کو بہت ہی بے بس محسوس کرنے لگتا تھا۔ پروفیسر غیاث اپنے طور پر میمونہ کے علاج کے لیے گھر میں پانی چھڑکنے کو دیتا‘ کبھی تعویذ دیتا جسے پانی میں گھول کر گھر کے مختلف حصوں میں وہ پانی چھڑکنا ہوتا تھا۔

ابو بھی اپنے ایک جاننے والے بزرگ سے میمونہ کا علاج کرا رہے تھے مگر اس کی حالت میں ذرہ برابر افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ امی‘ ابو نے کامران سے کوئی شکایت نہیں کی تھی کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس بات نے کامران کو اور شرمندہ کیا ہوا تھا کہ وہ اس سے کچھ تو گلہ کرتے کہ بیٹے‘ تم نے ایسا کیوں کیا‘ ایسی کیا مجبوری تھی جو اپنی بہن کو مشکل میں ڈال دیا؟ لیکن انہوں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ وہ خاموشی سے میمونہ کا روحانی علاج کرا رہے تھے۔ کامران اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ موبائل کی بیل بج اٹھی۔ کال فرزانہ کی تھی۔

’’ہیلو......‘‘ کامران نے بے دلی سے کہا۔

’’کامران‘ خبر ایسی ہے کہ سن کر تم اچھل پڑو گے۔‘‘ فرزانہ نے سسپنس پیدا کرتے ہوئے کہا۔

’’کیا بات ہے؟‘‘ کامران نے بے زاری سے کہا۔

’’امی‘ ابو ہماری شادی کے لیے تیار ہوگئے ہیں۔ تم پہلی فرصت میں اپنے والدین کو رشتے کے لیے بھیج دو۔‘‘ فرزانہ نے چہکتے ہوئے بتایا۔

’’فرزانہ‘ تمہیں پتا ہی ہے کہ امی‘ ابو‘ میمونہ کے مسئلے پر کتنا ڈسٹرب ہیں۔ میں انہیں کیسے کہہ دوں کہ میری شادی کے لیے جاؤ؟‘‘ کامران نے کہا۔

’’یہ تو ہے لیکن یہ سب تمہاری جلد بازی کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ سب ٹھیک ہوجائے گا لیکن تم سے صبر نہیں ہوسکا اور عاملوں کے چکر میں پڑ گئے؟‘‘ فرزانہ نے کہا۔

’’میں بھی کیا کرتا‘ میرے دماغ پر تم سے شادی کرنے کا بھوت سوار تھا اس لیے یہ حماقت کر بیٹھا۔ مجھے زیادہ پریشانی اس بات کی ہے کہ امی‘ ابو مجھے کچھ بھی تو نہیں کہہ رہے‘ غصہ کریں‘ ناراضگی کا اظہار کریں۔‘‘ کامران نے کہا۔

میمونہ کے روحانی علاج کے لیے مختلف عامل گھر آ رہے تھے لیکن جب وہ عامل اپنا عمل شروع کرتے تو میمونہ بے قابو ہوجاتی اور خود کو چھڑا کر عامل کو مار کر بھگا دیتی۔ اس روز میمونہ کو دیکھنے شاہ جی نامی عامل آئے تھے۔ کامران بھی گھر میں موجود تھا۔ شاہ جی

کے چہرے پر روحانیت بہت تھی۔ انہیں دیکھتے ہی کامران بھی متاثر ہو گیا تھا۔ میمونہ کو دیکھ کر وہ کچھ دیر تک خاموش رہے۔ اس دوران میمونہ غصے سے شاہ جی کو گھور رہی تھی۔

"بہت ہی خبیث آتما ہے...... لیکن اس کا علاج ہو جائے گا۔ یہ ہمیشہ کے لیے جان چھوڑ دے گی۔" شاہ جی سوچتے ہوئے بولے۔

"اگر ایسا ہو جائے تو میں آپ کی احسان مند رہوں گی۔" امی جان نے کہا۔

"لیکن علاج کے لیے تم لوگوں کو تھوڑی محنت کرنا پڑے گی۔"

"ہاں، ہاں، ہم سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔" ابا جان نے کہا۔

"مسئلہ یہ ہے کہ یہ خبیث روح اپنے سامنے کسی عامل کو برداشت نہیں کر سکتی اور عمل کے دوران عامل کو نقصان پہنچا سکتی ہے مگر یہ بھی ضروری ہے کہ عامل کے عمل کے الفاظ اس کے کانوں تک پہنچیں تاکہ یہ خبیث، بچی کی جان چھوڑ دے۔ اس صورت میں ایک ہی حل ہے۔"

"وہ کیا؟" کامران نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں تین وقت صبح، دوپہر اور شام کو موبائل سے کال کر کے کچھ پڑھوں گا۔ تمہیں یہ کرنا ہوگا کہ کسی طرح میمونہ کو قابو کر کے موبائل اس کے کان پر لگانا ہوگا۔ میمونہ پر جب بے ہوشی سی طاری ہو جائے، اس وقت موبائل کان سے ہٹا دینا۔ یہ عمل ایک ہفتے تک چلے گا۔ ایک ہفتے بعد میں تمہیں ایک گڑیا دوں گا جس کے جسم میں سوئیاں چبھی ہوں گی، وہ گڑیا قبرستان میں دفن کر کے آنا ہو گی پھر ہمیشہ کے لیے میمونہ کی بری آتما سے جان چھوٹ جائے گی......" شاہ جی نے کہا۔

"جیسا آپ کہیں گے، ہم ایسا ہی کریں گے۔" ابو نے کہا۔

"جب میں موبائل پر پڑھائی کروں گا، اس وقت بری آتما پوری کوشش کرے گی، کسی طرح موبائل کان سے ہٹا دے، وہ موبائل کو کان سے پرے کرنے کے لیے پورا زور لگائے گی لیکن خبردار، موبائل اس کے کان سے تب تک نہیں ہٹنا چاہیے جب تک یہ بے ہوش نہ ہو جائے۔" شاہ جی نے کہا۔

میمونہ کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ شاہ جی پر حملہ کر دیتی۔ وہ غصے سے شاہ جی کو دیکھے جا رہی تھی۔ شاہ جی کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے اور تاکید کر گئے تھے کہ ان کی ہدایت پر سختی سے عمل ہونا چاہیے۔

شاہ جی جب بھی موبائل پر پڑھائی کرتے تو میمونہ پوری کوشش کرتی تھی کہ کسی طرح گھر والوں سے خود کو چھڑائے اور موبائل کو دور پھینک دے لیکن گھر والے اسے اتنا مضبوطی سے قابو کرتے کہ وہ کوشش کے باوجود خود کو ان کی گرفت سے چھڑا نہیں سکتی تھی۔ یہ عمل پورے ایک ہفتے چلتا رہا، ایک ہفتہ بعد شاہ جی نے گڑیا بھی دے دی جس کے جسم میں سوئیاں چبھی ہوئی تھیں۔ یہ کام کامران کو سرانجام دینا تھا۔ گڑیا کو قبرستان میں دفن کرتے ہوئے وہ بہت خوف زدہ تھا لیکن اس نے یہ کام کر دیا۔ گڑیا کے قبرستان میں دفن ہو جانے پر میمونہ بالکل ٹھیک ہو گئی تھی۔ گھر والے خوش ہو گئے تھے۔ کامران بھی مطمئن تھا کہ میمونہ کی جان اس بدروح سے چھوٹ گئی تھی۔ اب فرزانہ سے اس کی شادی ہو جائے گی۔

چند روز بعد کامران اور فرزانہ رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ کامران کو زندگی کا بہت بڑا سبق ملا تھا۔ اس کی جلد بازی نے پورے گھر کو پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اب میمونہ کی بھی شادی ہو چکی ہے۔ آج بھی جب کامران کو یہ واقعہ یاد آتا ہے، اسے جھرجھری سی آ جاتی ہے۔

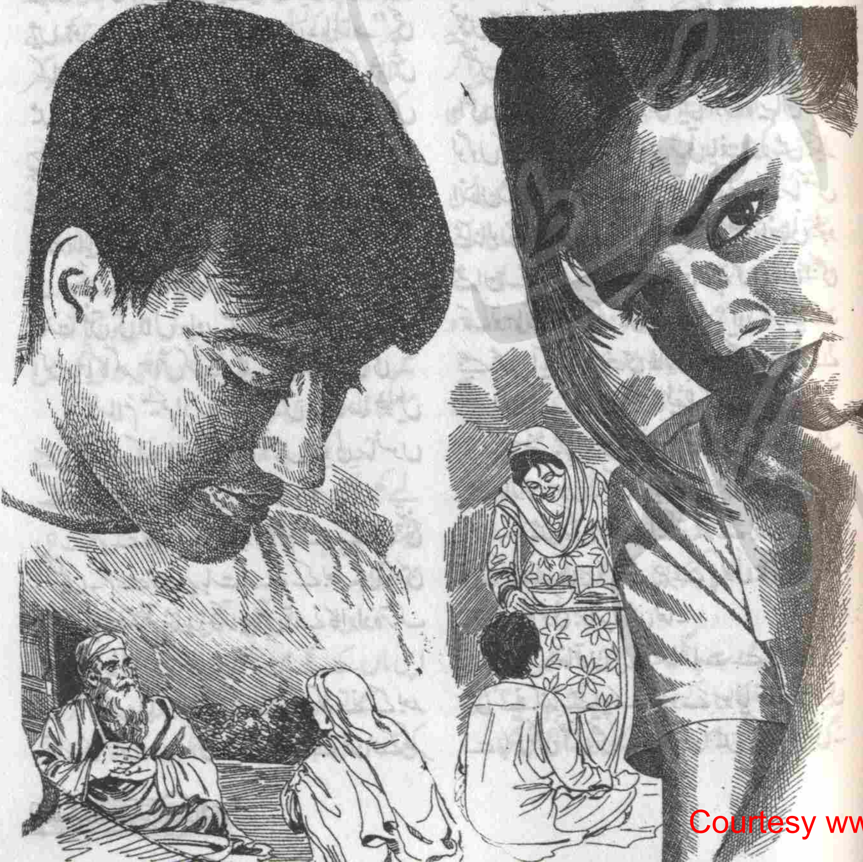
* *

ارم زہرا

کیا یہ حقیقت ہے؟

خود میری اپنی حالت ایسی ہو چکی تھی جیسے کاٹو تو لہو نہیں۔ کچھ دیر پہلے والا منظر میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ کیا واقعی وہ سہیل کی روح تھی؟ میں جو آسیب، بھوت وغیرہ کی قائل نہیں تھی، اچانک ہی اس......

شہر کے حساس ترین علاقے کٹی پہاڑی سے جڑی ایک پر اسرار کہانی



اورنگی ٹاؤن کا مشہورِ زمانہ علاقہ کٹی پہاڑی اُس مقام کا نام سنتے ہی کراچی کے لوگوں کے رونگھٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جبکہ ملک بھر کے لوگوں کے چہروں پر تشویش نمایاں ہوجاتی ہے۔ایسا کیوں ہے؟ کیا کٹی پہاڑی پر جنوں کا بسیرا ہے؟ کیا یہاں چڑیلوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں؟ کیا یہاں چھلاوے نمودار ہوتے ہیں جو پوری آبادی کے لیے خوف کی علامت بن کر آتے ہیں؟ دوچار نعشیں گراتے ہیں...... کسی کا سہاگ اجاڑتے ہیں تو کسی کی زندگی بھر کا سہارا چھین لیتے ہیں اور غائب ہوجاتے ہیں۔

کٹی پہاڑی کے اطراف سے درجنوں کہانیاں جڑی ہوئی ہیں اور سب سے زیادہ مشہور یہ کہ...... یہاں روحیں بھٹک رہی ہیں' یہ ان لوگوں کی روحیں ہیں جو بے موت مارے گئے ہیں۔ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے 'پراسرار نمبر' کے لیے کہانی کی تلاش میں میری نگاہیں اکرم بابا کو ڈھونڈ رہی تھیں جو وہاں چوکیداری کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور رات گئے بھٹکتی روحوں کا سامنا کرتے ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ کٹی پہاڑی آج کل روحوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے اور پھر جوں ہی سورج نے مغرب کی سمت شفق کی لال چادر میں اپنا منہ چھپایا تھا' میں اکرم بابا کا گھر تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

''السلامُ علیکم! اکرم بابا!'' میں جو خاصا طویل سفر طے کر کے وہاں پہنچی تھی' انہیں پھولی سانسوں کے ساتھ سلام کیا تھا۔

''ارے بٹیا! تم تو مقررہ ٹائم سے پہلے ہی پہنچ گئیں۔تم سے فون پر بات کرنے کے بعد میں تو یہی سوچ رہا تھا کہ تم شاید ڈر کر یہاں آنے کا ارادہ ترک کردو گی۔''

''نہیں بابا......! آپ سے بات کرنے کے بعد تو میری جستجو اور بڑھ گئی ہے۔'' میں نے اُن کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہوئے پھولے سانس کے ساتھ ہی اپنی بات مکمل کی تھی۔

''تو ٹھیک ہے پھر تم ابھی یہاں میرے گھر میں بیٹھو' پانی وغیرہ پیو' اپنی سانسیں بحال کرو' میں اتنی دیر میں نماز سے فارغ ہوکر آتا ہوں۔''

اکرم بابا اپنی بیوی کو آواز لگاتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئے تھے تو میں بھی اُن کے پیچھے گھر میں داخل ہوگئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اکرم بابا کی بیوی میرے قریب پانی کا جگ اور گلاس رکھ کر چلی گئی تھیں جبکہ اکرم بابا نماز پڑھنے کے لیے قریبی مسجد چلے گئے تھے۔

اکرم بابا کے مسجد جانے کے بعد اُن کی بیوی کچن میں ایسی مصروف ہوگئی تھیں کہ انہیں میرا خیال ہی نہیں آیا تھا۔کمرے کا ماحول بہت گھٹن زدہ تھا اور اس گھٹن زدہ ماحول میں' میں سوچ رہی تھی کہ......'کیا واقعی یہاں روحیں بھٹک رہی ہیں اور وہ یہاں کے لوگوں کو نظر بھی آتی ہیں؟ اس ترقی یافتہ دور میں جبکہ انسان نے خلا کی وسعتوں میں قدم رکھ دیا ہے' سائنس ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ عقلِ انسانی خود حیران ہے تو پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان ابھی تک توہمات کے چکر میں پڑا رہے؟' اور پھر اچانک جیسے مجھ پر ایک وحشت سی طاری ہوگئی تھی' سو میں نے گھبرا کر وہاں سے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''سنیے' میں ذرا قریبی اسٹور سے کولڈ ڈرنک لینے جارہی ہوں۔ اکرم بابا آئیں تو انہیں بتایئے گا کہ......'' میں کچن میں جھانکتے ہوئے بول رہی تھی. جبکہ اکرم بابا کی بیوی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا' ناں ہاں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

'عجیب خاتون ہیں' احساسات سے عاری......' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے سوچا تھا اور تیزی سے باہر نکل آئی تھی...... باہر ہوا میں ہلکی خنکی تھی۔

میری پیشانی پر آیا پسینہ اب مجھے ٹھنڈک کا احساس دلا رہا تھا۔میں اپنی رو میں چلتی جارہی تھی۔ مجھے کسی جنرل اسٹور کی تلاش تھی جہاں سے ایک ٹھنڈی یخ کولڈ ڈرنک مل سکے۔ابھی میں نے دو گلیاں ہی عبور کی تھیں کہ اچانک خوف کا احساس بڑی شدت سے میرے دل اور ذہن پر غالب ہونے لگا تھا۔یہ بات تو سو فیصد درست ہے کہ کٹی پہاڑی کے اونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے انسان کو اچانک ہی یہ خیال خوف زدہ کردیتا ہے کہ کہیں کسی نامعلوم مقام سے آتی گولی بدن کے آر پار نہ ہوجائے۔ میں کشاں کشاں چلتی ہوئی جس گلی میں پہنچی تھی' اُس گلی کے بیشتر مکانات جلے ہوئے تھے بلکہ جلے ہوئے گھروں کی دیواریں خوفناک دراڑوں سے منقش ہوچکی تھیں۔ اس گلی کے نکڑ پر لگی اسٹریٹ لائٹ کا سایہ اندھیری گلی میں عجیب وحشت زدہ سا ماحول پیدا کر رہا تھا۔ اُسی وقت میرے کانوں میں جیسے کسی بازگشت کی صورت یہ آواز آئی تھی۔

''یہ زندگی بھی عجیب ہے' اس کی آگ میں بس جلتے رہو' زندگی کی آسائشوں' آرام اور سکون کے واسطے' بس انتظار کے دن کاٹتے رہو۔'' پھولے ہوئے سانس سے تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہ عورت اور نجانے کیا کیا بڑبڑا رہی تھی۔

''کون ہے یہ؟'' میں خوف زدہ سی اُس عورت کی حالت پر غور کررہی تھی' میلی سی چادر میں دبلا پتلا سراپا' کھچڑی جیسے اجڑے بال جو اُس کے شانوں پر پھیلے ہوئے تھے' اُس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپر تھا غالباً جس میں کپڑوں کے علاوہ اور دیگر سامان بھی تھا۔

'کیا یہ عورت پاگل ہے جو اس اندھیری گلی میں جلے ہوئے مکان کے دروازے پر کھڑی ہے؟' میں بھی آہستہ آہستہ اس مکان کے قریب پہنچ گئی تھی۔

''سہیل بیٹا' دروازہ کھولو' بیٹا' جلدی سے کھولو۔'' اور پھر پل بھر میں جلا ہوا دروازہ چرچراتی ہوئی آواز کے ساتھ کھل گیا تھا اور وہ عورت اندر داخل ہوگئی تھی۔اس گھر کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے مکان کے اندر خستہ حال نقشہ بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔اس کے لیے گھر میں داخل ہونے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

''سہیل' میرے بچے' تیری یاد نے تو میرے دل اور دماغ کو اجاڑ کر رکھ دیا ہے' بس بیٹا' اب تو گھر آجا' یہ ماں تیرے بغیر بے چین ہے۔'' وہ عورت سامنے کھڑے غالباً اٹھارہ' انیس سال کے نوجوان سے مخاطب تھی۔

''ماں' تو' تو جانتی ہے' میں کتنا مجبور ہوں' میں تیرے پاس نہیں آسکتا' بس تو ہی آجاتی ہے تو میرے دل کو تسلی ہوجاتی ہے۔ یہ بتا' آج کھانے میں کیا پکایا ہے؟'' اب وہ دونوں ہی جلے ہوئے گھر کی زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے تھے۔

'یقیناً یہ کوئی مجرم ہے جو جیل سے بھاگ کر آیا ہے اور یہاں پناہ اختیار کی ہوئی ہے یا ہوسکتا ہے' کوئی رہزن ہو جو دن کے اجالے میں لوگوں کو لوٹتا ہو اور رات اس کھنڈر جیسے گھر میں قیام کرتا ہو۔' میں نے یہ سب سوچا تھا اور پھر میرے دل میں تو آیا تھا کہ میں اسی وقت کال کر کے پولیس کو خبر دوں مگر میں مصلحتاً خاموش رہی تھی۔

''یہ دیکھ' آج میں روٹی قیمے کے ساتھ تیرے لیے کھیر بھی بنا کر لائی ہوں۔ میرے چاند' تجھے کھیر بہت پسند ہے ناں؟'' عورت کی آواز میں محبت ہی محبت تھی۔

''ماں......! تو کتنی اچھی ہے۔'' نوجوان نے اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تھا۔

''پھر تو مجھ سے اتنا دور کیوں رہتا ہے؟'' عورت کی آواز میں بہت کرب تھا اور لفظوں کے ساتھ ساتھ

اب سسکیاں بھی ٹوٹ ٹوٹ کر آ رہی تھیں۔

’اف...... کتنا عجیب منظر تھا...... ایک ویرانے میں ماں اور بیٹے کا اس انداز میں ملن۔ آخر اُن کے درمیان ایسی مجبوری کی کون سی دیوار حائل ہے جو......‘ ابھی میں انہی سوچوں میں غلطاں تھی کہ گلی میں ایک بھیڑیئے نما کتے کی آمد نے میری جان نکال دی تھی اور وہ جس انداز مں بھونک رہا تھا' میرا دل خوف سے کانپنے لگا تھا۔ میں سب کچھ بھول کر سرپٹ دوڑتی ہوئی تیزی سے گلیاں عبور کرتی واپس اکرم بابا کے گھر کے سامنے پہنچ گئی تھی۔

”ارے بٹیا' میں تمہیں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں' جلد اندر آؤ' تم خیریت سے تو ہو ناں؟“ اکرم بابا کے چہرے پر فکر کی لکیریں نمایاں تھیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور خاموشی سے اُن کے گھر میں داخل ہوگئی تھی۔

•......•......•......•

”بٹیا' میں بات جلدی شروع کروں گا تاکہ جلدی ختم بھی ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں زیادہ وقت نہیں گزارو' ویسے تم نے یہاں آ کر ایک بات تو محسوس کی ہوگی؟“ اکرم بابا نے نہایت ہی ملائم لہجے میں پوچھا تھا۔

”کون سی بات بابا؟“ میرے لہجے میں ایک تجسس تھا۔

”یہی کہ اس علاقے کے بیشتر گھر خالی' جلے ہوئے اور تباہ حال ہیں' یہاں اندھیرے کا راج ہے......“

”جی بابا' ایسا کیوں ہے؟“ میں نے اپنی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مسلا اور خود کو اس گھر اور منظر سے چھٹکارہ دلانے کی کوشش کی جس سے کچھ دیر پہلے میری آنکھوں کا سامنا ہوا تھا۔

”بٹیا' گئے دنوں جو یہاں لسانی فسادات ہوئے تھے' یہ سب اُسی کا نتیجہ ہے۔ اُن فسادات میں رخسار نامی ایک لڑکی کو بھی اغوا کر لیا گیا تھا پھر اسے تشدد اور زیادتی کا شکار بنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اُس کی نعش کو یہاں پہاڑ کی چوٹی پر پھینک دیا گیا۔ رخسار تو مر گئی لیکن جس اذیت اور کرب سے وہ دوچار ہو کر مری تھی' یقیناً اسی لیے اُس کی روح کو قرار نہیں ملا۔ شاید اسی لیے وہ آج بھی ہمارے اردگرد چلتی پھرتی نظر آتی ہے' لوگ اُس کو دیکھتے ہیں' وہ پاگلوں کی طرح اُن کے پیچھے بھاگنے لگتی ہے' اسی وجہ سے خوف زدہ لوگ اس علاقے کو چھوڑ کر جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔“

”کیا واقعی یہ بات سچ ہے کہ یہاں پر رخسار کی روح پریشان حال پھرتی ہے؟“ میں نے بڑی بے یقینی سے پوچھا تھا۔ ’ایک لڑکی جو یقیناً تکلیف دہ مراحل سے گزر کر مر چکی ہے' وہ انسانوں کو پریشان کر رہی ہے۔ میں اس بات کو کیسے تسلیم کر لوں؟“

”یہ بالکل سچ ہے بیٹا! میں تمہاری تشفی کے لیے یہ بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ انسانی وجود کے لیے جسم' روح اور عقل کا ہونا ضروری ہے۔ یہ انسان کی حقیقت ہے۔ انسان جسم' روح اور عقل کے بغیر خاک کا ڈھیر ہے۔ جسم مادہ ہے یعنی جسم حاضر ہے جبکہ عقل اور روح غائب عنصر ہیں۔ رُوح کو کسی نے نہیں دیکھا لیکن اس کا وجود قوی ہے کیونکہ رُوح مرکزِ خیالات ہے۔ اس کے بغیرِ زندگی ممکن نہیں۔“

”لیکن بابا! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی کہ انسانی جسم کے فنا ہونے کے بعد رُوح کی موجودگی کی عقلی دلیل کیا ہے؟“

”بٹیا! رُوح نہایت ہی لطیف اور ہلکی ہوتی ہے' یہی وجہ ہے کہ اس کی حرکات لامحدود ہوتی ہیں۔ وہ ایسے کام انجام دے لیتی ہیں جو کہ جسم انجام نہیں دے سکتا اسی لیے عقلِ انسانی حیران رہ جاتی ہے۔“

”اچھا!!“ حیرت میرے لہجے میں اب بھی نمایاں تھی۔

”بٹیا! میں تمہیں اسی حوالے سے اسی جگہ کا ایک اور واقعہ سناتا ہوں۔“

”جی بابا جی......!“ میں ہمہ تن گوش ہوگئی تھی۔

”یہاں سے تین گلیاں چھوڑ کر ایک سترہ سالہ نوجوان لڑکا سہیل رہتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جن دنوں کٹی پہاڑی پر لسانی فسادات پھوٹے' اس دن وہ اپنے گھر پر تھا جبکہ اُس کے ماں باپ علاقے سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ فساد کے بعد آناً فاناً پورا علاقہ بند ہوگیا تھا' لوگ گھروں میں محصور ہوگئے تھے' ہر طرف گولیاں چل رہی تھیں' اسی دوران میں سہیل کے گھر پر پیٹرول بم سے حملہ ہوا تھا۔ اُس نے اپنی جان بچانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن گھر سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ اردگرد والوں نے فائر بریگیڈ کو بلانے کی کوشش کی تھی لیکن فائر بریگیڈ نے اتنے خراب حالات میں آنے سے انکار کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ سہیل سمیت وہ پورا گھر جل گیا تھا۔“

”کیا......؟“ یہ کہانی سن کر تو مجھ پر حقیقت میں اب ہیبت طاری ہو چکی تھی۔

”ہاں بٹیا......! یہ لڑائی فسادات کا سلسلہ بارہ گھنٹے جاری رہا۔ گلیوں کے اندر چھلاووں کا راج تھا اور گلیوں کے باہر پولیس اہلکار کسی کو اندر آنے نہیں دے رہے تھے۔ سہیل کے ماں باپ پوری رات پاگلوں کی طرح ایک سڑک کے کنارے بیٹھے اپنے اکلوتے بیٹے کی زندگی کے لیے دُعاگو تھے اور جب کسی طرح یہ ہولناک رات گزر گئی اور جب سہیل کے ماں باپ اپنی گلی میں داخل ہوئے تو دور سے ہی اپنے جلے ہوئے گھر کا منظر دیکھ کر اُن کے دل دہل گئے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ جب وہ اندر داخل ہوں گے تو کیا قیامت کا منظر ہوگا؟“ اُن کے بیٹے سہیل کی لاش کوئلہ بن چکی تھی' اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر کھلی ہوئی تھیں جن میں حیرت تھی' انتظار تھا کہ کوئی شاید اُسے بچانے کے لیے آ جائے' آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ کس بے بسی سے مرا ہے اور پھر اس واقعے کے بعد اُس کی ماں پاگل ہوگئی۔ گورنمنٹ نے انہیں دوسری جگہ منتقل تو کر دیا ہے لیکن آج بھی سہیل کی ماں اپنے بیٹے کے لیے نت نئے کھانے بنا کر لاتی ہے اور یہ اُس کا دعویٰ ہے کہ اُس کا بیٹا اُسے روز ملنے آتا ہے اور اُس کے ہاتھ سے کھانا کھاتا ہے۔“

میں جو دم بخودسی اکرم بابا کو سن رہی تھی' خود میری اپنی حالت ایسی ہو چکی تھی جیسے کاٹو تو لہو نہیں۔

”یاالٰہی! یہ کیا ماجرا ہے؟ کچھ دیر پہلے میں نے جو منظر دیکھا ہے' ایک پاگل سی عورت اور اُس کا بیٹا' کیا واقعی وہ سہیل کی روح تھی؟ یا پھر ایک خواب یا شاید ایک تصوراتی خیال جسے فرض کر لیا جائے؟“ میں حقیقت میں اُس وقت سخت ڈر گئی تھی۔ اکرم بابا کی باتیں یقیناً درست تھیں۔ جس بات کا اکرم بابا ذکر کر رہے تھے' وہ میں اُن کے بتانے سے پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ میں جو آسیب' بھوت' ارواح وغیرہ کی قائل نہیں تھی' اچانک ہی اس واقعے نے مجھے اپنے خیالات بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”بٹیا! گزشتہ چھ ماہ سے یہاں ایسا ہی ہو رہا ہے یقیناً جب تک تم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لو' تم یقین نہیں کرو گی۔“ اکرم بابا آلتی پالتی مار کر بیٹھ چکے تھے جبکہ اُن کے لہجے اور آنکھوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سونا چاہتے ہیں' سو میں نے اٹھنے میں ہی اپنی عافیت جانی تھی اور اُن سے جانے کی اجازت لی تھی۔

”ہاں بٹیا......! اب رات بہت ہوگئی ہے۔ تمہارا یہاں سے جلدی نکل جانا ہی بہتر ہے۔“ وہ خوش دلی سے بولے تھے۔

”اچھا بابا......! خدا حافظ!“ میں یہ کہتی ہوئی

اُن کے گھر سے باہر نکل آئی تھی۔ گاڑی اب واپسی کے لیے رستوں پر رواں تھی لیکن میری سوچ کے دھارے انجانے رخ پر گامزن تھے مثلاً اگر سہیل کی کہانی میں پہلے سن لیتی اور پھر اس کے بعد میرا ان دونوں سے سامنا ہوتا تو یقیناً میری روح، جسم کی قید سے آزاد ہو چکی ہوتی...... میں اپنے اردگرد موجود لوگوں کو بھی اب شک کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی کہ کہیں یہ بھی تو بھٹکتی ہوئی روحیں تو نہیں جو انسانی روپ میں گھوم رہی ہیں!!

•......•......•......•

اکرم بابا سے سہیل کی رُوح کی کہانی سنے، خود اس کہانی کا حصہ بنے کئی روز گزر چکے تھے لیکن رُوح کے حوالے سے کئی سوال اور سوچیں میرے دماغ کو مسلسل الجھا رہی تھیں اور اَب اس مرحلے پر آ کر میرے دل سے اُس واقعے کے بعد والا تمام ڈر اور خوف نکل چکا تھا کیونکہ میں ارواح خبیثہ، جن بھوت اور چڑیل کے بارے میں نہیں بلکہ روح کی حقیقت جاننا چاہتی تھی اور پھر میرے تجسس نے مجھے اس حوالے سے ریسرچ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے روحوں کے حوالے سے بہت ساری کتابیں پڑھیں مگر ہر کتاب کے اختتام سے میری تشفی نہیں ہوئی تھی۔ میں بہت ساری شخصیات سے بھی ملی لیکن کسی نے بھی مجھے مدلل جواب نہیں دیا تھا۔ ابھی میں اسی اُلجھن میں مبتلا تھی کہ مجھے ایک ایسی شخصیت مل ہی گئی جو مجھے اس پیچیدہ اُلجھن سے نکالنے میں معاون ثابت ہوئی۔ اُن سے ملاقات کے بعد ابھی میرے دل کی بات زبان پر آئی ہی تھی کہ وہ شخصیت گویا ہوئی تھی۔

''اس کائنات میں کوئی راز، راز نہیں ہے لیکن اس کائنات سے انسان اُسی وقت فائدہ اٹھا سکتا ہے جب وہ اُن اصولوں کو صدقِ دل سے اپنا لے جو اس کائنات کے خالق نے بنائے ہیں۔''

''رُوح کی حقیقت کیا ہے؟'' میں نے فوری طور پر اُن سے یہ سوال کیا تھا۔

''انسان کسی بھی حقیقت کو اُسی وقت تسلیم کرتا ہے جب حواسِ خمسہ کی تمام قوتیں اس پر گواہ ہو جائیں۔ یہ حقیقت اور سچائی کا معیار ہے، بس اللہ نے انسان کو حواس کی انمول نعمت سے نوازا ہے اور جو لوگ اس نعمت سے محروم ہیں، انہیں اس کائنات کا تو کیا، اپنا ہوش بھی نہیں ہوتا اسی لیے دنیا والے انہیں پاگل کہتے ہیں۔''

''لیکن اس بات کا روح سے کیا تعلق ہے؟''

''جسم، روح اور عقل، یہ تینوں عنصر انسان کی ذات میں اپنا اپنا فرض پورا کر رہے ہیں۔ اب یہ فرض انسان کا ہے کہ وہ ان عناصر کے تعاون سے کائنات و مافیہا کی حقیقت جاننے کی کوشش کرے۔''

''لیکن آخر رُوح کیا ہے؟'' مجھے اس طرح کے جوابوں سے سخت کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

''جاننا چاہتی ہو تو جانو، یہ ایک ایسا راز ہے جس کے بارے میں حق تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں بھی خاموش رہنے کو کہا ہے کیونکہ یہی اس کی قدرت کا راز ہے۔''

''لیکن روح تو مرکزِ حیات ہے؟'' میں نے اپنی عقل کے مطابق کہا۔

''یہ حقیقت ہے، رُوح حیات کا احساس ہے۔ جب تک جسم طاقت ور رہتا ہے، اس وقت تک رُوح کا جسم سے تعلق رہتا ہے لیکن جب جسم اپنی طبعی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو رُوح، جسم کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے جسے ''موت'' کہا جاتا ہے اور کیونکہ قرآنِ پاک میں اس زندگی کے بعد ایک اور ابدی زندگی کا تصور پیش کیا گیا ہے جس پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے۔''

''یعنی آپ کا مطلب ہے رُوح کبھی فنا نہیں ہوتی؟''

''ہاں بالکل، رُوح پر حکم چلانے کی خاطر ہی رُوح درکار ہوتی ہے کیونکہ رُوح لطیف ہوتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ انسان اس رُوح کی خاطر جسم سے نجات حاصل کر لے اور اگر رُوح پاک ہو تو دوسری ارواح پر حکم بھی چلایا جا سکتا ہے۔''

''روحوں کے بھٹکنے کی اصل وجہ؟'' میں اپنے سوال کرنے والی فطرت سے مجبور تھی۔

''وہ روحیں جو برے جسمانی اعمال کے مطابق بھاری اور گندی ہو جاتی ہیں، وہ دنیائے وحدت کی نوری حدود کو پار نہیں کر سکتیں اس لیے فضا میں بھٹکتی رہتی ہیں جنہیں دنیا والے اپنے قابو میں کر لیتے ہیں۔''

''کیا واقعی بھٹکتی روحوں کو قابو کرنا آسان ہے؟'' میرے تجسس نے پھر کروٹ لی۔

''رُوح سے رُوح کے ذریعے ہی کام لیا جا سکتا ہے۔'' پہلی بار اُن کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''سہیل کی روح کیوں بھٹک رہی ہے؟'' میری کچھ حد تک تشفی ہو گئی تھی اس لیے میں اصل بات تک آ ہی گئی۔

''کیونکہ وہ بے موت مارا گیا...... اس لیے اُس کی روح بھٹک رہی ہے۔''

''یعنی یہ جو روز ٹارگٹ کلنگ ہو رہی ہے، خوفناک دھماکے ہو رہے ہیں، لوٹ مار کا بازار گرم ہے، بھتہ خوری اور اسٹریٹ کرائم نے لوگوں سے اُن کی زندگیاں چھین لی ہیں، کیا ان سب کی روحیں بھی بھٹک رہی ہیں؟''

میرے اس سوال پر انہوں نے ایک تاسف بھری نظر میرے چہرے پر ڈالی اور پھر بولے......

''یہ جو انسانوں کے بھیس میں عزرائیل گھوم رہے ہیں، ایک دن ان کی روحیں بھی یونہی بھٹکیں گی، شاید یہ بھول بیٹھے ہیں کہ ایک دن ان کی بھٹکتی روحوں کو قابو کرنے والے بھی انسان ہی ہوں گے، ان ہی جیسے انسان......''

''اے کاش...... یہ نادان لوگ جان جائیں۔ جانے کیوں یہ اپنی عاقبت خراب کر رہے ہیں؟'' میں نے بہت بے بسی کے عالم میں جواب دیا۔

''اصل بات تو تب ہے کہ اگر کوئی روح، جسم کے فنا ہونے سے قبل ہی اپنے رَب سے ناتہ جوڑ لے؟''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' میں چونکی۔

''ایسی رُوحیں پاک اور مقدس ہوتی ہیں۔ وہ منتہائے الٰہی کے مطابق کام انجام دیتی ہیں اس لیے انہیں حق تعالیٰ کا قُرب حاصل ہوتا ہے۔ اُن رُوحوں کے جسم تو دنیا میں موجود رہتے ہیں لیکن وہ خود ذاتِ الٰہی کے حضور میں سر بہ سجود احکام کی منتظر رہتی ہیں۔ اَب یہ تمہارا فیصلہ ہے کہ تم اپنی رُوح کو اس مادی اور فانی جسم سے جدا کر کے حق تعالیٰ سے ناتا جوڑنا چاہتی ہو یا پھر یونہی کسی بھٹکتی روح کا پیچھا کرنا چاہتی ہو؟''

''یقیناً میں تو......'' ابھی میں مزید آگے کچھ بولتی کہ میں نے دیکھا، وہ شخصیت غائب ہو چکی ہے یا شاید میں کسی شخصیت سے مخاطب ہی نہیں تھی۔ یہ تو محض میری اپنی سوچیں تھیں جو آپس میں کلام کر رہی تھیں یا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میری اُلجھن دور کرنے اور میری مدد کی خاطر کوئی نیک رُوح میرے حواس پر چھائی ہوئی ہو...... یقیناً یہی درست ہے کیونکہ میں جو رُوحوں کی کھوج میں مبتلا ہوں تو میری اُلجھن کا سلجھاؤ رُوح ہی کر سکتی ہے، کوئی انسان نہیں کیونکہ انسان جس تیزی سے انسانوں کا قتل کر رہا ہے، مجھے یقین ہے ایک دن ایسا آئے گا جب اس دنیا میں انسانوں کی نہیں، بھٹکتی روحوں کی حکمرانی ہوگی۔ آج جہاں انسان بسے ہیں، یہ جگہ صرف اور صرف روحوں کی آماجگاہ ہوگی۔

☆ ☆





محمد اقبال زمان

قبرستان کا راجہ

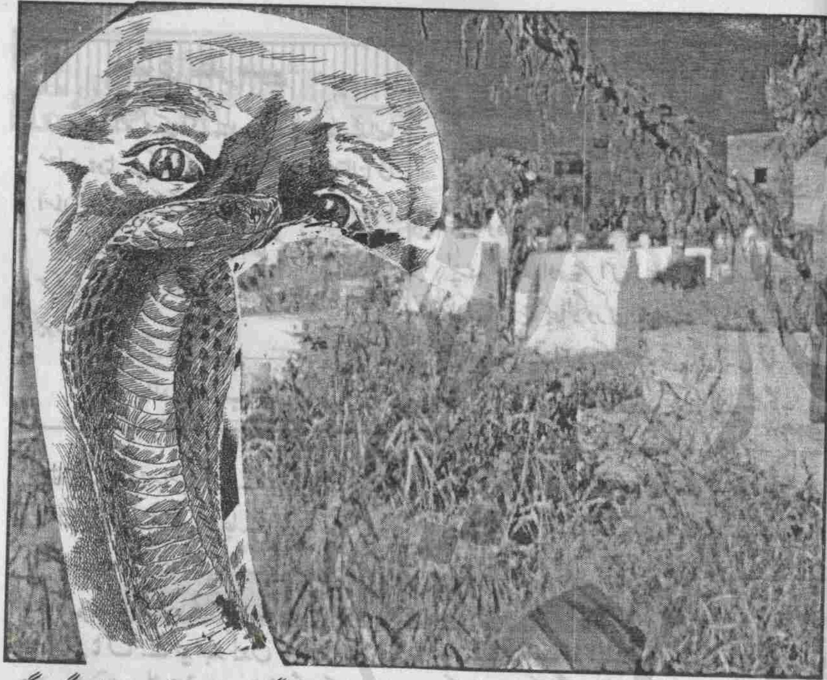
بھالو گورکن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ سانپ اس سے ہزار گنا طاقت ور ہوگا۔ سانپ کو انسانی زبان میں باتیں کرتا دیکھ کر بھالو گورکن کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔

کراچی شہر کے ایک قبرستان کا اسرار بھرا قصہ، جہاں سانپوں کی حکمرانی ہے

لوگ کہتے ہیں، جامعہ ملیہ کے قبرستان میں برسہا برس سے پراسرار سانپوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور ان کی سربراہی ایک سیاہ کنگ کوبرا کرتا ہے۔ قبرستان کے متعلقین کا کہنا ہے کہ کنگ کوبرا قبرستان میں آنے جانے والے تمام لوگوں سے واقف رہتا ہے اور اگر کوئی شخص اس کے گروہ کے کسی سانپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو کنگ کوبرا آناً فاناً نمودار ہو جاتا ہے..... عینی شاہدین بتاتے ہیں کہ کنگ کوبرا کی موٹائی تقریباً ایک فٹ تک اور لمبائی پندرہ فٹ تک ہے۔

جب ہم پراسرار واقعات کی تصدیق اور تلاش میں ملیر میں واقع جامعہ ملیہ قبرستان میں داخل ہوئے تو قبرستان میں عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا سناٹا عموماً قبرستانوں میں شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے کیونکہ قبرستان میں کام کرنے والے گورکن اور دیگر خدمت گار آتے جاتے یا کام کرتے ضرور دکھائی دے جاتے ہیں۔ خیر اس قبرستان میں پراسرار واقعات جاننے کے لیے ہمیں کتنی جدوجہد کرنا پڑی یہ ایک الگ کہانی ہے۔ ذرا دیر بعد قبرستان میں بنے ایک مزار کے فرش پر صفائی ستھرائی کرتے ہوئے ایک بزرگ دکھائی دیئے تھے۔ ہم نے جب اس بزرگ سے ملاقات کی تھی تو پتہ چلا تھا، یہ بزرگ گزشتہ تیس سال سے اس قبرستان میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان بزرگ نے جو انکشافات کیے، وہ نہ صرف لرزہ خیز بلکہ پراسرار بھی ہیں۔ ان بزرگ کے جسم میں جب تک طاقت و توانائی تھی، وہ بطور گورکن کام کرتے رہے اور اب قبروں کی صفائی ستھرائی اور قبروں پر پانی ڈال کر گزر بسر کے لیے کچھ روپے کما لیتے ہیں۔

بزرگ نے ہمارے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ جب میں نے اس قبرستان میں کام کا آغاز کیا تھا تو مجھے اس قبرستان میں کام کرنے والے دیگر ساتھیوں کے چہروں پر خوف کے سائے لہراتے دکھائی دیئے تھے لیکن کئی بار پوچھنے پر بھی کوئی اس کی وجہ بتانے کو تیار نہیں ہوا اور پھر قبرستان کے اندرونی حصوں میں بھی کوئی اکیلا نہیں جاتا تھا۔ مغرب کے وقت سے پہلے ہی سب اپنے گھروں میں چلے جاتے تھے۔ یہ سب باتیں اور طرز عمل مجھے تشویش میں مبتلا رکھتی تھیں اس لیے میں بھی محتاط رہنے کی کوشش کرتا تھا اور پھر ایک دن دوپہر کے وقت اچانک قبرستان کے اندرونی حصے سے کسی کے چیخنے کی آواز آنی شروع



ہو گئی تھی۔ قبرستان میں جس جس نے بھی چیخنے چلانے کی آواز سنی تھی، وہ اسی آواز کی طرف دوڑا تھا۔ وہاں ایک قبر پر پانی ڈالنے والا بلوچ ایک قبر کے پاس کھڑا بری طرح سے چیخ رہا تھا۔ جب اُس سے چیخنے کی وجہ دریافت کی گئی تھی تو بلوچ نے اپنی بلوچی زبان میں ایک دوسرے بلوچ سے کہا تھا جو میں نہ سمجھ سکا تھا مگر دوسرے بلوچی بندے نے جب اس کی پیٹھ پر سے قمیص ہٹا کر دیکھا تھا تو اس کی پیٹھ پر ایک فٹ چوڑا اور لمبا سا نشان تھا جس میں سے خون نکل رہا تھا۔ وہ نشان دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اُس کی کھال کھینچ لی ہو اور میں وہاں کھڑا یہ سارا منظر دیکھتا رہا تھا اور پھر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ دوسرے روز جب وہ لوگ قبرستان آئے تھے تو میں نے اُس بلوچ کی خیریت دریافت کی تھی تو پتہ چلا تھا کہ اُس پر غشی کے دورے پڑ رہے ہیں اور منہ سے جھاگ نکل رہا ہے۔ یہ بات میرے لیے بہت حیران کر دینے والی تھی اور پھر جب سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے تھے تو میں نے ایک بلوچ سے پوچھا تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ میرے کافی اصرار کے بعد اُس بلوچ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اس بات کے حوالے سے اسے کسی کو بھی اس کا نام نہیں بتاؤں گا اور پھر اُس نے جو باتیں مجھے بتائی تھیں، میرا دل اور ذہن اُن باتوں کو ماننے کے لیے کسی صورت بھی تیار نہ تھا۔

اُس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ قبرستان زہریلے اور پراسرار سانپوں کی آماج گاہ ہے جن کا سربراہ بلیک کوبرا ہے جسے یہاں کے لوگ راجہ ناگ کہہ کر پکارتے ہیں..... یہ ایک قدیم روایت ہے کہ ان کے خاندان کا پہلا بزرگ جو اس قبرستان میں گورکن بنا تھا، اُس سے راجہ ناگ نے ایک عہد لیا تھا کہ وہ یا اس کے خاندان کا کوئی اور فرد قبرستان کے کسی سانپ کو مارنے کی کوشش نہیں کرے گا اور نہ اسے بھگانے کے لیے کوئی کوشش ہوگی۔ اگر اس کو یا اس کے خاندان کے کسی فرد کو

میری نظر سے

سرسید احمد کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو۔ اس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں۔ خواہ وہ ہمیشہ اس سمت میں نہ ہوں جو سرسید کو پسند کرتے تھے۔

خالدہ ادیب خانم

قبرستان میں کوئی سانپ نظر آئے تو وہ خاموشی سے یا تو راستہ بدل لے یا واپس ہو جائے......

جب وہ نوجوان مجھے یہ سب باتیں بتا چکا تو اس سے میں نے سوال کیا تھا کہ اُن کے بزرگ گورکن سے راجہ ناگ نے یہ عہد کیوں لیا تھا؟ اس کے جواب میں اس بلوچ نوجوان نے مجھے ایک بہت حیرت انگیز اور پراسرار واقعہ سنایا تھا۔ اس نے بتایا کہ اُن کے خاندان کا بزرگ گورکن اپنے قدو قامت اور بھاری جسامت کی وجہ سے بھالو بلوچ کہلاتا تھا۔ وہ دوسرے گورکنوں سے پہلے یعنی آدھے گھنٹے میں پوری قبر کھود کر تیار کر لیا کرتا تھا۔ وہ بہت نڈر تھا اور ہر خطرے میں بے دھڑک کود جایا کرتا تھا...... ایک روز چند خواتین ایک قبر پر فاتحہ پڑھ رہی تھیں کہ انہیں ایک سانپ کا بچہ دکھائی دیا تھا اور ان خواتین میں سے ایک بڑی عمر کی عورت نے اپنی چپل سے اس سانپ کے بچے کو مارنے کی کوشش کی تھی تو چپل تو اس سانپ کے بچے کو نہ لگی تھی لیکن اس جگہ سے اچانک ہی ایک سیاہ رنگ کا ناگ نکل آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ خواتین چیختی چلاتی وہاں سے بھاگ نکلی تھیں۔ بھالو نے ان خواتین کی چیخ و پکار سن کر اس سمت دوڑ لگا دی تھی اور پھر وہ ناگ بس بھالو پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ بھالو نے فوری طور پر سیاہ ناگ پر بیلچے سے حملہ کر دیا تھا اور پھر بھالو نے ناگ کی گردن پکڑ لی تھی لیکن بھالو گورکن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ سانپ اس سے ہزار گنا طاقت ور ہوگا' وہ سانپ دیکھتے ہی دیکھتے بھالو کے جسم سے لپٹ گیا تھا اور پھر اس سے پہلے کہ سانپ اسے ہلاک کر دیتا' بھالو گورکن اس سے رحم کی بھیک مانگنے لگا اور پھر یہ تو اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ سیاہ ناگ اس کی یعنی انسانی زبان میں بول اٹھے گا۔

سیاہ ناگ نے پھنکارتے ہوئے کہا تھا۔ ''تم نے میری بادشاہت اور میرے معاملے میں مداخلت کی' اب تم معافی مانگتے ہو؟'' اس کے جواب سے بھالو گورکن کی آنکھیں گویا پھٹ رہی تھیں۔ اسے اپنے جان سے جانے کا اتنا خوف تھا کہ وہ گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا تھا' تب سانپ نے اس سے عہد لیا تھا کہ اس کے خاندان کے لوگ نہ تو اس کے سانپوں کے معاملات میں دخل اندازی کریں گے اور نہ ہی قبرستان چھوڑ کر جائیں گے اور ساتھ ہی اس نے اس عہد کو خفیہ رکھنے کا بھی وعدہ لیا تھا...... بھالو گورکن نے وہ سب باتیں مان لی تھیں۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ اس عہد کا پابند رہا اور اپنی اولاد کو بھی عہد کا پابند رکھا لیکن اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا یہ قبرستان چھوڑ کر ٹھٹھہ چلا گیا تھا۔''

اُن بزرگ نے بعد میں ہمیں بتایا تھا کہ میں خود اس جامعہ ملیہ قبرستان کے راجہ ناگ کو کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں' راجہ ناگ سیاہ چمکیلی رنگت کا حامل قوی الجثہ سانپ ہے اور اس قبرستان میں ہونے والے میلے کی رات میں ایک مرتبہ ضرور دکھائی دیتا ہے۔ قبرستان میں موجود سانپوں سے قبرستان کے خدمت گار اور علاقہ مکین بھی شدید خائف سے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قبرستان چند مخصوص دنوں کے علاوہ دن رات سنسان اور سناٹے میں ہی دکھائی دیتا ہے۔

✲ ✲ ✲

سفر کہانی جیتے جاگتے دوڑتے بھاگتے' سچے مناظر کی آنکھوں دیکھی روداد



عکاشہ سحر ایمان

برف زار

آتش کا خیال

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

ہٹلر کے دیس جرمنی سے جڑی سفر کہانی، عکاشہ سحر کے خوبصورت لفظوں میں۔ آخری حصہ

✲ ✲

ڈسل ڈراف کا وہ دن بہت اُداس کر دینے والا تھا۔ میری نظریں برفاب نیلے پانی کی سطح پر تیرنے لگیں۔ گھنے سبز جنگل...... آف وائٹ موم جیسی برف کے گالے...... دور تک اڑتے پھرتے تھے میں نے ہاتھ بڑھا کر انہیں چھونے کی کوشش کی تھی۔

فرینکفرٹ کی پرواز تین گھنٹے بعد تھی۔ فرینکفرٹ میں دو گھنٹے قیام کے بعد ہم نے جرمنی کی حسین یادوں کو ساتھ لے کر پیرس چلے جانا تھا۔ میں نے بالکونی میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ تھوڑے سے فاصلے پر مسیحی قبرستان تھا۔ میں اِس قبرستان میں بھی گئی تھی۔ سنگ مرمر کی چمکتی صلیبیں، چند ننھے منے فرشتے، ایک بڑا فرشتہ خوب صورت پروں والا' ملائم سفید پر میں نے ہلکا سا چھوا...... ہر طرف سبزہ، ہریالی تھی...... قبروں کے کتبے میں نے بلند آواز میں پڑھے۔ سو سالہ پرانا قبرستان بہت بہتر حالت میں تھا۔ پاکستان میں مجھے اپنا گھر یاد آیا۔ اُس گھر سے تھوڑے سے فاصلے پر قبرسان ہے۔ شام کے اُداس لمحوں میں حویلی کی چھت پر کھڑے ہو کر میں قبرستان کی خاموشی کو دل سے محسوس کیا کرتی تھی۔ منظر یہاں بھی بالکل ویسا ہی لگ رہا تھا اور پھر دونوں قبرستان بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

ڈسل ڈراف کے پانیوں کی کہانی کہیں اپنا آپ لکھے جا رہی تھی۔ میلوں نیل پھیلے جذب میں ڈوبے منظر...... بھیگی بھیگی راتیں...... نیلی جھیل، سناٹوں کی دُھن اور نرمیلی ہواؤں کا ہلکا سا ارتعاش، ٹیرس کے جنگلے میں لگے پودے...... سب بہت پیچھے رہ گئے تھے مگر میری آنکھوں میں زندہ ہو گئے۔ گاڑی رواں دواں ہے۔ نطشے اور کارل مارکس کا جرمنی...... کارل مارکس نے 1818 میں جرمنی میں آنکھ کھولی۔ اُس وقت شہنشاہ بزمارک کو جرمنی کا ہیرو مانا جاتا تھا۔ آئرن چانسلر برمارک...... اُس کے علاقے ریاست پراشیہ کو

جرمنی میں وہی حیثیت حاصل تھی جو جنگجو پٹھانوں کے صوبہ سرحد کو پاکستان میں حاصل ہے۔ وہ ایک دیہاتی یونکر تھا جو سخت مزاج اور شدت پسند ہوتے ہیں، اُس کے دو کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔

جرمنی کی مختلف ریاستوں کا ایک ملک کی صورت میں اتحاد (1871) میں ہوا جس کے نتیجے میں پراشیہ کا راجہ پورے جرمنی کا (KAISSCR) بن گیا اور فرانس پر فتح حاصل کی جبکہ بزمارک (1815) میں پیدا ہوا۔ یہ نپولین کی شکست کا سال ہے اور درحقیقت بزمارک نے نپولین کی جگہ پُر کی لیکن جرمنی کے لیے بزمارک نے صنعتی ترقی کو بہت اہمیت دی۔ (عورتوں کے علاوہ) ہر ایک کو ووٹ ڈالنے کا حق دیا۔ کسانوں اور مزدوروں کو خوش حال بنایا۔

جنوب مغربی جرمنی کے چھوٹے شہر تریر میں پیدا ہونے والا کارل ہائن رخ مارکس، والد اور والدہ دونوں کی طرف سے یہودی ربیوں کے خاندان سے تھا مگر مارکس کی پیدائش سے پہلے اس کے باپ نے پروٹسنٹ عیسائیت اختیار کر لی۔ وکیل کے طور پر کامیاب ہونے کی خاطر، 17 سال کی عمر میں اس نے BONN یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہ 14 مارچ 1883 کو 65 سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ کارل مارکس کو ہائی گیٹ میں دفن کیا گیا ہے۔ جرمن سوشلسٹ لیڈر اینگلز نے اُسے خراج تحسین پیش کیا۔ اینگلز نے کہا۔ ”وہ سوچنے والا دماغ اب بند کر چکا ہے“ مارکس کے کتبے پر کمیونسٹ مینی فسٹو کی آخری لائن کندہ ہے۔ ”تمام ملک کے مزدورو متحد ہو جاؤ۔“ مزے کی بات یہ ہے کہ مارکس کو ایک بے وطن شخص یعنی اسٹیٹ لیس پرسن کے طور پر دفن کیا گیا۔ مارکس کے بعد آرٹ اور ادب کے میدان میں جتنی بھی تحریکیں شروع ہوئیں، اُن میں مارکسزم کا اثر شامل رہا۔ چاہے وہ وجودیت ہو، جدیدیت یا اختیات یا ژاک دریدا کا توڑ پھوڑ والا نظریہ، برنارڈ شا، پابلو پکاسو، یا بلونیرودا...... ژاں پال سارتر اور ادھر کرشن چندر اور فیض احمد فیض جیسی عظیم ادبی ہستیاں خود کو مارکسٹ کے طور پر پیش کرنے میں فخر محسوس کرتی رہی ہیں۔

ایڈالف ہٹلر کی سرزمین جرمنی...... 65 منٹ کے بعد ہم فرینکفرٹ میں تھے۔ سیما آپی اپنی بیٹی کے ساتھ ہماری منتظر تھیں۔ لاؤنج میں بہت رونق اور روایتی چہل پہل تھی۔ ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزارا بہت یادگار ملاقات رہی۔ میری صحت کے حوالے سے سیما آپی کافی فکر مند تھیں۔ بار بار اپنا خیال رکھنے کی تاکید۔ اُن کی محبت...... اُن کا خلوص ہمیشہ ساتھ رہے گا۔ اُن کی بیٹی ماہین بھی اچھی شخصیت کی مالک تھی۔ کھانا ہم سب نے ہوٹل میں کھایا لیکن چائے ماہین کے گھر پر پی، بہت مزے کی چائے تھی پھر ہم شاپنگ کرنے چلے گئے۔ مختلف اسٹورز کے باہر چمکتے ہوئے نیون سائن دلکش نظارہ پیش کر رہے تھے۔ سب نے مل کے خوب شاپنگ کی۔ سیما آپی نے ابھی دو ماہ اور فرینکفرٹ میں رہنا تھا مگر ہمارا یہاں پر وہ آخری دن تھا۔ فرینکفرٹ میں گزارا جانے والا وہ آخری دن بہت یادگار تھا۔ ماہین کے تین سالہ بیٹے عریض کی معصوم شرارتیں...... خوب صورت موسم سارے پُرخلوص لوگ...... سیما آپی نے ہمیں ایئرپورٹ ڈراپ کیا۔ پھر سے فرینکفرٹ ایئرپورٹ، باہر کہیں شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ اب ہم نے پیرس جانا تھا۔

پیرس جسے شہرِ فنون بھی کہا جاتا ہے، پیرس جس کی فضا میں روسیو، لامیر طینے، ہیوگیو، چالس، بیگالس، ہنری برگساں، میلارمے، مجسمہ ساز مائیکل انجیلو، ان سب کی سانسیں بسی ہوئی ہیں۔ امیگریشن کے مراحل کے بعد ہم جہاز میں سوار ہو گئے۔ سنا تھا کہ ہر آرکیٹکٹ، شاعر، آرٹسٹ کو زندگی میں ایک بار ضرور پیرس جانا چاہیے۔ ہم بھی متاثرین پیرس میں شامل ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے ”پیار کا پہلا شہر“ کے مطالعے کے بعد پیرس اور ایفل ٹاور میرے دل میں بستے ہیں۔ خوابوں کی سرزمین پیرس......!

پیرس میں ہماری رہائش منظر بھائی کے گھر تھی۔ منظر قریشی جن سے گھریلو تعلقات ہیں، ملتان کے رہائشی منظر قریشی اپنی بیگم نرجس اور پیارے پیارے بچوں عفان اور کیوٹ ہادیہ کے ساتھ پیرس میں پچھلے دو سال سے مقیم ہیں۔ ایئرپورٹ پر وہ ہمیں لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ پیرس کی فضا میں ایک عجیب سا سکون اور طمانیت ہے۔ سب کچھ ٹھہرا ٹھہرا پُرسکون، جامد جو لوگ پیرس جا چکے ہیں وہ میری کیفیت سمجھ گئے ہوں گے۔ میں تفصیل سے کیا بتاؤں! کاروں کی لمبی قطاریں...... شیشے کی طرح چمکتی سڑکیں...... ہماری گاڑی تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ میرے ذہن میں پاسکل اور منان کے کردار گھومنے لگے۔

☆...... ☆

تھکن کے ساتھ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ نرجس بھابی بہت زبردست کک ہیں۔ کھانے کا بہترین انتظام تھا۔ کافی پینے کے بعد تھکن اُتر گئی۔ فضا میں ایک سکوت طاری تھا یا پھر مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ دور آسمان پر ستارے یوں چمک رہے تھے جیسے کسی نے لاتعداد موتی جڑ دیئے ہوں۔ سونے سے پہلے گزرے دنوں کے واقعات ذہن کی اسکرین پر متحرک تصویروں کی مانند دوڑنے لگے۔ وہ دن جو جرمنی میں گزرے...... جانے کب نیند آئی۔

آنکھ کھلی تو دن کے بارہ بج رہے تھے۔ نرجس بھابی چائے لے آئیں انہیں معلوم ہے مجھے صبح صبح چائے پینے کی عادت ہے۔ نرجس بھابی سے معلوم ہوا کہ سکندر اور منظر بھائی کسی میٹنگ میں شرکت کے لیے چلے گئے ہیں، اُن کی واپسی دیر سے ہو گی۔ ہمارا پروگرام اُس روز ایفل ٹاور جانے کا تھا۔ فری ہونے کے بعد نرجس بھابی اُن کی فرینڈ جینی اور میں باہر نکل آئے۔ جینی بہت اچھی ڈرائیونگ کرتی ہے۔ گاڑی میں عابدہ پروین کی آواز گونج رہی تھی۔ ”یار کو ہم نے جابجا دیکھا“ میرے اس شوق پر نرجس بھابی ہنستی رہیں۔ وہ عابدہ پروین کے بارے میں میرے جنون سے بخوبی واقف ہیں۔ صوفیانہ کلام اور پھر عابدہ پروین کی آواز...... زندگی کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے پھر ذہین شاہ تاجیؒ کا کلام...... میں کہیں دور بہت دور بابا فرید کی روہی کے ریگزاروں میں گم ہونے لگی۔ نرجس بھابی کی ہنسی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ 15 منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہم ایفل ٹاور میں تھے۔

خوب صورت طرزِ تعمیر کا شاہکار ایفل ٹاور۔ اِس کے بارے میں بتاتی چلوں کہ انقلاب فرانس کی صد سالہ تقاریب کے سلسلے میں جو بین الاقوامی نمائش 1889 میں منعقد کی گئی تھی، اُس کی یادگار کے طور پر ایفل ٹاور تعمیر کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں سات سو نقشے پیش کیے گئے۔ منصفین نے گستاوَ ایفل کے نقشے کو متفقہ طور پر کامیاب قرار دیا تھا اگرچہ اس کے خلاف تین سو اپیلیں دائر کی گئی تھیں۔ جن میں بعض اپیل کنندگان دنیائے آرکیٹکچر اور آرٹ کے عظیم نام تھے۔ اِس پر 1887 میں کام شروع کیا گیا اور مقررہ وقت یعنی 1889 میں مکمل کر دیا گیا۔ نقادوں نے اُسے وکٹورین اسٹرکچرل ایکسپریشنٹ کے تحت رکھا۔ جہاں تک اس کی اونچائی کا تعلق ہے، یہ 1,654 قدمچوں پر مشتمل عمارت 1930ء تک دنیا کی بلند ترین عمارت کہلائی جاتی رہی ہے۔ اس کو کسی کوہ پیما نے سر بھی کیا۔ اس پر سے پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ لگانے کا مظاہرہ بھی ہوا...... یہ ہے ایفل

ٹاور کی مختصر سی تاریخ۔

ہم لفٹ کے ذریعے تھرڈ اسٹوری تک گئے۔ پھر دریائے سینا کا نظارہ...... جینی کو ہنسی بہت آتی تھی۔ بات بات پر مسکرانا اور قہقہہ لگانا، اُس کی عادت ہے۔ زندگی سے بھرپور بہت پیاری لڑکی ہے......نرجس بھابی کو عفان اور ہادیہ کو اسکول سے لینے جانا تھا اس لیے ذرا جلدی گھر آ گئے۔ جینی گاڑی لے کر بچوں کو لینے چلی گئی تھی۔

ایفل ٹاور میں وقت بہت اچھا گزرا تھا۔ بہت تصویریں بنائیں۔ جرمنی کی طرح فرانس کی تاریخ بھی خاصی سنسنی خیز ہے اور خاصی دلچسپ بھی۔ فرانسیسی انقلاب تاریخ کا عظیم انقلاب، ایک پختہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ''عوامی انقلاب'' تھا، جو بادشاہت، مذہبی لوگوں اور اُمراء کے خلاف برپا کیا گیا۔ یہ جدید یورپ کا آغاز تھا۔ کیونکہ لفظ یورپ کی بجائے CHRISTEOM (مرکز عیسائیت) کا لفظ زیر استعمال رہا تھا۔

جزیرہ کورسیکا کا ایک پستہ قد سا ہی جو ٹھیک سے فرانچ زبان بھی نہیں بول سکتا تھا۔ اتنی بلندیوں تک پہنچے گا، یہ کس نے سوچا تھا۔ 1797 سے نپولین کا عروج شروع ہوا۔ دو سال بعد وہ ڈائرکٹری کے خاتمے کے بعد کنزل بنا۔ 1801 میں اس نے پوپ کے ساتھ معاہدہ کیا جو پیچھے کی طرف ایک قدم تھا۔ 1804 میں بادشاہت کا اعلان کیا اور خود سلطان بن گیا۔ جلد ہی اس نے اپنا سخت گیر ہدایت نامہ کوڈ نپولین نافذ کر کے انقلاب فرانس کے تمام ترقی پسند اقدامات کو رد کر دیا اور رجعت پسندی کو فروغ دیا اس کی فتوحات کا سلسلہ 1812 تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ جب اس نے روس پر حملہ کیا اور ناکام واپس آیا۔ 1815 میں نپولین کا دور ختم ہوا۔ اس نے یورپ پر ایک گہرا نقش چھوڑا۔

☆......☆

دوسرے دن بھی سکندر میٹنگ میں مصروف تھا۔ بزنس کنزرویشن تھی اس میں منظر اور اس نے شرکت کرنا تھی پھر سے میں تھی، نرجس بھابی اور جینی کی لاجواب ڈرائیونگ...... نرجس بھابی اور جینی نے مجھے بھرپور کمپنی دی۔ پیرس میں گزرے چھ دن دونوں میرے ساتھ رہیں۔ شانزے لیزے کی خوب صورتی...... مونا لیزا کی مسکراہٹ، دریائے سین کی کشش...... ہم تینوں نے ایک ساتھ محسوس کی۔ ان چھ دنوں میں سکندر بہت مصروف رہا تھا۔

دوسرے دن، ہم شام کے وقت ایک بار پھر ایفل ٹاور گئے۔ شام کے وقت اس کا رنگ ہی جُدا محسوس ہو رہا تھا۔ چاندی کی طرح چمکتا سفید پانی...... دودھیا روشنی اور گہرا سکوت ڈوبتے سورج کی کرنیں......اور ایفل ٹاور......سیاہ و سفید دُھند کا آمیزہ یہ کیسی کیفیت ہے؟ اس کیفیت کا تعلق اس ماحول اس فضا سے نہیں بلکہ میرے اندرون سے تھا۔

مجھے یونہی منظروں میں کھو جانے کی عادت ہے۔ ایک عالمِ محویت......ایک عالمِ خود فراموشی...... شدید سرد موسم...... جرمنی کی طرح پیرس میں بھی سردی اور برف باری کا موسم تھا۔ اس دن بھی ہم بہت دیر سے گھر آئے۔ ڈنر گھر پر کیا۔

فیس بک اوپن کیے کافی دن ہو گئے تھے۔ وہاں بہت سے پیغام منتظر تھے۔ ''سردی اور برف باری بہت ہے'' اپنا خیال رکھنا اس ایک جملے پر مجھے بے تحاشہ ہنسی آتی تھی۔ میں اپنی ذات سے منسلک لوگوں کی محبت کا قرض کبھی نہیں چکا سکتی۔ مخلص لوگ' دوست اور رشتے بہت کم لوگوں کے نصیب میں ہوتے ہیں اور میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ہر موڑ پر اچھے نیک اور مخلص احباب ملے۔ مجھے دوستوں کے حوالے سے کبھی کسی بُرے تجربے کا سامنا نہیں کرنا

پڑا۔ کیوٹ ہادیہ اور عفان کی آمد نے مجھے سوچوں کے بھنور سے نکالا۔ عفان سے تو پاکستان میں بھی میری اچھی خاصی دوستی تھی اس لیے اجنبیت حائل نہ ہو سکی جبکہ ہادیہ ذرا شرمیلی سی بچی تھی۔ اس سے ملاقات بھی پہلی بار ہو رہی تھی۔ بچے بڑی جلدی بے تکلف ہو جاتے ہیں مجھ سے......وہ دونوں کافی دیر بیٹھے رہے۔ مجھے نیند آنے لگی تو وہ چلے گئے۔

☆......☆

وقت کی کمی کے باعث پیرس میں ہم زیادہ گھوم پھر نہیں سکے لیکن اس محدود وقت میں بھی بہت کچھ دیکھ لیا۔ ''روسو'' فرانس کا معروف فلسفی اور انشاپرداز...... وہ روسو جس کی تحریر نگارشات، انقلاب فرانس کا محرک بنیں، وہ کیفے اور قہوہ خانہ بھی دیکھا جہاں وہ بیٹھا کرتا تھا۔ ''ہنری برگساں'' فرانس کے یہودی موسیقار کا بیٹا...... ماہرِ حیاتیات کی حیثیت سے ارتقائی مکتبہ فکر کا سب سے بڑا فلسفی اس کا مرتب فکری نظام حیویت (VITALISM) دوسرے ارتقائی فکری نظاموں کے درمیان ممتاز مرتبے کا حامل ہے۔ علامہ اقبال نے بھی زمانے کی تفہیم کے لیے برگساں کی اصطلاحات و تعبیرات سے جزوی استفادہ کیا ہے۔ فرانس میں اس سے ملاقات کے دوران علامہ اقبال نے جب اُسے ''لاتسبوا الدھر'' کے الفاظ سے شروع ہونے والی حدیث سنائی تو معذوری کے باوجود وہ اپنی کرسی سے اُچھل پڑا تھا۔ لامیر طینے اور ہیوگو جیسے باکمال لوگ جس فضا میں سانس لیا کرتے تھے' میں اس وقت وہاں تھی۔ فلسفے کی وہ پُراسرار فضا مجھ پر حاوی ہونے لگی تھی۔ میرا ذہن انقلاب فرانس سے پہلے والے زمانے میں پہنچ چکا تھا' جہاں وقت اپنی تقویم سے باہر حساب چکاتا ہے۔ راں بو، سینٹ جان پرس، پاسبو نیرودا اور دوسرے فرانسیسی شعراء کیا کمال کے فنکار تھے یہ سب......آرٹسٹ لیونارڈو...... جس نے مونا لیزا بنائی۔ روسو کی تحریروں کو فرانس میں وہی حیثیت حاصل ہے جو ایران میں ڈاکٹر علی شریعتی کی تحریروں کو حاصل ہے۔

☆......☆

دوسرے دن ہم نے فرانس سے چلے جانا تھا۔ سکندر کی میٹنگز ختم ہو چکی تھیں، پھر پاکستان سے بار بار آنے والے فون......سُو واپس تو جانا ہی تھا۔ ویزے کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا، بات تھی موسم کی شدت پسندی کی۔ اُس روز ہم نے ڈنر باہر کرنا تھا۔ عفان اور ہادیہ گھر پر تھے۔ منظر بھائی نرجس بھابی، جینی، سکندر اور میں...... ڈنر بہت خوشگوار ماحول میں کیا گیا۔ شاپنگ بھی مکمل ہو چکی تھی۔ صبح 10 بجے ہماری فلائٹ تھی۔ آرام کرنا بھی ضروری تھا، اس لیے جلدی گھر آ گئے۔ پیرس اور پاکستان کا ٹائم ڈفرنس تین گھنٹے کا ہے۔ ہم نے پاکستان کال کی، اپنی فلائٹ شیڈول بتایا۔ باقی سب سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ ایفل ٹاور کی چمکتی روشنیاں اور پیرس کی فلسفے سے معمور فضا مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں پُرسکون تھی مگر اندر کہیں اضطراب تھا جو بے چین کیے رکھتا ہے۔ پیرس میں گزری وہ آخری شام اور رات اپنے بطون میں گہری اداسیاں سمیٹے ہوئے تھیں۔ جانے کا دُکھ نہیں تھا۔ آئے ہی جانے کے لیے تھے۔ سامان کی پیکنگ ہو چکی تھی۔ میں نے پردے برابر کیے اور سو گئی۔

☆......☆

دوسری صبح خاصی ہنگامہ خیز تھی۔ عفان اور ہادیہ مجھ سے الوداعی ملاقات کے بعد سکول چلے گئے تھے۔ جینی نے بطور خاص میرے لیے آفس سے چھٹی کی تھی۔ منظر بھائی بھی گھر پر تھے۔ ناشتہ بھرپور قسم کا تھا، اوپر سے نرجس بھابی کی ہدایات ہمیں

ایئرپورٹ لے جانے کے لیے ڈرائیونگ منظر بھائی نے کرنی تھی۔ میں نے الوداعی نظروں سے اِردگرد دیکھا۔ باقی سب گاڑی کے پاس تھے، نرجس بھابی اور میں آخر میں نیچے آئے۔ میں گاڑی کے پاس آ کے کھڑی ہوگئی۔ ایک دم سکندر کا بلند ترین قہقہہ گونجا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''عاشی بی بی! اپنے لیے گاڑی کا دروازہ خود کھولیں۔ یہاں پر فضل نہیں ہے جو گاڑی کا دروازہ کھولے گا۔'' اچھا خاصا شرمندہ کر دیا مجھے...... پھر نرجس بھابی نے دروازہ کھولا۔ منظر بھائی کافی دیر ہنستے رہے۔ پچیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہم ایئرپورٹ پر تھے۔ پاسپورٹ اور ٹکٹ چیک کرنے کے بعد ہمیں بورڈنگ کارڈ مل گیا۔ چیک ان کاؤنٹر پر پی آئی اے کا اسٹاف کاغذات چیک کر رہا تھا۔ منظر بھائی، نرجس بھابی اور جینی لاؤنج میں آ گئے۔ طبیعت اُداس اور بوجھل تھی۔ پیرس کی فضاؤں میں خنکی تھی۔ یہاں سے دبئی کی فلائٹ تھی۔ سکندر اور میں ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھ گئے۔ پیرس کی ہواؤ......! خدا حافظ!

☆......☆

دبئی ایئرپورٹ پر خاصی گہما گہمی تھی۔ ہمارا اسٹے دبئی تھا۔ دوسرے دن 12 بجے اسلام آباد کی فلائٹ تھی۔ کراچی کی فلائٹ دستیاب نہیں تھی۔ پی آئی اے کی طرف سے رہائش کا انتظام تھا۔ رات بہت پُرسکون گزری...... دوسرے دن بارہ بجے ایک بار پھر سفر شروع ہوا۔ اب پی آئی اے کے سفر کی تفصیلات کیا بتائیں صاحب......! مختصر یہ کہ سکون و عافیت کے ساتھ اسلام آباد پہنچ گئے۔ آدھے گھنٹے آرام کے بعد...... منڈی یزمان بہاولپور ایئرپورٹ کی فلائٹ میں سوار ہوگئے۔ اسلام آباد کا موسم بھی سرد تھا لیکن پیرس اور جرمنی کے مقابلے میں یہ سردی کچھ بھی نہیں تھی۔ مسلسل سفر سے بے تحاشا تھکن ہو رہی تھی۔ اسلام آباد پہنچ کے تمام احباب کو ''سلام پاکستان'' کے پیغامات ارسال کیے۔ سب کی طرف سے ویلکم بیک کے جوابات آئے شگفتہ آپی، کاشی بھائی، ناصر انکل، خالدہ شفق اور بہت سے پُرخلوص لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

پانچ بجے ہم بہاولپور ایئرپورٹ پر تھے۔ شام ڈھل رہی تھی۔ منڈی یزمان والا بے آسرا ایئرپورٹ گہما گہمی سے دور تھا۔ ہم ٹرمینل کی عمارت سے باہر آئے تو فضل (ڈرائیور) منتظر تھا۔ ہمارا گارڈ مظفر بھی اس کے ہمراہ تھا۔ سامان آنے تک میں اپنی اسلام آباد سے بہاولپور کی ہمسفر فریال سے گپ شپ کرتی رہی۔ کنویئر بیلٹ پر سامان آنا شروع ہو گیا تھا۔ مظفر نے سامان گاڑی میں رکھا اور جب اُس نے میرے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا تو سکندر کو ایک بار پھر ہنسی آ گئی۔ وہی بات (پیرس والی) اس نے فضل کو بتائی تو وہ بھی کھل کے ہنسا۔

ہماری لینڈ کروزر بہاولپور روڈ پر رواں دواں ہے۔ میرا پیارا پاکستان...... میرا سوہنا ملتان...... اور میرا سائبان مجھے تحفظ فراہم کرنے والا پیارا گھر...... کس قدر طمانیت محسوس ہو رہی ہے۔ بی بی جان کی محبت، جنت کا پُرخلوص انداز...... جنت سے میرا رشتہ بہت عجیب ہے...... بچپن میں...... مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا تھا۔ جنت کو اندھیرے میں سونے کی عادت تھی۔ اُس نے میری خاطر روشنی سے کمپرومائز کر لیا۔ بچپن گزر گیا تو مجھے روشنیوں سے وحشت ہو گئی۔ جنت نے میری خاطر پھر اندھیروں سے دوستی کر لی۔ اندھیرے سے اُجالے اور اُجالے سے اندھیرے تک کا سفر اس نے میرے لیے کیا!!

''برف زار'' کا سفر اختتام پذیر ہوا۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆......☆

یادوں کے اوراق

رخسانہ سہام مرزا



رخسانہ سہام مرزا

یادوں کے اوراق

حجاب عباسی کا خیال

گزرتا وقت بدلتا ہے خال و خد سب کے
یہ ساری عمر کا سامان تھوڑی ہوتا ہے

ی خوش رنگ یادوں سے جڑی رخسانہ سہام مرزا کی ہفت رنگ آپ بیتی

آپ کہیں گے کہ ''یادوں کے اوراق'' کی صورت اپنا سفر زندگی سناتے ہوئے میں یکا یک ایک ناصح کیسے بن گئی؟ تو جواب میں بس یہی کہوں گی کہ یہ تو بس میرے دل کی وہ آواز ہے جو یقیناً میری عمر کے ہر انسان کے دل سے کبھی نہ کبھی تو مکالمہ کرتی ہوگی، ویسے ''یادوں کے اوراق'' میں اصل یاد تو میرا بچپن اور لڑکپن ہی ہے، اس کے بعد تو پھر زندگی یوں گزری جیسے وہ کسی سلیمانی قالین پر سوار ہو اور ہوا کے دوش پر برسوں کا سفر لمحوں میں گزر جائے مگر اب لگتا ہے کہ سفر کی رفتار کم ہوگئی ہے۔ بقول شاعر،

کاوکاوِ سخت جانی ہائے' تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا' شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

آیئے ''یادوں کے اوراق'' کے یہ ''حال'' والی باتوں کے صفحات چھوڑ کر پھر ماضی کی جانب چلتے ہیں اور میں آپ کو طاہرہ سے ملواتی ہوں۔ وہ بھی مجھ سے کچھ کم نہ تھی...... ایک دن طاہرہ نے کہا۔ ''آج میں زردہ پکاؤں گی۔'' خیر زردہ پکا مگر اس میں طاہرہ کی محنت کم اور اُس کی بڑی بہن کی محنت اور کمال زیادہ تھا لیکن طاہرہ صاحبہ بہت اکڑ اور غرور سے فرما رہی تھیں کہ یہ اُن کا کمال ہے۔ ہم سب طاہرہ سے بہت متاثر ہو رہے تھے کہ انہوں نے زردہ پکایا ہے۔ بہرحال ہم سب زردہ کھانے کے لیے جمع ہوئے تھے اور زردہ آنے کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک طاہرہ کے شور کرنے کی آواز آئی تھی اور پھر جو ہم نے نظارہ دیکھا تھا' وہ یہ تھا کہ زردے کی خالی دیگچی صحن میں لڑھک رہی تھی جبکہ زردے والے سارے چاول صحن میں بکھر گئے تھے۔ اس صورتِ حال میں ہم سب پریشان تھے۔ طاہرہ کی چیخ پکار' بڑی باجی کا غصہ اور اُن کے خانساماں غفور کی مسکراہٹ!...... اور پھر پتہ یہ چلا تھا کہ خانساماں غفور چپکے سے زردے کی

دیگچی میں ہاتھ ڈالے زردہ نکال کر کھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ...... یہ منظر طاہرہ نے دیکھ لیا تھا اور بس پھر یہ ہنگامہ ہو گیا تھا اور یوں ہم سب زردے کی دعوت اڑائے بغیر اپنے اپنے گھر بھاگ گئے تھے۔ ہماری زندگی کے اُس سنہری دور میں اسی طرح کی کارروائیاں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔

.......•.......•.......•

گزرتے دنوں کے ساتھ ابا کو کچھ اچھی postings بھی ملی تھیں جیسے اوکاڑہ والی پوسٹنگ اور ہم لوگ وہاں اُن کے ساتھ تھے...... ایک بہت خوبصورت کالونی میں بہت پیارا گھر ملا تھا۔ انجیر کا ایک درخت اس گھر کی پوری چھت پر پھیلا ہوا تھا۔ لان میں آم کے کئی درخت لگے تھے۔ اکثر گھروں پر انگور کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ہم وہاں بھی سارا وقت درختوں پر چڑھتے اور شرارتیں کرتے۔ میری چھوٹی خالہ بھی ہمارے ساتھ ہی ہوتی تھیں۔

ایک دن امی نے ہماری شرارتوں سے تنگ آ کر گویا ایک حکم نامہ جاری کیا تھا...... ''بھئی' ان کو کسی اسکول میں ڈالو۔'' لہٰذا ہم دونوں کو اسکول میں داخلے کے لیے بھیجا گیا۔ وہ کون سا اسکول تھا' کون لے گیا تھا' یہ بالکل یاد نہیں' بس اتنا یاد ہے کہ میں اور خالہ ایک ہال میں بنچ پر بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہاں ہم سے عمر میں کافی بڑی لڑکیوں کی آمد شروع ہوئی تھی اور پھر پتہ نہیں' وہ کون سا کھیل تھا جو انہوں نے کھیلنا شروع کیا تھا' شاید آپس میں کشتیاں لڑنے لگی تھیں اور میں نے خالہ کے ساتھ چیک کے خوف سے رونا شروع کر دیا تھا۔ اب آپ اسے اتفاق سمجھیں یا پھر ہماری دُعا کہ...... اوکاڑہ میں وہ ہمارا پہلا اور آخری اسکول کا دن ثابت ہوا تھا کیونکہ ابا کی پوسٹنگ جہلم ہو گئی تھی' یوں میں اور خالہ کراچی آ گئے تھے۔ میرے بچپن کی ان یادوں میں وہ دن بھی شامل ہیں جب میرے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے تھے اور نسیم کے بھائی مجھے دندبوڑی کہہ کر تنگ کرتے تھے اور پھر یوں ہوا تھا کہ میرے بچپن کی اُن دوستوں میں سے طاہرہ علی گڑھ اپنے والدین کے پاس اور نسیم کالونی سے کہیں اور چلی گئی اور ہم لوگ شرف آباد شفٹ ہو گئے تھے۔

زندگی کی آگے جاتی ہوئی گاڑی کے ساتھ علاقہ بدل گیا' مصروفیات بدل گئیں' میری پڑھائی باقاعدہ شروع ہو گئی۔ ''خاتونِ پاکستان'' ہمارے گھر کے قریب تھا' محلے سے دو لڑکیاں اور بھی جاتی تھیں۔ ہم تینوں مل کر جاتے تھے۔ ہماری عادت یہ تھی کہ ہم ''خاتونِ پاکستان'' کے گیٹ کی بجائے اُس کی چھوٹی سی دیوار پھاند کر اندر پہنچ جاتے اور پھر واپس بھی اِسی راستے سے آتے تھے۔

ایک دن ہم تینوں گھر واپسی کے لیے ''خاتونِ پاکستان'' کی دیوار پھاند کر جیسے ہی سڑک پر اترے' ایک گاڑی تیزی سے آ کر ہمارے سامنے رکی تھی اور اُس میں بیٹھے ہوئے صاحب نے ڈانٹ کر کہا تھا۔ ''اچھا' کلاس چھوڑ کر کہیں جا رہی ہو؟''...... ہم تینوں نے یک زبان ہو کر کہا تھا۔ ''ہم تو گھر جا رہے ہیں' وہ سامنے ہمارا گھر ہے۔''

وہ صاحب فوراً ہی بولے تھے۔ ''اچھا' ٹھیک ہے' سیدھے گھر ہی جانا ورنہ گھر آ کر بتا دوں گا کہ......'' اور چلتے بنے تھے۔ اب ہم تینوں نے ایک دوسرے کو ایسے سوالیہ نظر سے دیکھا تھا کہ یہ صاحب آخر کس کے عزیز تھے؟ کیونکہ اُن کی باتوں کے جواب میں ہم تینوں کی خاموشی کے پیچھے ہم تینوں کا ہی یہ خیال تھا کہ وہ ہم میں سے کسی کے رشتے دار ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ صاحب ہم تینوں کو بے وقوف بنا گئے تھے' سو ہم خود پر ہنس پڑے تھے۔

میں نے اسکول سے کالج تک کا دور ''خاتون ...ستان'' میں ہی دیکھا' بڑا اچھا وقت گزرا۔ کالج ...ے اردگرد بہت بڑی جگہ تھی اور وہاں ڈھیروں بیر ...ے درخت موجود تھے۔ ہم لوگ روز وہاں بیر توڑنے ...تے تھے جبکہ وہاں موجود چوکیدار نے ہمیں وہاں ...نے سے منع کرتے ہوئے بہت بار کہا تھا۔ ''تم ...ں اُدھر مت جاؤ' وہاں بیری میں سانپ ہوتا ہے۔ ...لوگ بیر کھاؤ گی' سانپ تم کو کھا جائے گا......''

ہم لوگ چوکیدار کی بات ایک کان سے سنتے اور ...وسرے کان سے اڑا دیتے تھے اور پھر ایک روز ...وکیدار نے ایک سانپ مار کر اسے ڈنڈی پر ڈال ...ے ساری کلاسوں میں اس خیال سے گھمایا تھا کہ ...اید ہم لوگ ڈر جائیں گے...... مگر کیا کریں' میٹھے ...کٹے بیروں کا لالچ ڈر پر غالب آ جاتا تھا اور ہم پھر ...ری کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ بے چارہ چوکیدار ہم ...وں کو دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگاتا تھا اور ہاں! ''خاتونِ پاکستان'' ہی میں ہم نے پہلی بار مادرِ ملت ...ں فاطمہ جناح کو دیکھا تھا۔

.......•.......•.......•.......•

انٹر کے امتحانوں کے بعد گرمیوں کی چھٹیوں ...ں زبیدہ' میں 'انور' چچا کے پاس کوئٹہ گھومنے گئے ...تھے۔ میرے یہ چچا بھی لینڈ کسٹمز میں تھے۔ بروری ...ڈ پر ان کا بڑا ہی خوبصورت گھر تھا۔ ہماری تین ...چازاد بہنیں ہیں۔ ہم لوگوں نے وہاں بڑا اچھا وقت ...زارا۔ آج کے شورش زدہ صوبے بلوچستان اور شہر ...ئٹہ کے مقابلے میں ماضی کا کوئٹہ نہایت پُرامن اور ...بصورت شہر تھا۔ گھر کے ساتھ ایک بہت بڑی جگہ ...غ کی شکل میں تھی۔ پھول بادشاہ جو اس باغ کے ...ی تھے' انہوں نے سبزیاں لگائی ہوئی تھیں۔ ایک ...ار کے ساتھ کچھ ٹہنی جیسی سوکھی لکڑیاں سی تھیں جیسے ...ی بیل کو چڑھانے کے لیے لگائی گئی ہوں۔ ہم لوگ وہ لکڑیاں توڑتے تو پھول بادشاہ کہتے۔ ''بی بی......! یہ انگور کی بیل ہے۔ تھوڑے دنوں میں یہاں پہلے پتے اور پھر انگور ہی انگور بھر جائیں گے۔''

اُن کی باتیں سن کر ہمیں یوں لگتا جیسے وہ دیوانے ہو گئے ہوں' بھلا ان سوکھی لکڑیوں پر پتے آئیں گے!...... لیکن ایک مہینے کے اندر وہ سوکھی لکڑیاں پتوں سے بھر گئیں اور اُن میں انگور کے خوشے لٹکنے لگے جو کہ ابھی کچے تھے۔ ہم لوگ نمک مرچ کے ساتھ وہ سارے کچے انگور کھا گئے۔ وہاں مٹر لگے تھے' وہ بھی باقی نہ رہے' کچے پستے توڑ کر پھینکتے رہے' اخروٹ بھی کچے توڑے اور شہتوت تو بہت کھائے کہ اس کے علاوہ ہم سب کو اور کام کیا تھا...... کوئٹہ کے مشہور کباب جن کو لال کبابی کہتے تھے' ہم اکثر وہ کباب کھانے پہنچ جاتے تھے اور کھانے سے فرصت والے وقت میں کوئٹہ کا مشہورِ زمانہ سینی ٹوریم ہی نہیں دیکھا۔ زیارت میں بھی کچھ دن گزارے جہاں قائداعظم نے اپنے آخری ایام گزارے تھے' وہ خاص کمرہ دیکھا جہاں اُن کی چپلیں اور عینک رکھی تھی۔

ماضی کے کوئٹہ کی یادیں اور باتیں بہت حسین ہیں مگر اب تو کوئٹہ کے نام کے ساتھ قتل غارت گری کا بازار گرم ہے۔ یہ حالات دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے مگر ہم کیا کر سکتے ہیں' صرف دُعا کا سہارا لیتے ہیں اور کوئٹہ کی ماضی والی خوبصورت یادوں کو دل کے آنگن میں سجائے رکھتے ہیں' وہاں کی زندگی' زندہ دل لوگ' اُن کے محبت بھرے رویئے اور عزت و مان سے بات کرنا' میرا دل کہتا ہے کہ آج کی اس قتل و غارت کے پیچھے میرے پیارے کوئٹہ کے لوگ نہیں' یقیناً کوئی اور ہے جو ہمارے پیارے شہر کا اور لوگوں کا دشمن ہے۔ اچھے لوگوں کو نظر لگ جاتی ہے...... یہ ہی کوئٹہ اور وہاں کے لوگوں کے ساتھ ہوا ہے۔

.......•.......•.......•

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد کالج کھل گیا' زندگی پھر پرانی ڈگر پر آ گئی تھی......رشتوں کی سنہری ڈور سے بندھی ہم چچازاد' تایازاد بہنوں کی تعداد تقریباً بائیس کے قریب تھی۔ اُن کے رشتوں کا سلسلہ اور شادیاں بھی زندگی کا ایک رونق میلہ ہیں۔ اُس زمانے میں زیادہ تر شادیاں گھر میں ہی ہوا کرتی تھیں۔ اُن شادیوں کی رونق اور مزہ بہت ہوتا تھا۔ ہفتوں پہلے رشتے دار بہنیں اور سہیلیاں وغیرہ جمع ہوتیں' مہندی لگتی' گانا بجانا ڈھول پر ہوتا' چائے کھانا چلتا' اس خوشی میں سارے بزرگ بھی شامل ہوتے اور ایک چوکی خواتین سے سجی ہوتی۔ وہ گانوں کے دوران بیچ بیچ میں امیر خسرو کی شاعری کی فرمائش کرتیں۔ یہ ساری محبتیں ایک محفل کی صورت بڑے ہال نما کمرے میں سجی ہوتیں۔ وہ محبت' عزت اور دُلار شاید ہمیں دنیا کے کسی حصے میں اَب نہیں مل سکتا۔ ''ارے بٹیا! دوپٹہ اٹھاؤ......بال سمیٹ کر باندھو۔''

''ذرا چونے میں پانی ڈال کر لاؤ...... یہ پان دھوکر دے دو۔'' بزرگوں کی یہ آوازیں جانے کہاں کھوگئیں؟ جانے کہاں چلی گئیں؟ خیر' یہ تو میرا اپنا دکھ ہے!!

.......•.......•.......•

اَب میرے کانوں میں بھی کچھ ایسی آوازیں آنے لگی تھیں جنہیں سُن کر یہ لگتا تھا کہ شاید اَب میری باری بھی آنے والی تھی۔ کبھی چچی' پھوپی یا خالہ کچھ موہوم سی بات چیت کرتی نظر آتیں لیکن سمجھنے والے اَب بچے نہیں رہے تھے...... اُن دنوں ہمارے اکثر بزرگ مجھے دیکھ کر کہتے۔ ''بس ناک ذرا!'' گویا یہ میری ناک کا ذکر زیادہ ہونے لگا تھا اور بس پھر مجھے اپنی ناک کچھ زیادہ ہی عزیز ہوگئی تھی...... ویسے بھی جس کا زیادہ ذکر ہو' وہ ہی من کو بھا جاتا ہے اور پھر بس اسی ناک کے ذکر کے ساتھ ہی میں نے B.A.Part I کا امتحان دے دیا اور چھٹیاں ہوگئیں۔ اسی دوران میں مجھے اچانک اپنی ناک چھدوانے کا خیال آیا تھا کیونکہ میں اس مسئلے ''ناک'' پر حساس جو بہت ہوگئی تھی۔ میں نے اپنی ناک چھدوالی تھی مگر ابا کو میرا یہ عمل پسند نہیں آیا تھا اور انہوں نے صرف اتنا کہا تھا۔

''ارے بیٹا! یہ کیا کیا؟'' مگر وہ میرے اندر پکتی کھچڑی سے ناواقف تھے۔ انہیں تو بس یہ سوچ کر دکھ ہوا تھا کہ میری بیٹی کتنی تکلیف سے گزری ہوگی۔ اُس وقت ابا کی پوسٹنگ گوادر تھی۔ وہ تو چھٹی گزار کر اُدھر چلے گئے مگر اِدھر میری ناک میں سیپٹک ہوگیا اور یوں ناک نے میری ناک میں نکیل ڈال دی تھی۔ میرے بہنوئی سراج بھائی ڈاکٹر تھے' وہ کسی کام سے ہمارے گھر آئے تھے تو میں نے اُن کو اپنی ناک والی تکلیف بتائی تھی۔ جواباً وہ بولے تھے۔ ''تم میرے کلینک پر آ جانا' تمہارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔''

دوسرے دن شام کو میں اپنی پھوپی کے ساتھ کلینک پہنچ گئی تھی۔ سراج بھائی نے ٹریٹ منٹ کے علاوہ کچھ دوائیں بھی دی تھیں اور پھر جب ہم واپس گھر آنے کے لیے کلینک سے باہر نکلے تھے' سراج بھائی نے کہا تھا۔ ''میں آپ دونوں کو گھر چھوڑ دیتا ہوں۔'' اور پھر وہاں موجود ایک صاحب سے بولے تھے۔ ''تم ذرا کلینک دیکھ لو' میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔''

وہ صاحب جواباً بولے تھے۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ پریشان نہ ہوں' میں انہیں چھوڑ دیتا ہوں۔'' خیر' انہوں نے ہمیں گھر چھوڑ دیا تھا اور گھر آ کر میں ایک بار پھر ناک کی پریشانی میں پڑ گئی تھی کیونکہ تکلیف بہت تھی۔

دوسرے دن شام کو میرے بہنوئی پھر آئے اور مجھ سے پوچھا۔ ''اب تکلیف کیسی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اب ٹھیک ہے۔''

بس اس کے بعد وہ چلے گئے لیکن وہ جاتے جاتے امی اور پھوپی سے جو کہہ گئے' اس کا بھانڈہ دو دن کے بعد پھوٹا اور وہ یہ کہ جو محترم ہم کو ہمارے گھر چھوڑنے آئے تھے' وہ مجھے اپنے گھر لے جاکر بسانے کی خواہش کر بیٹھے تھے۔

اس کے بعد تو گھر میں کافی ہلچل نظر آنے لگی تھی۔ کبھی میرے گھر والے کہیں جا رہے ہیں' کبھی میری تایازاد بہنوں کی آمد ہو رہی ہے۔ اب تو میرے حوالے سے گھر میں بات چیت بھی ذرا اونچے لہجے میں ہونے لگی تھی۔ ہمارا خاندان اللہ کے کرم سے کافی بڑا تھا اور ہے۔ سب نے اپنے تعلقات اور معلومات کے گھوڑے دوڑا دیئے تھے اور اُن صاحب یعنی سہام مرزا کی فائل مکمل ہوکر o.k. ہوگئی تھی۔ میری اکثر شادیوں' دعوتوں اور کسی نہ کسی موقع پر بھائیوں' بہنویوں کے ملنے والوں سے سلام دُعا ہوجاتی تھی مگر یوں رشتہ آ جانا!!......سہام' سراج بھائی کے بہت اچھے دوستوں میں سے تھے۔ اُن سے ملنے کا اتفاق صرف دو منٹ کی ڈرائیو کی صورت ہوا تھا' نہ تو ان کی شکل' نا ہی حلیہ یاد تھا مگر دل نے کہا کہ یہ بڑوں کا فیصلہ ہے' اچھا ہی ہوگا اور یوں پہلی ربیع الاول کو میری سہام سے منگنی ہوگئی جبکہ شادی کی تاریخ ۱۹ اکتوبر قرار پائی تھی۔

شادی کی تیاری کے دوران میں سہام کی والدہ اور بھابی بھی آئیں۔ سہام بھی آتے رہے تھے لیکن میرا سامنا کبھی نہ ہوا تھا۔ ہمارے خاندان میں جو فیصلے اور کام کیے جاتے' ان میں خواتین کا حصہ زیادہ ہوتا تھا۔ شادی سے پندرہ دن پہلے ابا چھٹی لے کر آئے تھے۔ کام تو سارا تمام ہو چکا تھا' بس کارڈز چھپوانے تھے' وہ کام انہوں نے مکمل کیا تھا۔ آپ یقین کریں' نہ مجھے اپنے کپڑوں کا پتہ تھا کہ کیا بنائے گئے' نا زیور کا' بس مجھے اتنا معلوم تھا کہ میری شادی ہو رہی ہے' جس سے ہو رہی ہے' وہ کیسا ہے؟ میں تو یہ بھی نہیں جانتی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ آپ یہ بات پڑھ کر کہیں کہ ایسا بھی کیا تغافل کہ گاڑی میں سفر بھی کرلیا اور جانتے بھی نہیں!......تو آپ یقین کریں' اُس وقت میں اتنی تکلیف میں تھی کہ دوپٹے میں اپنا منہ چھپایا ہوا تھا کیونکہ سیپٹک صاف کرنے میں گویا جان نکل گئی تھی۔ گھر پر گاڑی رکتے ہی میں دروازہ کھول کر تیزی سے گھر کے اندر دوڑ گئی تھی' شاید پھوپی نے صاحبِ کار کو شکریہ کہا ہو۔ خیر' یہ معاملہ اپنی جگہ' اس رشتے کے حوالے سے مجھے اتنا بھروسا تھا کہ ہمارے بڑے کوئی غلط فیصلہ نہیں کرسکتے' آگے میرے نصیب کی بات تھی۔ بات بڑوں کی نکلی ہے تو یہ بھی بتا دوں کہ ہمارے گھر والے بڑے صاف گو اور تن من دھن سے سچے ہوتے تھے۔ اس کی ایک بہت چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ میری شادی کے موقع پر میری عزیز از جان بڑی پھوپی نے سہام سے کہا تھا۔ ''دیکھ بٹیا! میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ یہ مت سمجھنا کہ تم کوئی بہت سلیقہ مند' کھانے پکانے میں ماہر لڑکی سے شادی کر رہے ہو۔''

جواباً سہام نے کہا تھا۔ ''وہ گھر میں اکیلی رہے گی' بس اتنا بتا دیجیے کہ اگر میں دیر سے گھر جاؤں یا کچھ اور وجہ ہونے کی صورت میں وہ انڈہ تو تل لے گی؟''

مجھے نہیں معلوم کہ پھوپی نے جواباً کیا کہا تھا لیکن پھوپی کے سچ کا اتنا اثر ضرور ہوا تھا کہ سہام نے شادی سے پہلے ایک بہت اچھا خانساماں رکھ لیا تھا جو کشمیری تھا۔ وہ نا صرف بہترین کھانا پکاتا تھا' پورے گھر کا خیال کرتا تھا اور صبح سہام کے کپڑے بھی تیار

کرتا تھا' مزید یہ کہ مہمان نوازی میں بھی یکتا تھا۔

میری ماں کے گھر کے خانساماں بھی نہایت اچھے اور بہت پرانے بھی تھے اور پرانے زمانے میں تو پرانے کام کرنے والے بالکل گھر کے فرد کی طرح ہو جاتے تھے لیکن وہ خانساماں ہم سے خوش نہیں رہتے تھے اور اپنی ناخوشی کا اظہار اکثر یوں کرتے تھے۔

''بٹیا......! کبھی ایک روٹی تو پکا لیا کرو۔ دیکھو' اچھی روٹی پکانا خاصا مشکل کام ہے۔ دیکھو' روٹی کو پھولنا ضرور چاہیے۔'' وہ اور بھی جانے کیا کیا کہتے تھے مگر میں نے اُن کی کبھی ایک نہ سنی تھی اور جب میری شادی کے دن قریب آنے لگے تھے تو اُن کا یہ اصرار مزید بڑھ گیا تھا مگر میں تو میں تھی' سو وہ میری ڈھٹائی دیکھ کر کہتے تھے۔ ''ہمارا کیا جاتا ہے؟ گھر والوں کی ہی سُبکی ہوگی۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ گھر والوں پر کوئی بات نہ آئے۔'' جواباً میں چڑ کر کہتی تھی۔ ''ہم کھانا پکانے تھوڑی جا رہے ہیں امیر حسن! (یہ ہمارے خانساماں کا نام تھا۔) اگر کسی کو اچھے کھانا کھانے ہیں تو وہ آپ کو ساتھ لے جائے۔''

''اچھا' یہاں سے جاؤ' ہمارا دماغ نہ کھاؤ' جب پڑے گی تو پتہ چلے گا۔'' امیر حسن مزید ناراضگی سے کہتے۔

''پتہ چلنے دیجیے ہمیں' آپ کو کیا؟'' میری اس بات کے جواب میں وہ باورچی خانہ چھوڑ کر باہر جاتے ہوئے کہتے تھے۔ ''ہاں! ہم کو کیا' ہم آپ کے اپنے تھوڑی ہیں مگر ہم نے جن کا نمک کھایا ہے' اُن کا خیال ہے۔ اب آپ کو فکر نہیں تو ہمیں کیا!''

امیر حسن سے میرا یہ مکالمہ شادی سے ایک ہفتہ پہلے تک ہوتا رہا تھا۔ وہ ہار گئے تھے اور میں جیت گئی تھی کہ ہمارے باورچی خانے کے خوش نصیب توے کے ماتھے کا جھومر' میرے ہاتھ کی بنائی ہوئی روٹی نہ بنی تھی۔

.......•.......•.......•

مانجھے کی رسم بڑی حسین ہوتی ہے۔ اُس وقت مہندی کا رواج نہیں تھا' بس مانجھے کی رسم ہوتی تھی۔ اپنی تایا اور چچازاد بڑی بہنوں کی شادیوں پر ہونے والی یہ رسم ہمیں بہت اچھی لگا کرتی تھی۔ چچی' پھوپی' خالہ یا بڑی بہنوں میں سے کوئی مانجھے کا جوڑا لاتا تھا۔ اُس دن خاندان کے زیادہ تر لوگ سرِ شام آنے لگتے' کوئی مٹھائی کے ڈبے لاتا' کوئی پھولوں کے گجرے اور کچھ لوگ کھانے کی مختلف چیزیں لے کر آتے اور پھر مغرب کی نماز کے بعد یہ رسم ہوتی تھی۔

میرا مانجھے کا جوڑا میری تایازاد بہن صغریٰ باجی بہنوئی اکرم بھائی لے کر آئے تھے۔ پیلے رنگ کا خوبصورت جوڑا' چوڑیاں' پیلے رنگ کا چٹیلا' پیلے اور ہرے رنگ کا کنگنا' پیلی چادر' گاؤ تکیہ زرد رنگ کا اور امام ضامن کے علاوہ مٹھائی' یہ سب دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ واقعی اَب تو میری شادی ہو رہی ہے۔ خیر' میں نے وہ جوڑا پہنا' چوکی پر پیلی چادر اور گاؤ تکیہ رکھا گیا' میں اُس پر بیٹھ گئی تو بجیا (فاطمہ ثریا بجیا) نے امام ضامن باندھا تھا اور جب کسی نے کنگنا پہنایا تو اُس لمحے اچانک میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے پھر تو میں نے سب ہی کو آبدیدہ دیکھا تھا۔ میرے بہنوئی اکرم بھائی ماحول کو اداسی سے بچانے کے لیے ہنسی مذاق کرتے رہے تھے لیکن دل پر ایک عجیب اداسی کا ڈیرہ تھا۔ ایسے میں ہر طرف سے میرے کانوں میں آوازیں آ رہی تھیں۔ ''اللہ نصیب اچھا کرے! حسن کے گھر کی پہلی خوشی ہے۔'' ...... ''اللہ مہربان رہے' خوشیاں ہی خوشیاں ملیں۔'' لیکن اتنی دُعاؤں کے باوجود جیسے دل میں کہیں سے درد کی ایک لہر سی اٹھتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ ماں باپ کے گھر کے سارے سکھوں اور محبتوں کا احساس اُس وقت بہت زیادہ ہوتا ہے جب لڑکی کی سسرال رخصتی ہونے والی ہو۔ میرا بھی ایسا ہی حال تھا' اُس وقت میرے پاس اگلی منزل کا کوئی تصور نہیں تھا' بس یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اپنا گھر اجنبی ہو گیا ہو' سب مجھ سے مہمان کی طرح بات کر رہے تھے۔ بزرگوں کا ڈھیروں پیار' ہری بھری دُعاؤں کے ساتھ صرف مجھے ہی نہیں' امی اور ابا کو بھی مل رہا تھا۔ ماحول رنگا رنگ پھولوں اور مٹھائیوں سے انتہائی رنگین تھا۔ مجھے امام ضامن اتنے ملے تھے کہ میرا ہاتھ بھر گیا تھا۔ چائے' کھانا' گانا بجانا سب تھا مگر پتہ نہیں کیوں یہ سب کچھ مجھے ایک اداسی کے رنگ میں رنگا نظر آ رہا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ پہلے بھی دیکھا تھا اور بہت خوش ہوتے دیکھا تھا۔ مٹھائی کھاتے' دوڑ کر کام کرتے' ڈھول بجنا شروع ہوتا تو پاس بیٹھ کر تالیاں بجاتے لیکن میرے مانجھے والا دن تو دوسری بہنوں کے مانجھے والی رسم سے الگ تھا' شاید کیا' یقیناً' اُن کو بھی اپنے اپنے دن ایسا ہی محسوس ہوا ہوگا۔

شادی سے ایک دن پہلے تک یونہی رونق لگی ہوئی تھی' ہر کوئی میرا بہت زیادہ خیال رکھ رہا تھا۔ میرے وہ بڑے سارے رشتے دار جو مجھے اکثر و بیشتر کاہلی کا طعنہ دیتے تھے' میرے کام نہ کرنے پر کہتے تھے' اس کو کام کی عادت ڈالو ورنہ بہت پچھتائے گی' مجھے بال بنانے کے طریقے بتاتے ہوئے میرے بالوں کو چڑیا کا گھونسلہ قرار دیتے تھے۔ پانی دیتے وقت مجھے سیدھے ہاتھ کے استعمال کی نصیحت کرتے تھے۔ اُن سب کے لہجے بہت میٹھے ہو گئے تھے اور پھر شادی کا دن آ گیا تھا اور گزر بھی گیا تھا۔

.......•.......•.......•

سہام کے ساتھ میری زندگی کا نیا سفر اتنا اچھا تھا کہ میں واقعی اپنا گھر بھولنے لگی تھی اور آخر بھول ہی گئی تھی۔ کبھی کبھی مجھے گھر والوں کی اپنی شادی سے پہلے والی سوچ اور پریشانی کا خیال آتا تھا تو سوچتی تھی کہ وہ کیوں پریشان تھے؟...... لیکن جب بعد میں' بہت بعد میں خود اپنی بیٹیوں کی شادی کا وقت آیا تو احساس ہوا کہ میرے ماں باپ کی پریشانی جائز تھی۔ میں بھی اُسی سوچ اور کرب میں مبتلا ہوئی کہ اللہ بیٹی کا نصیب اچھا کرے۔

سہام کا حلقۂ احباب بہت بڑا تھا۔ روز دعوتیں ہوتی تھیں۔ ہمارا خاندان بھی بڑا تھا' وہاں بھی دعوتیں ہوتی رہیں۔ زندگی بہت مصروف ہو گئی تھی۔ اِن دعوتوں کی وجہ سے نئے کپڑے اور زیور جان سے لگے رہتے تھے جبکہ میری ساس تو یہ چاہتی تھیں کہ میں گھر میں ہی بنی رہوں۔ گھر کے کام کاج کا کوئی مسئلہ اس لیے نہیں تھا کہ ہمارا خانساماں جس کا نام مشتاق تھا' انتہائی محنتی اور ذمے دار تھا' سو مجھے تو پتہ ہی نہیں لگا تھا کہ زندگی میں کوئی بدلاؤ آ گیا ہے۔ میں بہت خوش تھی مگر کہتے ہیں نا کہ اکثر خوشی کے دامن میں کوئی دکھ بھی چھپا ہوتا ہے اور میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔

میرے ابا شادی کے ایک ہفتہ کے بعد واپس اپنی جاب پر چلے گئے تھے۔ گھر اپنی پرانی ڈگر پر آ گیا تھا۔ اب اکثر شام کو میرا سہام کے ساتھ امی کے گھر کا ایک چکر لگتا تھا کہ اچانک ہی میرے ساتھ ایک عجیب مسئلہ ہو گیا تھا' بس میرے خیال میں یہ منظر رہنے لگا تھا کہ لوگ میرے گھر پر جمع ہیں' سفید چادریں بچھی ہوئی ہیں۔ سہام کی گاڑی جیسے ہی میرے گھر کی طرف مڑتی تو میرا دل گھبرانے لگتا۔ میں سہام سے کہتی۔ ''کچھ ہونے والا ہے۔'' جواب میں سہام مجھے سمجھاتے ہوئے کہتے تھے۔ ''کچھ نہیں ہونے والا ہے' تم پاگل ہو رہی ہو۔'' مگر میرا دل نہ

مانتا تھا اور پھر اُن ہی دنوں ابا کی کراچی پوسٹنگ ہوگئی تھی۔

شادی کے حوالے سے میں بہت خوش قسمت لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ مجھے محبت کرنے والی ساس ملی تھیں پھر سہام بھی میرا انتہائی خیال کرنے والے شوہر تھے' ساتھ ہی مجھے دنیا کی ہر آسائش' عزت و تکریم میسر تھی پھر بھی مجھے نجانے کیا چیز پریشان کررہی تھی؟ یہ نہ سہام کو سمجھ آرہا تھا نا ہی مجھے۔

بہرحال ابا کی بہت عرصے کے بعد کراچی میں پوسٹنگ میرے لیے بہت خوشی کا باعث تھی۔ سہام اُن دنوں بڑی محبت سے ابا کو کھانے پر لے جاتے تھے۔ وہ اتوار کو میرے گھر آتے تھے تو سہام اور میری ساس اُن کی بہت بڑھ چڑھ کر خاطر کرتے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تو کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا تھا۔

ان ساری راحتوں اور میری اُس پریشان کن سوچ اور خیال کے درمیان بقرعید آگئی تھی۔

عید کے دوسرے دن میں اور سہام ایک لنچ سے اپنے گھر واپس جارہے تھے کہ میرے گھر کے سامنے سے گزر ہوا تھا تو سہام نے کہا تھا۔ ''شام میں ہم یہاں نہیں آسکیں گے۔ چلو' ابھی مل لیتے ہیں۔''

امی کا گھر ڈبل اسٹوری تھا۔ نیچے میرے تایا رہتے تھے اور اوپر ہم لوگ۔ وہ چار بجے کا وقت ہوگا' میں اور سہام اوپر گئے تھے تو ابا کمرے میں کرسی پر بیٹھے تھے۔ ہم لوگ بھی اُن کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے چائے کا پوچھتے ہوئے بتایا تھا کہ گھر کے سب لوگ کہیں ملنے گئے ہوئے ہیں' سو ہم نے تقریباً پانچ دس منٹ کے بعد ہی اُن سے جانے کی اجازت لی تھی اور سہام تیزی سے اتر گئے تھے جبکہ میں جانے کے لیے کھڑی ہوئی تھی تو ابا نے مجھے سینے سے لگا کر بہت پیار کیا تھا اور دُعا کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ میں بڑی خوش خوش تیزی سے نیچے اتری تھی اور گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے کہا تھا۔

''سہام......! ابا نے مجھے گلے لگا کر پیار کیا ہے۔''

''ابا نے پیار کیا گلے لگا کر؟'' سہام نے میری بات سوالیہ انداز میں دہرائی تھی اور میں بغیر سہام کو دیکھے کہتی رہی تھی۔ ''ہاں! ابا نے مجھے گلے لگا کر پیار کیا۔'' لیکن جب سہام نے دو تین بار مجھ سے یہ بات پوچھی تھی تو پھر میں نے سہام کا چہرہ بغور دیکھا تھا تو مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔

وہ ہنستے ہوئے بولے تھے۔ ''یار......! ابا ہی پیار کرتے ہیں۔'' میں تو اُس وقت خوشی میں ڈوبی ہوئی تھی' سو کوئی جواب نہ دیا تھا پھر گھر پہنچ کر سہام نے میری ساس اماں سے کہا تھا۔

''اماں! آج ایک بڑی عجیب بات ہوئی ہے۔'' اماں نے پوچھا تھا۔ ''کیا؟'' تو وہ بولے تھے۔ ''ایک باپ نے بیٹی کو پیار کیا ہے۔'' وہ بھی ساری بات سن کر بہت دیر تک ہنستی رہی تھیں۔ رات کا کھانا سہام کے بھائی کے گھر تھا' وہاں بھی سہام نے اُن سے کہا تھا۔ ''بھائی صاحب! آج ایک عجیب بات ہوئی' ابا نے بیٹی کو پیار کیا۔'' وہاں بھی سب ہنس پڑے تھے۔

سہام اور دوسرے عزیز میری اس بات کا مذاق اڑا رہے تھے اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں انہیں اپنی بات کیسے سمجھاؤں؟ گھر واپس آکر میں نے سہام سے کہا تھا کہ ابا مجھے کبھی اس طرح پیار نہیں کرتے لیکن وہ پھر بھی میری بات نہیں سمجھے تھے' بس ہنستے رہے تھے۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتی کہ ابا نے اس سے پہلے کبھی بھی اس طرح مجھ سے محبت کا اظہار نہیں کیا تھا' بس میں اُن کے پاس بیٹھ جاتی تو وہ آہستہ سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتے۔ ''پیاری

بیٹی! اگڑیا بیٹی! اچھی بیٹی!'' وہ کتاب پڑھ رہے ہوتے تھے تو میں اُن کے پیچھے لیٹ جاتی اور اُن کا کُرتہ پکڑ کر اونگھتی اور وہ بس یہ ہی محبت کے الفاظ دہراتے رہتے تھے۔ اُن کی محبت کا بس یہی طریقہ ساری زندگی میں دیکھتی اور محسوس کرتی آئی تھی لیکن اُس دن انہوں نے جس والہانہ انداز میں مجھے پیار کیا تھا' سینے سے لگایا تھا' یہ محبت تو میرے لیے بالکل اجنبی اور نایاب تھی اور یہی بات میں کسی کو سمجھا نہیں پا رہی تھی۔

بقرعید کے تیسرے دن سہام آفس چلے گئے تھے۔ اُس روز دوپہر میں بہت تیز بارش شروع ہوگئی تھی۔ سہام پانچ بجے کے قریب گھر واپس آئے تھے۔ بارش کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ چائے وغیرہ پیتے مغرب کا وقت ہونے کو آیا تھا۔ بارش کی وجہ سے لائٹ غائب تھی۔ ہمارا گھر کیونکہ نیا بنایا بسا تھا' موم بتی یا لالٹین رکھنے کا خیال نہیں آیا تھا اور پھر لائٹ بھی آج کی طرح نہیں جاتی تھی لیکن اُس دن جیسی بارش میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ مغرب سے پہلے ہی اندھیرا چھا گیا تھا۔ سہام نے اپنی والدہ سے کہا تھا۔ ''اماں! ہم موم بتیاں لے کر آتے ہیں۔''

اماں نے کہا تھا۔ ''اس قدر بارش میں نہ جاؤ تو بہتر ہے۔''

''بس دس منٹ میں آتے ہیں۔'' سہام نے انہیں فوراً تسلی دی تھی۔ ہم گھر سے باہر آئے تو جگہ جگہ پانی جمع تھا اور بجلی کے ٹوٹے تار گرے ہوئے تھے۔ میری امی کے گھر اور ہمارے گھر کے درمیان پانچ منٹ کی ڈرائیو تھی۔ اپنی عادت کے مطابق ہم لوگ امی کے گھر کی طرف مڑے تھے تو ہمارے گھر کے نیچے فٹ پاتھ پر ایک پولیس مین کو کھڑے دیکھا تھا۔ میں نے سہام سے کہا تھا۔ ''یہ پولیس والا یہاں کیوں کھڑا ہے؟'' جب ہم گھر کے نیچے پہنچے تھے تو گیلری میں سب کھڑے ہوئے تھے اور امی نے سہام سے کہا تھا۔ ''یہ پولیس والا اُن کے بارے میں پتہ نہیں کیا پوچھ رہا ہے؟''

میں نے فوراً ہی امی سے پوچھا تھا۔ ''ابا نہیں آئے کیا؟'' وہ جمعہ کا دن تھا اور ابا جلدی گھر آکر جمعہ کی نماز کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ اب سہام کچھ کھٹکے تھے۔ انہوں نے مجھے اوپر جانے کو کہا تھا اور خود اُس پولیس والے کو ذرا آگے لے جاکر بات کرنے لگے تھے۔

اُس پولیس والے نے سہام کو جو کچھ بتایا تھا' وہ انہوں نے بھی فوراً انہیں بتایا تھا۔ میرے پھوپا صاحب کو نیچے بلایا تھا اور پھر سہام' پھوپا صاحب اور پولیس والا وہ تینوں ہم لوگوں کو کچھ بتائے بغیر چلے گئے تھے۔ اس وقت میرے تایا اور تایازاد بھائی بھی گھر پر نہیں تھے' اس صورتِ حال میں نیچے سے بھی سب لوگ اوپر آگئے تھے۔ کچھ دیر بعد جب نیچے کسی کا فون آیا تھا تو وہاں موجود واحد بھائی جو گھر کی دیکھ بھال کرتے تھے' وہ فون سن کر اوپر آئے تھے اور ایک بہن کو بلا کر نیچے لے گئے تھے' یوں اُن کو اُس قیامت کی اطلاع مل گئی تھی مگر وہ نیچے ہی بیٹھ گئی تھیں' اُن کو اوپر آنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ غرض کتنا ہی وقت گزر گیا تھا کہ اچانک پھوپا کی آواز آئی تھی۔

''بیٹے......! کوئی اچھی خبر نہیں ہے......'' سہام اُن کے ساتھ اوپر نہیں آئے تھے۔ شاید اُن کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ پھوپا کی زبانی پتہ یہ چلا تھا کہ حیدرآباد کالونی کی چورنگی پر ریس کرتی ہوئی دو بسوں نے میرے ابا کی جان لے لی ہے!!

....

''یادوں کے اوراق'' کی تیسری قسط آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے۔



 شازلی سعید مغل

تاشون

حزیں صدیقی کا خیال

عالمِ رنگ و تماشا سے گزر
کوئی قیمت نہیں بینائی کی

حیرت، تجسس، اسرار اور ستاروں سے جڑے بہت خاص سلسلے کی انیسویں کڑی



خلاصہ

''تاشون''......ایک پاکستانی نژاد مصری ہے۔ اُس کے ماں باپ اُس کی پیدائش پر مصر چلے گئے تھے۔ وہ صرف ایک ماہر ستارہ شناس یا پراسرار علوم کا مالک ہی نہیں ہے بلکہ رُوحانیت کی منازل طے کرتا روشنی کا ایک استعارہ ہے۔ اُس کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے، جن کی دُعائیں بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت پاتی ہیں اور زمین پر معجزہ بن کر واپس آتی ہیں۔ ذوالفقار صہبائی عرف زلفی' تاشون کا جگری یار ہے، جس کی بیوی رانیہ طاغوتی طاقتوں کے نرغے میں پھنس جاتی ہے۔ تاشون اپنے دوست زلفی کے بلانے پر پاکستان کے لیے رختِ سفر باندھ لیتا ہے۔ رانیہ کی کیفیت واقعی خراب ہوتی ہے۔ وہ اکثر راتوں کو محسوس کرتی ہے کہ جیسے اس کی روح اس کے جسم سے نکل کر گھر سے باہر جانے کی کوشش کرتی ہے لیکن جب اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتی تو واپس رانیہ کے جسم میں آ جاتی ہے۔ صورتِ حال نہایت گمبھیر ہوتی جا رہی تھی' ایسے حملے بار بار ہو رہے تھے۔ چنانچہ تاشون اپنے دوست کی مدد کرنے کے لیے پاکستان چلا آتا ہے اور یہاں آ کر رانیہ کا پیدائشی زائچہ بناتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رانیہ ساڑھ ستی کے زیر اثر ہے اور ستاروں کی کچھ خاص پوزیشنز لے کر پیدا ہوئی ہے۔ اس کی پیدائش کے وقت سورج گرہن تھا جو کہ شیطانی قوتوں کے لیے نہایت سعد وقت ہوتا ہے۔ شیطانی قوتیں ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہیں، جن کی پیدائش کے وقت سورج یا چاند گرہن لگا ہو۔ رانیہ کے پیچھے بھی سیل شیا نامی ایک منظم طاغوتی تنظیم کی رکن لگی ہوئی ہے جسے اپنی طاغوتی قوتوں کو بڑھانے اور اپنے مذموم مقاصد کو پورا کرنے کے لیے رانیہ کی روح درکار ہے۔ اس کے مذموم مقاصد میں سب سے اہم مقصد اس کے شیطان صفت شوہر مہانیل کی واپسی سرِ فہرست ہے۔ مہانیل وہ عفریت ہے جو کہ ایک صدی سے موت کی نیند سو رہا ہے۔ اپنے اس مذموم مقصد میں کامیابی کے لیے سیل شیا ہر حد سے گزرنا جانتی ہے' چنانچہ اس نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک صحرائی دیہاتی چندوا کے مرنے کے بعد اس کے ہم زاد کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے، جس کے ذریعے وہ فراعنہ مصر کے خزانوں پر بھی قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ سیل شیا نہایت کڑی تپسیا کے بعد ایک مرتبہ رانیہ کی روح کو اس کے جسم سے نکالنے میں کامیاب بھی ہو گئی تھی مگر تاشون نے اللہ تعالیٰ کی مرضی اور رحمت کے طفیل روح کو اس کے جسم میں واپس بلا لیا تھا۔ اس وجہ سے سیل شیا کی طاقتیں اس وقت کمزور پڑ گئی تھیں جب اس کا اتنا کاری وار خالی گیا تھا اور رانیہ کی روح جسم سے نکلنے کے باوجود تاشون کے علم اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے واپس رانیہ کے جسم میں چلی گئی تھی۔ اپنی اس ناکامی پر سیل شیا پاگل ہو اٹھی تھی' اسے اپنے آقا شیطان کو منانے کے لیے کافی جتن کرنے پڑے' تب کہیں جا کر اسے ایک بار پھر یہ اجازت ملی کہ وہ کچھ عرصے بعد یہ عمل دوبارہ کر سکتی ہے۔ اِدھر تاشون' زلفی کے دوست شہباز سولنگی کے گھر آئے مہمان کے جسم سے چار ہزار سال عمر رسیدہ جن کو نکالتا ہے۔ زلفی بہت فخر محسوس کرتا ہے کہ اُس کا دوست اس کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کے کام بھی آ رہا ہے۔

راحت چچا نے سیل شیا سے ایک نوجوان کامران کی ملاقات کروائی ہے، جس کی بہن رقیہ کے گھر عجیب و غریب خوفناک واقعات پیش آئے ہیں۔ سیل شیا کا کہنا ہے کہ وہ مکان اس کے بتائے ہوئے شخص کو فروخت کر دیا جائے ورنہ انہیں بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

تاشون سے ملنے اس کے والد صاحب کے زمانے کے ایک بزرگ شاکر علی صاحب آتے ہیں جو سنگاپور میں اپنے مکان میں رہنے والے دوسرے خاندان کا ذکر کرتے ہیں جو کوئی ڈاکٹر ٹیکسن کا آسیب تھا۔ زلفی کے گھر پر وہ اپنے سنگاپور والے مکان اور مادے اور جوہر کے ان کے والد اور ان کے نظریات کی بابت ذکر کرتے ہیں۔

تاشون نے ایک نہایت دلکش سے مضافاتی مقام پر ایک نہایت خوبصورت فارم ہاؤس بنایا ہے جہاں دوستوں کو دعوت پر مدعو کیا ہے۔ یہاں اسے سیل شیا کی جانب سے ایک تحفہ موصول ہوتا ہے۔

تاشون نے اُس تحفے کے حوالے سے بتایا تھا کہ سیل شیا بدلے کے لیے ایک خاص وقت کا انتظار کر رہی ہے اور اُس رات کو ہی فارم ہاؤس پر تاشون کے ڈرائیور پیرل خان کے ایک مہمان مکھن خان کی چیخیں سنائی دی تھیں، جس نے ایک روح سندونی پر قبضہ جمانے کا چکر چلایا تھا لیکن ناکام ہو گیا تھا۔ اُسے تاشون نے نجات دلائی تھی۔ ان لوگوں کی زلفی کے گھر واپسی ہوئی تھی۔ جہاں ایک فقیر کی آمد ہوئی تھی، جو کہہ رہا تھا ''دولت

کی دولتیں، سب دھری رہتی ہیں باتیں‘‘ پھر اس فقیر نے اپنی کہانی سنائی تھی۔

رانیہ کے گھر میں اوپر کسی روح کی آمد ہوتی ہے۔ یہ ایک بے بس لڑکی شائلہ کی روح ہے جو اپنے بھائی کو ڈھونڈنے نکلی اور خود موت کے چکر میں پھنس گئی۔ تاشون نے اسے بتایا کہ وہ مر چکی ہے اور پھر اسے اور اس کے بھائی کو انصاف دلوایا۔ اسی دوران میں تاشون دوسری مخلوق کے محبت کے فلسفے کو بیان کرتے ہوئے ایک اور واقعہ بتاتا ہے۔ صنوبر کے جنگل میں ایک لڑکی عاشی پر جن زادی سوار ہوگئی تھی‘ وہ جن زادی اپنے محبوب کی قبر پر آئی تھی اور عاشی نے اس کا پیر دبایا تھا۔ چنانچہ تاشون‘ عاشی کا علاج کرنے آتا ہے لیکن وہ جن زادی کسی انسان کی محبت میں گرفتار ہے جو مر چکا ہے۔ اس کی روداد سن کر تاشون رنجیدہ ہو جاتا ہے۔

(اب آپ آگے پڑھیے۔)

میں تو عاشی کو اثر سے نجات دلانے گیا تھا مگر وہ تو خودکشی کے زیرِ اثر تھی اور نجات پانا چاہتی تھی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔ ’’کیا تمہارے پاس میرے بھی درد کی کوئی دوا ہے یا پھر صرف انسانوں کی؟‘‘ وہ عجیب انداز میں بولی تھی۔

حالاں کہ میں بہت اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ وہ کون تھی مگر میں نے پھر بھی اپنا سوال دہرایا تھا۔ ’’پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ اس مخصوص قبر سے تمہیں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟‘‘

اُس نے میرے دوبارہ اصرار پر نظریں اٹھائی تھیں‘ زمانے بھر کا درد جیسے اُس کی ان نظروں میں کراہ رہا تھا۔ ’’وہ قبر اُس لڑکے کی ہے جس کو میں اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتی تھی‘ میرا عشق تھا وہ‘ میرا جنون تھا مگر وہ چھوڑ گیا‘ مجھے چھوڑ گیا اور میں اُسے یہ بتا بھی نہ سکی کہ میں اس کی محبت میں مبتلا ہو چکی ہوں‘ فنا کے راستے پر قدم رکھ چکی ہوں لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کو یہ سب بتاتی‘ وہ تو خود بھی فنا ہو گیا‘ مٹی میں مل گیا‘ اب یہ کیسی آگ ہے‘ کیسی جلن ہے کہ میں جل گئی ہوں مگر زندہ ہوں‘ تاشون‘ تم مجھے اس زندگی سے نجات دلا دو۔ تمہیں اپنے خدا کا واسطہ۔‘‘ وہ سب کچھ بھول کر میرے آگے گڑگڑا رہی تھی۔ عجیب بات تھی نا؟

’’یہ محبت کیا شے ہے؟ جن وانس‘ جانور نباتات و جمادات غرض کہ ہر شے کی اصلیت و ہیئت بدل ڈالتی ہے۔ محبت کا جذبہ کائنات کی ہر جاندار شے پر ایک ہی طرح سے وارد ہوتا ہے‘ محبت بہت سلجھا ہوا اور بیک وقت بہت الجھا ہوا موضوع ہے‘ کتابیں لکھ ڈالو‘ صفحے کے صفحے کالے کر دو‘ ادیب‘ شاعر‘ آرٹسٹ‘ نغمہ گو‘ نغمہ کار کوئی نہیں‘ کوئی نہیں جو اس کی پراسراریت کو صحیح طریقے سے پہنچ پاتا‘ اسی محبت کی پراسراریت کا شکار ایک غیر انسانی مخلوق دوزانو میرے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔‘‘ تاشون نے ایک گہری سانس لی اور پھر گویا ہوا۔ ’’اس کی یہ شرط کہ روز پھول چڑھانے ہوں گے‘ میں نے ایک شرط پر مانی تھی کہ تقریباً ایک ہفتے تک عاشی پھول چڑھا سکتی ہے اور پھر پھول اُس کے محبوب کی قبر پر روز چڑھ جایا کریں گے لیکن کسی مخصوص انسان کی شرط کے بغیر۔ وہ میری بات مان گئی تھی اور پھر اپنے آنسو پونچھ کے مجھ سے بولی تھی۔

’’اب میں جا رہی ہوں‘ اس لڑکی کے گھر والوں کو کہہ دو‘ کسی مولوی وغیرہ کو نہ بلائیں اور نہ تم کوئی تعویذ اس کو پلانا‘ بس اپنے وعدے پر قائم رہنا۔‘‘ وہ چلی گئی تھی۔ اُس کے جاتے ہی عاشی ایک دم اٹھی تھی اور آنکھیں بند کر کے زمین پر چپ لیٹ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اُس نے آنکھیں کھولی تھیں اور مجھے دیکھنے لگی تھی۔ اسی اثناء میں‘ میں نے اس کے گھر والوں کو بھی کمرے میں واپس بلا لیا تھا۔ عاشی اُن کو دیکھ کر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

’’ہم تو پہاڑ سے اتر رہے تھے‘ میں یہاں گھر پر کیسے؟‘‘ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ ’’امی......! ہم کب واپس آئے؟ کیا ہوا تھا‘ مجھے کچھ یاد کیوں نہیں آ رہا ہے؟‘‘

میں نے اس کو مختصراً اس کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بارے میں بتایا تھا۔ تاشون نے دیکھا‘ محبت کی اُس انوکھی کہانی کو سب لوگ دَم سادھے سن رہے تھے۔

’’بے چاری سنہرا...... ! پتہ نہیں‘ کب تک یوں ہی خوار رہے گی؟‘‘ زلفی کو سنہرا پر بہت ترس آ رہا تھا۔

’’ہاں‘ آپ نے درست کہا‘ بڑی خستہ حالی تھی اس پر عشق کے سبب‘ یہی وہ واحد جذبہ ہے کائنات کا جو کسی کو نہیں بخشتا‘ سب پر وارد ہوا ہے‘ کبھی بہار بن کر اور کبھی کسی پر خزاں کی صورت!‘‘ مونگا جیسے استغراق کی گہری حالت میں بولی تھی۔

•......•......•......•

گزشتہ دو دن سے زلفی کو رات گئے تک گھر سے باہر رکنا پڑا تھا۔ کام بہت ضروری تھا لیکن آج اسے جلد آ جانا تھا مگر اب بارہ بجے کے قریب کا عمل ہو رہا تھا‘ تاشون نے اس سے موبائل پر رابطہ کرنا چاہا تھا لیکن نیٹ ورک میں کچھ گڑبڑ کے باعث ایسا ممکن نہیں ہو رہا تھا۔ اس وقت رانیہ کے علاوہ مونگا بھی اُس کے ساتھ موجود تھی کہ اچانک وال کلاک نے بارہ بجے کی بیل دی تھی اور پھر سوئی بارہ کا اعلان کر کے جونہی آگے بڑھی تھی‘ یکا یک تاشون کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے تھے جسے صرف مونگا نے محسوس کیا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اضطراری انداز میں وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور جلد بازی میں اوپری منزل کے زینے کی طرف لپکا تھا۔ مونگا بھی اس کے کھڑے ہوتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن تاشون نے اُسے نیچے رانیہ کے پاس ہی رکنے کا اشارہ کیا تھا اور خود تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا تھا۔

اوپر اپنے کمرے میں آ کر تاشون نے ایک سرخ رنگ کے مخملیں ڈبے سے ایک چمکدار پتھر نکالا تھا اور اُس کو ہاتھ میں لے کر دریچے میں آ گیا تھا اور ہاتھ دریچے سے باہر نکال کے زیرِ لب کچھ پڑھنے لگا تھا۔ وہ جتنی تیزی سے پڑھتا جا رہا تھا‘ اس کے اضطرار میں کمی واقع ہوتی جا رہی تھی اور پھر چند منٹ پڑھنے کے بعد تاشون نے تیزی کے ساتھ اسے فرش پر دے مارا تھا۔ اب وہ چمکدار پتھر ایک جلتا ہوا کوئلہ یعنی بالکل انگارہ بن چکا تھا‘ اسی وجہ سے تاشون کی ہتھیلی ہلکی سی جھلس گئی تھی اور پھر تاشون نے اس جلتے ہوئے انگارے کو اپنے قدموں تلے پوری قوت سے کچل کر راکھ کر دیا تھا اور اب اس راکھ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

•......•......•......•

زلفی کی گاڑی گھر آتے ہوئے راستے میں خراب ہو گئی تھی‘ جہاں گاڑی خراب ہوئی تھی‘ وہ ایک پل تھا گاڑی جس کے کنارے کھڑی تھی اور ڈرائیور بونٹ کھول کر اس کی خرابی ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زلفی نے پل پر کسی گاڑی کی آمد و رفت نہ دیکھتے ہوئے ایسے ہی ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دو ایک چکر آگے پیچھے لگاتا اور آ کر ڈرائیور کے پاس کھڑا ہو جاتا پھر اُسے کام کرتا دیکھ کر پل پر ایک چکر اور لگا لیتا اور جب دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھتا تو پھر کنارے ہو جاتا۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائیور کی محنت رنگ لائی تھی اور گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ زلفی اُس وقت گاڑی سے دور پل کے دوسری طرف تھا‘ گاڑی اسٹارٹ ہوتے دیکھ کر وہ پل کراس کرنے لگا

تھا کہ یکا یک اُسے ایسا لگا تھا جیسے اس کے جوتے میں کوئی چیز گھس گئی ہو۔ پہلے تو وہ سمجھا' کوئی کیڑا مکوڑا ہے لیکن اچانک اُسے یوں لگا جیسا کہ کوئی جلتا ہوا انگارہ اس کے جوتے میں ڈال دیا گیا ہے پھر تو وہ تڑپ سا گیا تھا اور سڑک کے ایک کنارے ہو کر جوتا اتار کر دیکھا تھا کہ جوتے میں کیا چیز گھس گئی ہے اور جب اچھی طرح سے یہ تسلی ہو گئی تھی کہ جوتے میں کچھ نہیں ہے تو اُس نے موزے اتار کر پیروں کا بھی معائنہ کیا تھا مگر پیروں کے تلوے بھی صحیح سلامت تھے۔ گاڑی اسٹارٹ تھی' ڈرائیور نے جب یہ دیکھا تھا کہ زلفی جوتے اتار کر جھاڑ رہا ہے تو وہ سمجھا تھا کہ مٹی وغیرہ چلی گئی ہو گی مگر جب اس نے دیکھا کہ زلفی نے اپنے موزے اتار کر ننگے پاؤں گاڑی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا ہے تو وہ پریشان ہو کر گاڑی سے نکل کر آیا تھا۔ اسی اثنا میں زلفی گاڑی کا دروازہ کھول چکا تھا۔

''چلو' جلدی چلو!''

''کیا ہوا جناب' خیریت تو ہے؟'' ڈرائیور کو اپنے صاحب کی حالت کچھ گڑبڑ لگی تھی۔

''تم چلو تو' یہاں سے جلدی نکلو۔'' زلفی کا لہجہ شدید خوف کا شکار تھا۔ اس کے پیروں میں جلتے ہوئے انگارے جیسا احساس نہایت شدید ہو رہا تھا اور اس کا دماغ فوراً ہی سیل شیا کی کارروائی کی طرف چلا گیا تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ رانیہ کے ساتھ ساتھ اب سیل شیا اپنی کالی قوتوں کے اظہار کا ذریعہ اسے بھی بنانا چاہتی ہے مگر یہاں بات سیل شیا اور اس کے اظہارات کی نہیں تھی بلکہ یہاں معاملہ کچھ اور تھا' زلفی کے پیروں میں جلتے ہوئے انگارے کا اور تاشون کے ہاتھ میں چمکتے ہوئے پتھر کا انگارے میں تبدیل ہونے کا ٹائم ایک تھا' ایک سوئی آگے نا ایک سوئی پیچھے!!

انگارے کو قدموں تلے کچلنے کے بعد تاشون نے راکھ اٹھائی تھی اور اسے واش بیسن میں بہا دیا تھا اور پھر تازہ وضو کر کے دوبارہ رانیہ اور مونگا کے پاس نیچے ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھا تھا۔ کسی چینل پر ایک پرانی مووی چل رہی تھی' وہ دونوں مووی کم دیکھ رہی تھیں اور ہیروئن کے بالوں اور کپڑوں پر تبصرہ زیادہ کر رہی تھیں۔ تاشون کو آتا دیکھ کر رانیہ نے ٹی وی آف کر دیا تھا۔

''ارے' آپ لوگوں نے ٹی وی بند کیوں کر دیا؟'' تاشون خاصے خوشگوار لہجے میں بولا تھا۔

''ہم تو ویسے ہی بس وقت گزاری کے لیے فلم دیکھ رہے تھے۔'' مونگا نے تاشون کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ تاشون کے چہرے پر چند سوالات کے جوابات تلاش کر رہی تھی اور یہ بات تاشون بھی جانتا تھا۔

دیوار گیر گھڑی بارہ بج کر چالیس منٹ ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ ''پتہ نہیں' زلفی کہاں رہ گئے؟'' ابھی رانیہ نے پرتشویش انداز میں یہ کہا ہی تھا کہ باہر زلفی کی گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ رانیہ دروازے کی طرف لپکی تھی۔ تاشون اور مونگا بھی اس کے پیچھے باہر آ گئے تھے۔ ڈرائیور نے گیٹ کھلتے ہی گاڑی پورچ میں کھڑی کر دی تھی۔ زلفی گاڑی سے اترا تو اس کے ہاتھ میں جوتے اور موزے اور خود اس کو ننگے پیر دیکھ کر رانیہ اور مونگا کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔

•.......•.......•.......•

زلفی فریش ہو کر لاؤنج میں آیا تو رانیہ کھانا گرم کر کے زلفی کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر لگا چکی تھی' ساتھ ہی تاشون کے کہنے پر چائے بنانے کے لیے رکھ دی تھی۔ زلفی جلدی جلدی ہلکا سا کھانا کھانے کے بعد تاشون کے پاس آ کر

بیٹھ گیا تھا۔ وہ اسے آج کی انوکھی روداد بتانے کے لیے بے چین تھا۔ اس وقت تاشون کے ہاتھ میں اس کی زمردی تسبیح موجود تھی۔ تاشون نے تسبیح ختم کر کے جیسے ہی سائیڈ ٹیبل پر رکھی تھی' زلفی کو اس کے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی میں جھلسنے کا نشان صاف نظر آ گیا تھا۔

''یہ کیا ہوا؟'' زلفی نے تاشون کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کچھ نہیں ہوا' تم اپنے سیدھے پیر میں دیکھو۔'' تاشون وقت ضائع کیے بغیر بولا تھا۔ زلفی نے فوراً اپنا پیر اونچا کر کے دیکھا تھا تو جھلسنے کا نشان اسے صاف دکھائی دیا تھا۔

''یہ کیا زلفی؟'' رانیہ نے از حد تشویش کے ساتھ پوچھا تھا۔

''پتہ نہیں' کیا ہے' میں خود پریشان ہوں' مجھے سمجھ نہیں آ رہا' بس مجھے اچانک ایسا لگا تھا کہ کسی نے جلتا ہوا کوئلہ میرے جوتے میں ڈال دیا ہو اور پھر زلفی نے اُن سب کے سامنے سارا احوال کہہ ڈالا تھا۔

''غلطی تمہاری ہے زلفی......!'' تاشون نے عجیب سی برہمی کے ساتھ کہا تھا۔ ''کیا تمہیں یاد نہیں' میرے ابا جان تمہیں بچپن میں بھی ٹوک چکے تھے کہ اگر رات کو گھر سے باہر دیر ہو جائے تو سڑک یا راستے کے بیچوں بیچ نہیں چلنا چاہیے لیکن تم تو اُس وقت بڑے آرام سے پل پر ایک جگہ سے دوسری جگہ ایسے ٹہل رہے تھے جیسے کہ اپنے باغ میں ٹہل رہے ہو؟'' رانیہ اور مونگا اس نافہم گفتگو کے باعث بے تحاشہ الجھن محسوس کر رہے تھے۔

''ہاں' یاد آیا' وہ بہت تاکیداً بیچ راستے کے' راستے کے بیچوں بیچ چلنے سے منع کیا کرتے تھے۔'' زلفی شرمندہ ہوتے ہوئے بولا تھا۔ ''لیکن یہ کیا تھا؟'' وہ اب جلد از جلد اس بارے میں جاننا چاہتا تھا اور ساتھ ہی اُسے یہ تسلی بھی ہوئی تھی کہ اس واردات میں سیل شیا ملوث نہیں تھی۔

''تم بال بال بچ گئے ہو زلفی......!'' تاشون نے ایک لمبی سانس لے کر کہا تھا۔ ''برسات کا موسم ہے اور اس وقت شہر میں وبائی امراض پھوٹ پڑتے ہیں اور ویسے بھی چاہے موسم ہو یا نہ ہو' رات کے وقت بیچ رستے پر چلا نہیں کرتے ہیں۔ تمہیں یہ جان کر ایک خوفزدہ کر دینے والی حیرت ہو گی کہ جس پل پر تمہاری گاڑی خراب ہوئی تھی اور تم پل کے بیچوں بیچ ٹہل رہے تھے' وہاں سے وباؤں اور بلاؤں کا قافلہ گزر رہا تھا۔ اگر میں تمہارے جوتے میں انگارہ نہیں ڈالتا تو تم ان وبائی امراض یا کسی بلا کی لپیٹ میں آ جاتے۔''

''میرے جوتے میں انگارہ تم نے ڈالا تھا؟'' اس سوال کے بعد تو زلفی جیسے حیرت سے گنگ ہو گیا تھا۔

''ہاں' مجھے یہ سب کرنا پڑا' میرے مالک اس پاک ذات غفور الرحیم کا بڑا ہی کرم ہے جو مجھ بے توقیر اور گناہ گار انسان کو اس نے اپنے نوری علم سے نوازا ہے اور گاہے بگاہے اس کی رحمت میری رہنمائی کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ اسی ذاتِ پاک کے حکم اور رحمت سے میں نے تمہارے جوتے میں انگارہ ڈال دیا تھا اور تمہیں بیچ پل سے ہٹا کر کنارے کھڑا کر دیا تھا ورنہ تم ان بیماریوں اور بلاؤں کی لپیٹ میں آ جاتے اور ہمیں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا جبکہ اس وقت ہم اپنی توانائیاں صرف رانیہ کے لیے بچا کر رکھنا چاہیں گے۔ تمہارے ساتھ کوئی ناگہانی ہو' اس کی ہمارے پاس کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

''تب ہی تو میں کہوں' مجھے جوتا جھاڑتے ہوئے ایسا کیوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی تیز رفتار چیز پاس سے

گزری ہو جیسے کوئی تیز رفتار سواری یا سیٹی بجاتی ٹرین۔"

زلفی کے جوتے میں انگارے کی بات صاف ہوتے ہی اب اس حوالے سے باتوں کا سلسلہ چل پڑا تھا۔ "کیا یہ وبائیں اور بیماریاں بلاؤں والی ہواؤں کی طرح ہوتی ہیں؟" رانیہ نے قدرے خوف زدگی سے کہا تھا۔ "اف...... ہمارے چاروں طرف کتنی انوکھی پراسرار دنیا قائم ہے کہ اگر ہمیں اس کا ذرا بھی علم ہو جائے تو ہم اپنے گھروں میں قید ہو جائیں یا پھر زندگی سے بے زار......"

"بھابھی! آپ نے بالکل سچ کہا اس لیے تو اللہ تعالیٰ نے دوسری دنیا اور مخلوق کو ہماری نظروں سے اوجھل رکھا ہے، ہمارے ہوش و حواس کی دنیا سے پرے، بہت دور جبکہ ہمارے چاروں طرف اتنی مخلوقات ہیں کہ اگر آسمان سے کوئی سوئی بھی گرائی جائے تو وہ کسی نہ کسی مخلوق پر گرے گی، کوئی بھی جگہ خالہ نہیں ہے۔"

"اوہ......" رانیہ نے سرسراتی نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھا تھا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔" تاشون نے رانیہ کو تسلی دی تھی۔ "سب کے لیے قانون اور اصول ہے اور سب کی حد بندیاں کر دی گئی ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ دوسری مخلوق تو اپنے قانون اور حدود کا بہت خیال رکھتی ہے لیکن انسان بڑا ہی جلد باز اور بے صبرا ثابت ہوا ہے، اسی وجہ سے وہ حدود و قیود کا زیادہ خیال نہیں رکھ پاتا اور اکثر و بیشتر وہ دوسری مخلوق کے ری ایکشن کا شکار ہو جاتا ہے۔"

"یہ بتاؤ یار کہ یہ وبائیں، بیماریاں ہواؤں کی طرح ہوتی ہیں، کیا؟" زلفی نے رانیہ والا سوال دہرایا تھا۔

"نہیں......" تاشون نے کہا تھا۔ "وبائیں اور بیماریاں مختلف طرح کی ہوتی ہیں، بعض انسانی شکل کی ہوتی ہیں، بعض کسی اور شکل کی، کوئی پیدل ہوتا ہے اور کوئی گھوڑے پر سوار اور کسی کے صرف دھڑ ہوتے ہیں تو سر ندارد...... کسی کے صرف سر ہوتا ہے اور دھڑ ندارد...... کسی کے ایک یا دونوں ہاتھ نہیں، کسی کے ایک یا دونوں پیر نہیں۔"

"رئیلی ویری امیزنگ۔" زلفی بے ساختہ بولا تھا۔

"تم تو جانتے ہو زلفی، بابا جان ایک مانے ہوئے عامل کامل تھے۔" تاشون نے تھوڑا رک کر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ان کے عظیم تجربات اور مشاہدات میں سے ایک حیران کن واقعہ 1925ء کا ہے جو ان ہی وباؤں اور بیماریوں کے سلسلے کا ہے اور وہ میں از خود تمہیں بتانے جا رہا ہوں کیونکہ ہم لوگ آج خود تجربات کی بھٹی سے گزرنا، جھلسنا پسند کرتے ہیں تا کہ دوسروں کے مشاہدات اور تجربات سے فائدہ اٹھانا۔ آج کوئی بھی شخص اپنے بڑے بوڑھوں، بزرگوں کی بیتی باتوں کو بے پر کی کہہ کر اڑانا زیادہ بہتر سمجھتا ہے اس لیے آج کے لوگ ماضی کے لوگوں سے زیادہ خسارے میں رہتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک کہا آپ نے بھائی صاحب!" رانیہ، تاشون کی بات سے سو فیصد متفق تھی۔

"میں ان ہی حیرت انگیز تجربات، مشاہدات میں سے ایک آپ لوگوں کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں تا کہ آپ بیماریوں، وباؤں، بلاؤں سے محفوظ رہ سکیں۔ راستے کے بیچوں بیچ سونے اور چلنے سے ہمیں ہمارے بزرگوں نے ایسے ہی نہیں روکا ٹوکا جیسے زلفی رات بارہ بجے پل پر بیچوں بیچ ٹہل رہا تھا، بیماریوں اور وباؤں کا قافلہ ہمیشہ

درمیان میں چلتا ہے اس لیے دو دروازوں کے بیچ اپنے گھر کے کمروں میں بھی سونے سے منع کیا جاتا ہے۔ ایسا شخص ہمیشہ بیمار رہے گا جو دروازے کے بالکل سامنے یا بیچ میں سوئے گا۔ یہ باقاعدہ قافلوں کی شکل میں درمیان سے ہو کر گزرتے ہیں جیسا کہ میں نے بتایا کہ شکلیں رکھتے ہیں۔ 1925ء شہر عظیم آباد، ہندوستان میں ہیضے کی وبا بڑے زوروں پر پھیلی تھی، جس جس محلے میں یہ وبا پہنچتی، پورے محلے کی آبادی کی آبادی صاف کر دیتی تھی۔ بابا جان اپنے مشاہداتِ عملیات میں لکھتے ہیں کہ پورا شہر سہما ہوا تھا کہ نہ جانے کب کس کی باری آ جائے اور کسے داعیٔ اجل کو لبیک کہنا پڑے۔ غرض یہ کہ ہر شخص لرزاں تھا جیسے بیماری نہ ہو، اَن دیکھا آسیب ہو۔ ایک دن "ڈیہہ" محلے سے خبر آئی تھی کہ فلاں شخص مر گیا۔ "ڈیہہ" محلہ عظیم آباد سے کچھ دور واقع تھا، وہاں کی آبادی گوالوں، سادھوؤں، چماروں پر مشتمل تھی اور یہ سب وہاں قریب کے گھروں میں اور کھیت پر کام کرتے تھے کیونکہ یہ کام کاجی لوگ تھے، اس وجہ سے وہ لوگ بہت پریشان تھے جن کے کھیتوں یا گھروں میں یہ کام کرتے تھے، سب اسی فکر و تردد میں تھے کہ کیا کیا جائے؟ ہر روز پے در پے اموات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ سب نے متفقہ فیصلہ کیا تھا کہ بابا جان مرحوم سے رابطہ کیا جائے جو اُس وقت کے مانے ہوئے بزرگ اور عامل تھے، یوں سب نے جا کر بابا جان سے درخواست کی تھی کہ وہ اس آفتِ ناگہانی سے گلو خلاصی کی کوئی تدبیر فرمائیں۔ اس سلسلے میں دامے، درمے، سخنے جو بھی انتظامات کرنے ہوں گے، ہم کرنے کو تیار ہیں۔

بابا جان نے اُن تباہ حال لوگوں کی روداد سنی تھی اور مراقبے میں چلے گئے تھے اور پھر کافی دیر بعد مراقبے سے نکل کر انہوں نے اُن لاچار اور بے بس لوگوں کو تسلی دی کہ...... قوی امید ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان وباؤں اور بیماریوں سے محفوظ رکھے گا لیکن اس سلسلے میں ایک شرط ہے، وہ یہ کہ کوئی مضبوط اور قوی ارادوں والا مضبوط دل آدمی آگے آئے کیونکہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں، اس میں خوف اور ڈر کی گنجائش نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ وباؤں کا قافلہ وہ ادھم مچائے گا کہ اللہ کی پناہ! چنانچہ اِس خاص ہدایت کے بعد محلے کے سب سے شیر دل اور بہادر راجا صاحب ٹنکی والے نکل کر آگے آئے اور بابا جان سے کہا کہ میں کروں گا وہ کام جو آپ بتائیں گے اور بابا جی! میں مر جاؤں گا مگر میدان میں پیٹھ نہیں دکھاؤں گا۔

"یہی جذبہ چاہیے برخوردار!" بابا جان، راجا صاحب ٹنکی والے کے حوصلے سے مطمئن تھے۔ "بس تو پھر آپ رات بارہ بجے آ کر مجھ سے ایک خط لیجیے گا اور وہ جو آبادی سے باہر باغ ہے، وہاں پہنچا دیجیے گا۔"

"بس اتنا سا کام؟" راجا صاحب بولے تھے۔

"جی، بالکل، اتنا سا۔" بابا جان زیرِ لب مسکرائے تھے اور پھر رات بارہ بجے راجا صاحب ٹنکی والے کی آمد ہوئی تھی اور وہ بابا جان سے ایک خط لے کر باغ کی طرف چل پڑے تھے۔ وہ خط کیا تھا، وہ دو ٹھیکریاں تھیں، ان دونوں ٹھیکریوں پر نافہم زبان و الفاظ میں کچھ لکھا تھا۔ بابا جان نے راجا صاحب کو ہدایات کی تھیں کہ جب باغ کے قریب پہنچو تو ایک ٹھیکری اپنے جوتے میں ڈال لینا اور ایک ہاتھ میں رکھنا اور یہ بھی بتایا تھا کہ جب تم ایک ٹھیکری جوتے میں ڈالو گے تو تمہیں وہاں باغ کے اندر کافی سارے لوگ نظر آئیں گے۔ تم اندر چلے جانا، وہاں ایک شخص جو سبز پگڑی باندھے سب سے نمایاں ہوگا، تم اُس کے پاس چلے جانا اور ہاتھ والی ٹھیکری اُس کے ہاتھ میں دے دینا اور کسی کے ہاتھ میں نہ دینا پھر راجہ صاحب ٹنکی والے نے ایسا ہی کیا تھا، وہ باغ کے دروازے پر

پہنچے تھے' ایک ٹھیکری جوتے میں ڈال لی تھی' ٹھیکری کا جوتے میں جانا تھا کہ اُن کو وہاں باغ میں کافی سارے لوگ نظر آنے لگے تھے' ایسا معلوم دیتا تھا کہ جیسے کوئی قافلہ باغ میں ٹھہرا ہوا ہے' وہ لوگ بڑی بڑی دیگیں چڑھائے ہوئے تھے اور کھانا پکایا جا رہا تھا۔ اُن دیگوں میں سے دھواں اٹھ رہا تھا' وہاں موجود عجیب وغریب شکلوں والے لوگ یوں اچھل کود کر رہے تھے جیسے کھانا پکنے کی خوشی منا رہے ہوں۔ اب راجہ صاحب کے مضبوط اعصاب کا کام شروع ہوا تھا۔ وہ جب دیگوں کے پاس سے گزرے تھے تو انہیں ایک ہوشربا منظر دیکھنے کو ملا تھا اور ان کو یوں لگا تھا جیسے اُن کے پاؤں زمین میں پیوست ہی ہو گئے ہوں۔ وہاں بڑے بڑے تھالوں میں دیگوں سے کچھ نکالا جا رہا تھا' وہ دیکھ کر ہی راجہ صاحب چکرا گئے تھے۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ محلے میں گزشتہ دن جو کمو دھوبی کا بیٹا اس وبا کی لپیٹ میں آ کے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا' اس کا سر ایک دیگ سے نکال کر تھال میں ڈالا گیا تھا جبکہ اس کا دھڑ دوسری دیگ سے نکالا گیا تھا' یوں بڑے بڑے تھالوں میں وبا سے مرے ہوئے لوگوں کا بھنا ہوا سالن نکال کر پیش کیا جا رہا تھا اور وہاں لوگ اس کی دعوت اڑا رہے تھے۔

راجہ صاحب گو مضبوط اعصاب کے مالک تھے مگر اُس وقت اُن کی حالت پتلی ہوئی جا رہی تھی' وہ جلد از جلد سبز پگڑی والے کو ڈھونڈ کر ٹھیکری اس کے حوالے کر کے یہاں سے نکلنا چاہ رہے تھے اور پھر گرتے پڑتے انہیں سبز پگڑی والا دور سے نظر آ ہی گیا تھا۔ وہ جلدی سے اس کے پاس پہنچے تھے اور ٹھیکری اس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ اس نے پہلے تو راجہ صاحب کی طرف بغور دیکھا تھا۔ اب تو راجہ صاحب کی گھگھی بندھ گئی تھی مگر دوسرے ہی لمحے ایک حوصلہ افزا بات یہ ہوئی تھی کہ ہری پگڑی والے نے اس ٹھیکری کو بغور پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ جیسے جیسے وہ خط پڑھتا جاتا' اس کی پیشانی پر پسینے کی چمک بڑھتی جاتی تھی۔ خط پڑھنے کے بعد ہری پگڑی والے نے باآواز بلند حکم دیا تھا۔ ''میرے بھائیو...... یہاں سے ڈیرہ کوچ کرنے کا حکم آ گیا ہے' یہاں اب مزید نہیں ٹھہرا جا سکتا......'' یہ سننا تھا کہ اس دعوت عام میں جیسے کھلبلی سی مچ گئی تھی اور سامان سمیٹا جانے لگا تھا۔ دیگوں کی آگ یکا یک بجھ گئی تھی اور اسباب پکوان یکلخت غائب ہو گیا تھا' بس دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب چل پڑنے کو تیار ہو گئے تھے۔ اس موقع پر اس ہری پگڑی والے نے راجہ صاحب سے کہا تھا۔

''تم ایک طرف کنارے پر ہو جاؤ' بیچ میں مت کھڑے رہو اور ہمارے جانے کے بعد اس باغ سے نکلنا۔''

راجہ صاحب ایک جانب کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ لوگ کچھ گھوڑے پر سوار ہو گئے تھے اور کچھ ایسے ہی پیدل روانہ ہو گئے تھے۔ باغ میں اچانک ایک روشنی سی ہو گئی تھی' اس روشنی میں راجہ صاحب نے جو منظر دیکھا تھا' اس نے اُن کے رہے سہے حواس بھی تقریباً چھین ہی لیے تھے۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ ان میں کسی کا سر نہیں تھا تو کسی کا دھڑ اور کسی کا ایک ہاتھ پیر نہ تھا' کسی کے دونوں ہاتھ پیر نہ تھے' وہ سب رواں دواں باغ سے نکل گئے تھے مگر راجہ صاحب پتھر کے بت کی طرح استادہ تھے اور جب وہ قافلہ کچھ دور چلا گیا تھا تو راجہ صاحب کو ہوش آ گیا تھا۔ وہ گرتے پڑتے باغ سے نکلے تھے اور اپنے گھر پہنچے تھے' دوسری صبح خبر آئی تھی کہ عظیم آباد سے دور ایک بستی تھی کنچن پور' وہاں گزشتہ رات سے ہیضہ پھیلا ہوا ہے اور اب تک دو آدمی مر چکے ہیں......''

مونگا' رانیہ اور زلفی دم سادھے تاشون کی بات سن رہے تھے۔ ''واقعی ہماری دنیا کے متوازی ایک

پراسرار دنیا باقاعدہ چل رہی ہے اور ہم اس کے ساتھ ہی رہتے بستے ہیں۔'' زلفی نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا تھا۔

''جی جناب!'' تاشون نے کہنا شروع کیا تھا۔ ''کائنات کے ایسے ہزار ہا راز ہیں جو ہر وقت طشت ازبام ہونے کو تیار رہتے ہیں کیونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے لیے تسخیر کر دیا گیا ہے' چنانچہ ایسے راز کے افشا ہونے یا کسی بزرگ اور عامل کامل کے اس طرح اس مخلوق سے رابطہ کرنے کی باتیں خاص نہیں ہیں' عام سی ہیں۔ ہاں' خاص بات اپنی عبادت و ریاضت سے اپنے اندر وہ قوت جگانے کی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہماری پیدائش کے وقت سے ہی ہمارے پروگرامز میں فیڈ کر دی ہے اور وہ اللہ کا نور جو ہر مومن میں چھپا ہے' بس اُس کو تلاشنا ہے۔''

''واقعی' بے شک' ہم دنیاوی انسان دنیا کی نحوستوں میں گھر کر کب اپنے اوپر ایسی توجہ کر پاتے ہیں جو ہمیں نیک مقاصد تک لے جائے پھر بھی اللہ کا بے پایاں کرم و رحمت ہی ہے جو ہم جیسے دنیادار اور گناہ گار انسانوں کی مدد بھی کرتا ہے اور ہمیں تنہا بھی نہیں چھوڑتا۔ ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والا ایسے ہی تو نہیں کہا ہے میرے اللہ نے۔ بے شک!'' زلفی ایک جذب کے عالم میں بول رہا تھا۔

•......•......•......•

نور اور روشنی ایک علامت ہے صحت و دانش مندی کی اور زندگی کے ارتقاء کی۔ اس کے برعکس تاریکی اور ظلمت کا مفہوم بیماری اور جہالت' تباہی اور موت ہے۔ اپنے اعلیٰ ترین مفہوم میں نور اور روشنی کا مطلب ہے' وہ رُوحانیت کی تکمیل جس کو حاصل کرنے کے بعد روح اپنے جسم کو اتار پھینکتی ہے اور خود ایک نور بن جاتی ہے لیکن رُوحانی تکمیل کا راستہ بہت دشوار اور مشقت طلب ہے' اتنا مشکل اور دشوار کہ انسان اپنی اس مختصر زندگی میں اس کو عبور کرنے کی امید مشکل سے ہی کر سکتا ہے کیونکہ جہاں یہ طاقت موجود ہے' وہاں تاریکی اور ظلمت کے پیروکار جگہ جگہ موجود ہیں اور روشنی کے استعاروں کے لیے رکاوٹ بننے کی جرات کرتے رہتے ہیں لیکن جو مجاہد اِن رستوں پر ڈٹ جاتے ہیں' وہ ابدی زندگی کا راز معلوم کر لیتے ہیں لیکن یہ تاریکی اور ظلمت کے پیروکار بھٹکتے بھٹکتے اپنی آخری ہچکی لے لیتے ہیں۔ اس وقت سیل شیا بھی اپنے غرور میں' اپنی آخری ہچکی کا سامان پیدا کر رہی تھی۔ پانچ پہلو والے ستارے میں ایک بنفشی کہرے میں بیٹھی ان موٹی موٹی کتابوں میں کچھ تلاش رہی تھی۔ کتاب کی جلد پر تانبے کی نرم چادر چڑھی ہوئی تھی' اس چادر پر مختلف نقوش کھدے ہوئے تھے' اس کے اوراق نوعمر درختوں کی چھال سے بنائے گئے تھے اور شروع سے آخر تک بہت ہی صاف تحریر سے ڈھکے ہوئے تھے جو کہ لوہے کی نوک سے لکھی گئی تھی۔ دوسری کتاب کی عبارت ہرن کی کھال پر لکھی گئی تھی جس کا رنگ طویل زمانہ گزرنے کے بعد زرد سا پڑ گیا تھا۔ اس کی جلد کو چاندی کے بڑے بڑے پتھروں سے مضبوط بنایا گیا تھا۔ یہ حیرت ناک اور نایاب نسخے قدیم زمانہ سامری جادوگر کی بیاض اور روم کے ایک بہت قدیم جادوگر سایوس کی بیاض تھے......

حیرت' اسرار' تجسس اور علم و آگہی
سے آباد اس سلسلے کی دلچسپ کڑی
آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' ایک مفید معلوماتی اور مستقل سلسلہ ہے۔ یہ کالم خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے ساتھ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اولین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے استفادہ کیا اور ہزاروں لوگوں نے اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ حاصل ہوتا رہا' اسی تناسب سے ہر ماہ وصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ گزشتہ کئی برسوں میں ان خطوط کی تعداد اتنی تجاوز کر گئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں جواب دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے اپنے جواب کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا کیونکہ پرچے کے صفحات بہرحال محدود ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی احساس رہا ہے کہ لوگوں کے مسائل اور مشکلات بہت زیادہ اور عموماً فوری حل طلب ہوتی ہیں۔ ان کے لیے طویل انتظار ایک اذیت ناک کام ہے۔ انہی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جواب براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا' ان کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے اور مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں ہے۔ میری دوسری مصروفیات بھی ہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی' قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ)' کے لیے دُعائے خیر ہے اور بس۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور اس سے زیادہ قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے۔ صاحبِ استطاعت حضرات اور خواتین سے درخواست ہے کہ وہ ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں' وہ اپنی بساط کے مطابق اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ملک کے دور دراز علاقوں میں بسنے والی اُن خواتین کے جوابات بھی سپردِ ڈاک ہو جائیں گے جو کسی مجبوری کی بنا پر ڈاک خانے تک نہیں جا سکتیں اور =/300 روپے کا منی آرڈر نہیں کر سکتیں۔ یہ ایسی نیکی ہوگی جس کا اجر اس دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی۔ اب تک صرف ممالکِ غیر میں مقیم حضرات نے از خود تعاون کیا ہے۔ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو قارئین کے خطوط اور میرے جوابات کو فوری سپردِ ڈاک کرنے کا ریکارڈ مرتب کرنے اور دیگر متعلقہ امور کو سرانجام دینے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری حل چاہتے ہیں تو برائے کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ لفافے میں بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ کا نمبر ضرور تحریر کریں۔ وہ تمام خطوط جو =/300 روپے ٹوکن منی اور جوابی لفافے کے بغیر موصول ہوں گے' ان کے جوابات حسبِ سابق پرچے میں شائع ہوتے رہیں گے۔ خط ارسال کرنے سے پہلے درج ذیل ہدایات نوٹ فرمالیں۔

(۱) براہِ راست جواب درکار ہو یا کالم کے ذریعے' دونوں صورتوں میں اپنا اور اپنی والدہ کا اصل نام تحریر کریں۔ کالم میں اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو اصلی نام کے ساتھ کوئی فرضی نام بھی تحریر کریں تاکہ مسئلہ اُسی نام سے شائع کیا جائے۔ جان بوجھ کر گمنام اور فرضی پتوں کے خطوط نہ بھیجے جائیں۔ اپنے مسائل پوری سچائی کے ساتھ پیش کریں۔ غلط بیانی سے ہرگز کام نہ لیں۔ اس سے فائدے کی بجائے' نقصان کا زیادہ احتمال ہے۔ (۲) منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ صرف ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔ (۳) اپنا مسئلہ مختصر' واضح اور کاغذ کی ایک جانب لکھیں۔ ایک خط میں دو سے زائد مسائل تحریر نہ کریں۔ (۴) کوئی عمل یا وظیفہ کریں تو نماز کی پابندی کا عہد کریں اور اپنے لیے دُعا کرنے سے پہلے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے دُعائے خیر کریں۔ (۵) صرف خصوصی وظائف کی اجازت درکار ہوگی۔ لفافے کو بند کرنے کے لیے زیادہ گوند نہ لگائیں' اس طرح خط پھٹ جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عام ڈاک سے بھیجے جانے والے خطوط ہم تک نہیں پہنچتے لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ خط رجسٹری ڈاک سے بھیجے جائیں۔ جوابی لفافے پر مکمل پتا واضح اور خوشخط لکھا جائے۔ فوری جواب کے لیے اپنی ڈاک اِس پتے پر روانہ کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110۔ آدم آرکیڈ' شہید ملت روڈ۔ کراچی۔



ماہِ رمضان المبارک

عزیزو......!

رمضان المبارک کی آمد قرآنِ کریم کے نزول کی یاد دلاتی ہے جس سے تاریخِ عالم متبدل ہوئی یوں کشورِ انسانیت اپنی تعمیر و ترقی کی معراج کو پہنچی۔ روزہ اسلام کا تیسرا اہم رکن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو انسان اپنی بھوک پر قابو پا سکتا ہے' وہ اپنے ہر عمل پر قابو پا سکتا ہے۔ رمضان المبارک عبادت کا ماہ ہے۔ وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو صحت و سَلامتی کے ساتھ اِس ماہ کو پائیں گے۔ اِس بابرکت ماہ میں' میں اپنے تمام بچوں کو اپنی دُعاؤں میں یاد رکھوں گا خصوصاً انہیں جو شہر کراچی کے باہر سے خطوط لکھا کرتے تھے اور ملک کے حالات کے سبب بالکل رابطے میں نہیں ہیں۔ اللہ سب کو اپنی اَمان میں رکھے اور ہمارے وطن کو سَلامت رکھے کیونکہ اِسی میں ہم سب کی بقاو سَلامتی ہے۔

رمضان المبارک میں جس قدر عبادت کی جائے' اتنا ہی ثواب ہے۔ سورۃ البقرۃ' سورۃ یٰسین' سورۃ رحمٰن' سورۃ مزمل' سورۃ واقعہ اور الحمد شریف کا پڑھنا اور بہت پڑھنا نہایت مبارک ہے۔ اللہ ہم سب کو ایمان کی حالت میں دنیا سے اٹھائے۔ (آمین! ثم آمین!)

□ زینب۔کوٹ ادو۔

o محترم بابا جی! السلام علیکم! کے بعد عرض ہے کہ ہم اکثر و بیشتر آپ کا کالم پڑھتے ہیں۔ ہمیں یہ کالم بہت اچھا لگتا ہے۔ آپ جس طرح مسلمانوں کو اللہ کے قریب کرتے ہیں' اللہ آپ کو اِس کا اَجر دے گا۔ بابا جی! میں اپنی بہن کے مسئلے کے لیے رابطہ کر رہی ہوں۔ برائے کرم جواب ضرور دیجیے گا۔ بابا جی! میری بہن کی شادی کو تقریباً 9 یا 10 سال ہو گئے ہیں۔ اُن کا شوہر باہر ملک میں کام کرتا ہے۔ بابا جی! مسئلہ یہ ہے کہ وہ میری بہن کو وہیں بلانا چاہتا ہے اور کاغذات بھی بن گئے ہیں مگر روانگی کی تاریخ سے پہلے ہی کاغذات میں کوئی رکاوٹ آ جاتی ہے اور کینسل ہو جاتے ہیں۔ برائے کرم اِس سلسلے میں ہماری مدد کریں۔

☆ بیٹی زینب! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ بہن سے کہو' نمازِ فجر کے اور عشاء کے بعد ایک ایک بار سورۃ مزمل پڑھے اور دُعا کرے۔ بروز جمعہ بعد نمازِ عصر سفید مٹھائی پر حضور اکرم ﷺ کے نام کی فاتحہ دے کر بچوں میں تقسیم کر دے۔ یہ عمل نہایت پابندی کے ساتھ ایک ماہ کرے' پھر مجھے مطلع کرے۔

□ رضوانہ۔سرگودھا۔

o محترم بابا جی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ میں نے یہ شادی اپنی پسند سے کی تھی۔ میرے یا اُن کے گھر والے راضی نہ تھے۔ میرا ایک بیٹا ہے سات سال کا۔ بابا جی! میں نے شادی کے بعد بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ اتنی میری عمر نہیں ہے جتنے میں دکھ اٹھا چکی ہوں۔ میرے شوہر مجھے بہت زیادہ مارتے پیٹتے ہیں۔ چاقو' چھری' ڈنڈا جو بھی ہاتھ لگے' مار دیتے ہیں۔ کتنی مرتبہ میرا سر پھاڑ دیا ہے۔ گندی سے گندی فحش گالیاں دیتے ہیں۔ ہم چھ بہنیں اور ایک ہی چھوٹا بھائی ہے۔ میرے گھر جا کر اُن سے لڑتے رہتے ہیں۔ میرے گھر والے مجھ سے بہت تنگ آئے ہوئے ہیں۔ میری امی مجھے کہتی ہیں کہ تو مر جا تو اچھا ہے۔ میرے شوہر =/7,000 روپے تنخواہ میں سے صرف مجھے =/2,500 روپے دیتے ہیں۔ میں خود نوکری کرتی ہوں۔ میں اپنا اور بیٹے کا کپڑا' جوتا ہر چیز خود کرتی ہوں۔ وہ پھر بھی مجھے اچھا نہیں سمجھتے ہیں۔ میں اپنی پوری تنخواہ اپنے گھر پر لگا دیتی ہوں۔ میرے شوہر کے تمام گھر والے سوائے ایک بڑی بہن کے' لاہور میں ہیں۔ اِس بڑی بہن کے گھر میں ہم کرائے پر رہتے ہیں۔ میرے شوہر ہر تین یا چار مہینے بعد اپنے گھر لاہور جاتے ہیں حتیٰ کہ عیدیں بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ مناتے ہیں۔ میں اپنے بچے کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں انہیں لاہور جانے کے لیے اپنے پاس سے پیسے دیتی ہوں۔ میرا بچہ بھی احساسِ کمتری کا شکار رہنے لگ گیا ہے اور اَب میرے دوسری اولاد ہونے والی ہے۔ میرا خوف سے برا حال ہے کہ میں آنے والے کا خرچہ کیسے اٹھاؤں گی؟ کیونکہ مجھے نوکری چھوڑنی پڑے گی۔ محلے والے روز کی لڑائیوں سے ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ بابا جی! خدا کے لیے' آپ مجھے بتائیں کہ میرے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ ہم دونوں کی کیوں نہیں بنتی ہے؟ کوئی کہتا ہے کہ تمہارے ستارے نہیں ملتے ہیں' تم اپنا نام بدل لو۔ بابا جی! مجھے کوئی ایسا تعویذ یا مختصر وظیفہ بتائیں کہ جس سے میرے شوہر کا غصہ بالکل ختم ہو جائے اور وہ مجھ سے محبت کرنے لگیں۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آٹھ سال سے میں اپنے گھر میں اکیلی نہیں رہ سکتی ہوں۔ جب میں دوپہر میں سونے کے لیے لیٹوں میں مجھے لگتا ہے کہ

کوئی میرا دل نوچ رہا ہے۔ گھبرا کر میں برقع پہن کر گھر سے باہر چلی جاتی ہوں۔ اَب میری دوسری اولاد تین مہینے بعد ہونے والی ہے۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ میں روزانہ گھر سے باہر نہ نکلا کروں۔ میرا اپنے گھر میں دل لگے' خاص طور پر میں اکیلے نہ گھبرایا کروں۔ آپ مجھے یہ بھی بتا دیں کہ وظیفہ میں کروں یا میری والدہ بھی کر سکتی ہیں؟ میں معافی چاہتی ہوں کہ میں نے اتنا لمبا خط لکھا ہے لیکن خدا کے واسطے اِسے پورا شائع کیجیے گا۔ میں آپ کو ساری عمر دُعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی! ایک بات یاد رکھو' زندگی ایک بار ملتی ہے' بار بار نہیں ملتی لہٰذا اپنی اور اپنی اولاد کی زندگی برباد مت کرو۔ آج صرف شوہر جوتے مار رہا ہے' کل اولاد بھی ایسا ہی کرے گی۔ ظاہر ہے' بچے جو دیکھتے ہیں' وہی سیکھتے ہیں۔ شوہر سے آرام سے بات کرو اور اگر وہ باز نہ آئے تو فیصلہ کر لو۔ ہر وقت آیت الکرسی کا وِرد ضرور کیا کرو۔ یہ وِرد زچگی تک جاری رکھو۔

□ ر۔خ۔فیصل آباد۔

o بابا جی! السلام علیکم! میں آپ کو پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ میں ایک لڑکے سے بے حد پیار کرتی ہوں اور جہاں تک میں جانتی ہوں' وہ بھی مجھ سے پیار کرتا ہے۔ ہم لوگ کزن ہیں اور ہماری موبائل فون پر بات ہوتی ہے لیکن گھر والوں کی طرف سے فون پر بات کرنے کی اجازت نہیں۔ شروع شروع میں مجھے اُس نے فون کیا مگر اَب نہیں کرتا اور میں روز یا دو تین دن بعد فون کر لیتی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ استخارہ کر کے بتائیں کہ کیا وہ مجھ سے پیار کرتا ہے یا صرف ٹائم پاس کر رہا ہے اور کیا وہ مجھ سے شادی کرے گا اور میری شادی کب ہو گی اور کیا میری شادی اُسی سے ہو گی؟ اگر نہیں تو پھر کس سے ہو گی؟ آپ کی مہربانی ہو گی۔

☆ بیٹی......! اگر والدین کی عزت پیاری ہے تو اپنا رویہ درست کر لو۔ جس راستے پر تم چل رہی ہو وہ صرف بدنامی تک پہنچاتا ہے۔ ساری زندگی اپنے اور غیر سب طعنے دیں گے لہٰذا نماز کی پابندی رکھو۔ بکثرت توبہ استغفار پڑھا کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ ثمر۔کراچی۔

o جناب بابا جی! السلام علیکم! بابا جی! آج کل میں بے حد پریشان ہوں۔ میرے تین بچے ہیں۔ میرا بیٹا اَب میٹرک کا امتحان دے گا۔ بابا جی! میرا بیٹا پہلے پڑھنے میں بہت اچھا تھا لیکن اَب نہ جانے اُسے کیا ہو گیا ہے؟ میری پوری توجہ اپنے بچوں پر رہتی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان بنانا چاہتی ہوں۔ آج میرے بیٹے کا ششماہی امتحان کا رزلٹ آیا ہے' وہ ایک پیپر میں فیل ہو گیا ہے اور باقی مضمون میں بھی نمبر زیادہ اچھے نہیں آئے ہیں۔ ٹیچر کا کہنا ہے کہ یہ کلاس میں پڑھائی کے وقت توجہ نہیں دیتا جبکہ بابا جی! میں نے اپنے بیٹے کے لیے 4 ہزار روپے کی ٹیوشن بھی لگائی ہوئی ہے۔ پڑھائی کے لیے اس کے پاس بہت وقت ہوتا ہے۔ میری آپ سے التجا ہے کہ آپ میرے بیٹے کے لیے ایسا آزمودہ وظیفہ دیں کہ اس کا دل خوب پڑھائی میں لگے۔ میری آدھی زندگی بے حد پریشانیوں میں گزری ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے بچے اچھا پڑھ لکھ جائیں۔ میں اپنے بیٹے کی میٹرک میں اعلیٰ پوزیشن چاہتی ہوں۔ خدارا' آپ میری مدد کریں۔

☆ بیٹی ثمر! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دیکھنا نصیب فرمائے۔ بیٹی! ہر نماز کے بعد الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر تصور میں بیٹے پر دَم کرو۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور دیا کرو۔ بچے کو نہار

منہ 4-6 بادام ضرور کھلاؤ۔ بیٹی! یہ بہت پرانی چیزیں ہیں مگر بہت آزمودہ ہیں۔

□ گل۔اٹک۔

o بابا! آداب! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری دو بیٹیاں ہیں، دونوں کی عمریں بالترتیب 23 اور 24 سال ہیں۔ اُن کی شادی کے لیے پریشان ہوں۔ رشتے تو آتے ہیں لیکن کوئی بات نہیں بنتی ہے۔ کوئی وظیفہ بتائیں جسے میں خود پڑھ سکوں۔

☆بیٹی گل...... اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ میں نصیحت کروں گا کہ دونوں بچیوں کے لیے مجھ سے تعویذ منگوالو۔ تفصیل جوابی خط میں تحریر کی جائے گی۔

□ قادر احمد۔تربت۔

o محترم بابا جی! السلامُ علیکم! بعد سلام عرض ہے کہ میں ایک مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ بابا جی! یہ میری زندگی کا سوال ہے۔ عرض یہ ہے کہ مجھے بچپن سے ہی فوج میں جانے کا بہت ہی زیادہ شوق رہا ہے۔ میں نے F.Sc بہت ہی اچھے نمبروں سے پاس کیا اور 4 مہینے پہلے فوجی ٹریننگ میں حصہ لیا۔ میں نے بہت ہی محنت کی لیکن ٹریننگ میں، میں ناکام ہوگیا۔ بابا جی! میں بہت ہی دل برداشتہ ہوا لیکن میں ناامید نہیں ہوا اور میرے دوستوں نے مجھے بہت ہی حوصلہ دیا اور کہا کہ ایک مرتبہ محنت کر کے قسمت آزمالو۔ بابا جی! اب ستمبر میں پھر فوجی ٹریننگ ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں ایک دفعہ پھر اس ٹریننگ میں حصہ لوں اور اس دفعہ میں پہلے سے بھی زیادہ محنت کروں گا لیکن بابا جی! مجھے آپ کی دُعاؤں کی بھی بے حد ضرورت ہے اور میں چاہتا ہوں، مجھے آپ اپنا بیٹا سمجھ کر ایسا وظیفہ دیں کہ جس کو پڑھنے کے بعد میں اِس ٹریننگ میں کامیاب ہو جاؤں۔

☆بیٹے قادر! اللہ تمہیں ضرور کامیابی عطا فرمائے گا۔ بکثرت یَا حَافِظُ کا وِرد کیا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ الف۔ل۔حیدرآباد۔

o محترم بابا جی! السلامُ علیکم! سلام کے بعد عرض یہ ہے کہ یہ میرا آپ کو دوسرا خط ہے۔ امید ہے کہ آپ میرے پہلے خط کی طرح اِس کا جواب بھی ضرور دیں گے اور میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا بھی ضرور کریں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کی مشکلوں کو آسان کرے اور آپ جیسے بزرگوں کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ (آمین!) بابا جی! میرے دو مسئلے ہیں۔ پہلا مسئلہ میرے بھائی کا ہے۔ بابا جی! میرے بھائی نے انٹر کا پیپر دیا ہے۔ اُس نے فوج میں درخواست بھی دی تھی جو منظور ہوگئی۔ اُس کا ٹیسٹ وغیرہ بھی ہوا ہے جس کا جواب جلد آ جائے گا۔ آپ اُس کے لیے دُعا کریں کہ وہ فوج میں بھرتی ہو جائے اور اُسے ٹریننگ میں کوئی مشکل پیش نہ آئے کیونکہ وہ جسامت کے لحاظ سے بہت کمزور ہے اور تھوڑا بہت کام کرتا ہے تو اُس کا سانس پھول جاتا ہے۔ آپ اُس کے لیے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ وہ فوج میں بھرتی ہو جائے۔ وظیفہ ایسا ہونا چاہیے جو ہم آرام سے کر سکیں۔ اگر فوج میں نہیں تو تمہیں اچھی سی جگہ نوکری مل جائے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ دوسرا مسئلہ میرے کزن کا ہے جو میرا منگیتر بھی ہے۔ اُس کے بارے میں، میں نے آپ کو پہلا خط لکھا تھا جس کا مجھے جواب بھی ملا ہے۔ بابا جی! میں نے اپنے پہلے خط میں لکھا تھا کہ اُسے کہیں نوکری ہی نہیں ملتی اور اگر کہیں مل بھی جائے تو تنخواہ بہت کم ملتی ہے جس سے گھر کا خرچ بہت مشکل سے چلتا ہے۔ بابا جی! آپ نے ایک وظیفہ بتایا تھا جو آپ نے لکھا تھا کہ وہ خود کرے۔ وہ وظیفہ (41) دن کا تھا۔

بابا جی! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی کہ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جو میں خود کر سکوں۔ بابا جی! وہ آج کل کام کی تلاش میں ہے۔ جہاں بھی اُسے کام کا پتا چلتا ہے، وہ وہاں پر جاتا ہے مگر جواب میں انکار ملتا ہے۔ بابا جی! آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے اُسے چھوٹا موٹا کام مل جائے جس کی تنخواہ اُس کی ضرورت کے مطابق ہو۔ بابا جی! وظیفہ میرے لیے ہی ہونا چاہیے۔ وہ خود نہیں کر سکتا۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ اِس خط کا جواب اگست کے شمارے میں ضرور دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔

☆بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ جو وظیفہ بیٹے کو دیا تھا، وہ تم کرو اور بھائی سے کہو یَا فَتَّاحُ کا بہت وِرد کرے۔ مدت 41 دن ہے۔

□ ستارہ۔لاہور۔

o محترم بابا جی! السلامُ علیکم! بابا جی! میں نے آپ کو کتنے ہی خط لکھے لیکن اب تک کسی خط کا جواب نہیں ملا۔ ہر مہینے آپ کے جواب کی شدت سے منتظر رہتی ہوں۔ محترم بابا جی! میرے دو مسئلے ہیں۔ بابا جی! میرے شوہر کے ہر کام میں رکاوٹ رہتی ہے۔ میرے شوہر ہر کسی کے کام آتے ہیں لیکن لوگ اپنا کام نکلوا کر آنکھیں پھیر لیتے ہیں جس کی وجہ سے اِن کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ میرے شوہر کے ذریعے سب کے کام ہوتے ہیں لیکن اُن کے کام نہیں ہوتے۔ وہ ہر وقت مایوس اور پریشان رہتے ہیں۔ پہلے کسی سے استخارہ نکلوایا تھا۔ انہوں نے بندش بتلائی تھی۔ بابا جی! میرا دوسرا مسئلہ بہت اہم ہے، وہ یہ کہ ہمارے گھر کے سامنے، آگے پیچھے، دائیں بائیں زیادہ تر دکانیں، گیرج ڈپو وغیرہ ہیں۔ وہاں واحد گھر ہمارا ہے۔ پیچھے کا بھی دروازہ نہیں ہے کہ بندہ پیچھے کا دروازہ استعمال کرے۔ بابا جی! اصل مسئلہ یہ ہے پہلے تو یہ دکانیں اتنی نہیں تھیں جو مسئلہ ہوتا، اب زیادہ تر علاقہ کمرشل ہوگیا ہے۔ گھر کے سامنے ڈپو ہے جس کی وجہ سے لڑکوں کا رش لگا رہتا ہے۔ لڑکے گندی گالیاں نکالتے ہیں جس کی آواز سب ہمارے گھروں میں آتی ہے۔ بابا جی! رات کو بالکل ہی سنسان ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے ہمارے اکیلے گھر میں تین مرتبہ لڑکوں نے اترنے کی کوشش کی ہے لیکن اللہ کے فضل سے کامیاب نہیں ہوئے۔ اللہ بہت کرم کرتا ہے۔ ایک تو ہمارا گھر لیز بھی نہیں ہے لیکن میرے سسرال والے 40 سال سے یہاں رہتے ہوئے آئے ہیں۔ بابا جی! کچھ سمجھ نہیں آتا ہے، کیا کریں؟ اگر بیچ کر جائیں گے تو معلوم نہیں آگے اور پریشانی نہ ہو؟ بابا جی! اس لیے میں یہ چاہتی ہوں کہ کوئی کمرشل پارٹی ہی آ جائے اور میرا گھر بک جائے اور ہمیں دوسری جگہ کوئی اچھا مکان مل جائے۔ مکان بکنے اور دوسری جگہ مکان ملنے کے لیے کوئی وظیفہ بتائیں جس سے ہمارا کام بن جائے۔ بابا جی! آپ کو میں بتا نہیں سکتی، میرے شوہر مکان کے سلسلے میں کتنے پریشان رہتے ہیں۔ اللہ سے ہاتھ اٹھا اٹھا کر دُعا کرتے ہیں کہ مکان کا کوئی وسیلہ کر دیں۔ بابا جی! ہماری دو بچیاں ہیں۔ ہر بندہ عزت سے ڈرتا ہے۔ میرے شوہر اکیلے ہیں۔ بابا جی! پلیز، پلیز، پلیز! میرے مسئلے پر ضرور غور کرنا، مجھے خط کا جواب ضرور دیجیے گا۔ بابا جی! اگر میرا خط آپ تک پہنچ جائے تو ستمبر کے شمارے میں ضرور ضرور جواب دیجیے گا، شکریہ!

☆بیٹی ستارہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ مجھے بذریعۂ خط مطلع کرو کہ گھر کس قیمت میں بیچنا چاہتی ہو؟ ہر نماز کے بعد 7 تسبیح یا واحدُ کی 3 تسبیح پڑھو اول و آخر دُرود شریف 3-3 بار۔ مدت

ایک ماہ ہے۔

□ کبریٰ۔ ملتان۔

o محترم بابا جی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ ہم لوگوں کے گھر میں تین چار سال سے پریشانی ہے۔ آئے دن گھر سے چیزیں گم ہو جاتی ہیں بلکہ ہر طرف سے محسوس ہوتا ہے کہ کچھ ہے مگر کوئی خوف وغیرہ نہیں آتا۔ والدہ شوگر کے ساتھ بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں۔ اُن کی طبیعت خراب رہتی ہے۔ بڑی بہن کا رشتہ نہیں ہوا۔ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ کھانے پینے کو دل نہیں کرتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے ذہن اور دل قابو کر لیا ہے اور اپنی مرضی سے چلا رہا ہے۔ گھر سے صرف میری چیزیں غائب ہوتی ہیں یا جس چیز کا دل کرتا ہو کھانے پینے کا' وہ دور ہو جاتی ہے اور کچھ غلاظت محسوس ہوتی ہے بلکہ ذہن میں main point نہیں رہتا۔ لوگ کہتے ہیں' گھر تبدیل کر لیں۔ بھائی کی پڑھائی ہو جائے۔ والد کی روزی میں برکت اور صحت کے لیے مہربانی فرما کر کوئی کلام بتائیں اور کسی نے گھر پر کچھ کیا ہوا تو نہیں؟ آپ سے گزارش کرتے ہیں کہ خط کا جواب جلدی دیں گے۔

☆ بیٹی کبریٰ......! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ دنیا کا سب سے آسان کام ہے یہ کہہ دینا کہ یہ سفلی عمل ہے۔ میں ایسے نہیں کرتا۔ میں پورا حساب لگاتا ہوں۔ بہرحال تم ہر نماز کے بعد یَـا وَکِیلُ کی 7-7 تسبیح پڑھو اول و آخر دُرود شریف 7-7 بار پھر دُعا کرو۔ صبح و شام چڑیوں کو دانہ اور پانی ضرور دیا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ صابرہ۔ احمد پور شرقیہ۔

☆ بیٹی! اللہ تمہیں اپنے گھر میں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تم ہر نماز کے بعد 11 بار آیت الکرسی پڑھ کر تصور میں شوہر پر دَم کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔ مدت 41 دن ہے۔

□ سرمد شاہ۔ صوبہ سرحد۔

o بابا جی! میرا تعلق سرحد کے بہت چھوٹے سے گاؤں سے ہے۔ یہاں زندگی کی عام ضروریات بھی نہیں ملتیں۔ بابا جی! مہنگائی کے اِس دور میں زندگی عزت کے ساتھ گزارنا بہت مشکل ہے۔ آپ کا کالم پڑھتا رہتا ہوں۔ آپ جس طرح لوگوں کو صبر کی تلقین کرتے ہیں' لگتا ہے' زندگی گزارنا بہت سہل ہے۔ برائے مہربانی مجھے بھی کوئی ایسا وظیفہ دیں جس کی برکت سے میں رزق کی تنگی سے نکل آؤں۔

☆ بیٹے سرمد......! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد مندرجہ ذیل آیت 99-99 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ بیٹے......! اگر رزق کی خاطر شہر بھی چھوڑنا پڑے تو ضرور چھوڑو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ رضیہ۔ کراچی۔

☆ بیٹی رضیہ! تمہاری خواہش کے مطابق تمہارا مسئلہ شائع نہیں کیا جا رہا ہے مگر بیٹی! رونا دھونا تمہارے مسئلے کا حل نہیں ہے۔ کوئی کسی کی پروا نہیں کرتا۔ تم لگ کر اپنا علاج کراؤ۔ تمہارے بچے' بہت چھوٹے ہیں' انہیں تمہاری ضرورت ہے۔ کسی اچھے سے حکیم کے پاس جاؤ۔ دن میں جب بھی یاد آئے' یَاشَافِیُ کا وِرد بہت کیا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ طاہر حسین' لاہور۔

☆ بیٹے! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ وظیفہ نماز کی پابندی کے ساتھ کرتے رہو۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔

□ فرزانہ' مقام نامعلوم۔

☆ بیٹی! اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے۔ بیٹی!

اَب صرف صبر اور ہمت سے حالات کا مقابلہ کرو۔ زندگی میں نشیب و فراز آتے ہی ہیں۔ اپنے آپ کو عبادت میں لگاؤ کیونکہ دنیا سے جانے کے بعد یہی کام آئے گا۔ روزانہ رات کو بعد نمازِ عشاء 12 تسبیح یَـا وَادِدُ کی پڑھو اول و آخر دُرود شریف 7-7 بار۔ مدت 41 دن ہے۔

□ آمنہ۔ کراچی۔

☆ بیٹی آمنہ! اگر جواب تفصیل سے چاہتی ہو تو براہِ راست خط لکھو۔ کالم میں بہت تفصیل سے جواب نہیں دیا جا سکتا۔

□ س۔م۔ا۔ حیدر آباد۔

☆ بیٹی! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ تمہیں اپنے معاملات میں بالکل خاموش رہنا ہوگا۔ یہ رویہ وہ مرد رکھتے ہیں جنہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ کم تر ہیں۔ ایک مکمل مرد اپنی بیوی کو بہت اچھا رکھتا ہے۔ بہرحال تم اپنی جانب سے کوئی کوتاہی مت کرنا۔ اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دو' وہ بہتر کرنے والا ہے۔ بعد نمازِ فجر 17 بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھا کرو۔ مدت 41 روز ہے۔

□ تابش سحر۔ مانچسٹر۔

o بابا جی! اللہ آپ کو بہت خوش رکھے۔ میں بھی شاید ابھی آپ کو خط نہیں لکھتا مگر آپ کی ایک سطر نظر سے گزری جس میں آپ نے نصیحت کی تھی کہ مسائل حل ہونے کے بعد ضرور حالات سے آگاہ کیا کرو۔ بابا جی! معاف کر دیں' ہم اپنی خوشی میں بھول ہی گئے کہ آپ کو مطلع کر سکیں۔ آپ کے تعویذ اور دُعاؤں کی برکت سے اللہ نے ہمیں بہت پیاری بیٹی عطا کی ہے۔ اَب وہ 5 ماہ کی ہے۔ ہم نے اِس کا نام زینب رکھا ہے مگر اَب چاہتے ہیں کہ آپ نام رکھیں۔ ہمیں ہماری کوتاہی پر ضرور معاف کر دیں۔

☆ بیٹے تابش! اللہ تمہیں اولاد کی بے شمار خوشیاں دکھائے۔ نام رکھنے کا اصل حق تو ماں کا ہی ہوتا ہے۔ بہرحال نام بہت اچھا رکھا ہے۔ اللہ بچی کو لمبی اور صحت والی زندگی عطا فرمائے۔ تعویذ تلف کر دو اور دوسرا تعویذ منگوا لو۔ خوب صدقہ خیرات کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ عمل سب سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ خوش رہو......!

□ فروا' کراچی۔

☆ بیٹی فروا......! تمہارا خط مجھے مکمل پھٹی ہوئی حالت میں ملا لہٰذا میں مسئلہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ آئندہ خط اِرسال کرو تو رجسٹرڈ پوسٹ کرنا۔

□ ثمینہ۔ نواب شاہ۔

☆ بیٹی ثمینہ......! اللہ سے مدد مانگنے والے کبھی ناکام نہیں ہوتے۔ تم مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو' میں تمہیں تفصیل سے جواب دوں گا۔ خوش رہو!

□ عمی۔ کراچی

☆ بیٹی......! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ کچھ فیصلے بڑوں کے درمیان طے ہوں تو مناسب ہوتا ہے۔ تم اپنی توجہ اپنی پڑھائی کی جانب رکھو اور یَـا فَتَّاحُ کا بہت وِرد کیا کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ شہزاد مغل۔ راولپنڈی

☆ بیٹے شہزاد......! دوسروں کو نقصان دینے کی بجائے اپنی کامیابی کی کوشش کرو کیونکہ تم اپنی جو توانائی کسی سے بدلہ لینے میں ضائع کرتے ہو' اگر وہ اپنی کامیابی کے لیے استعمال کرو تو کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ۔ بہرحال تم روزانہ اپنی دکان کھولنے کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن کی تلاوت کیا کرو' اللہ ضرور روزی میں برکت دے گا اور شیطان صفت لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ مدت 41 دن ہے۔

لفظ کہانی......

آؤ میں تمہیں "لفظ" کی کہانی سناؤں
لفظا تم کو یہ روداد بتاؤں
لفظ کو کچھ اس طرح لفظ سے زنجیر کروں
چھوٹی سی بات کو میں طویل کروں
یاد کے آنسوؤں کو مرثیے کا روپ دوں
چاہت کی پہلی نظر کو سپاس لکھوں
کبھی صدیوں پہ محیط باتوں کے لب پر
میں محاورے کی انگلی رکھ دوں
تو کبھی ایک سیاسی بیان پر
میں پورا کالم لکھ دوں
اپنے الفاظ کو نئے نئے روپ دوں
کبھی غزل، کبھی نظم
تو کبھی فسانہ اور ناول تحریر کروں
سچ تو یہ ہے
الفاظ پر میری حکمرانی ہے
جبھی تو جملوں کی فراوانی ہے
خاموشی سے نکتوں کا کاروبار کروں
میں لفظ بہ لفظ تفریق و جمع کروں
یونہی الفاظ کا ذخیرہ کرتی جاؤں
اور لفظی محفل سجاتی جاؤں
ضبط تحریر کو میں اپنا فرض سمجھتی ہوں
جبھی صفحہ قرطاس کا حق ادا کرتی ہوں......!

ارم زہرا

منی سچی کہانیاں
MINI MAG

کتاب تبصرہ

پسند اپنی اپنی

آپ کی خبر

بازگشت

خوبصورت جذبوں کی شاعرہ

شگفتہ شفیق

عکاشہ سحر



شاعری اپنے زاویۂ نگاہ سے جہانِ نو تخلیق کرنے کا نام ہے۔ مناسب ترین الفاظ کی موزوں ترین بندش جو دل و ذہن پر اثر کرے، شاعری کہلاتی ہے......

"یاد آتی ہے" شگفتہ شفیق کا نظمیہ شاعری پر مشتمل مجموعۂ کلام ہے جسے سلسلہ پبلی کیشن' کراچی نے زیورِ طباعت سے آراستہ کیا ہے۔ "یاد آتی ہے" شگفتہ شفیق کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے پہلے اُن کا مجموعۂ کلام "میرا دل کہتا ہے" پڑھنے والوں سے بے تحاشہ داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ غزل سے زیادہ اُن کا رجحان نظم نگاری کی طرف ہے۔ اُن کی نظموں میں عصری مسائل، کرب ذات، آشوب آگہی اور زندگی کے تمام رنگوں کا ذکر موثر اور دلنشین پیرائے میں ملتا ہے۔ وہ نئی کہانی کی تلاش میں ہیں۔ ایک نئی زندگی کی آرزو اور جستجو شگفتہ کو بے چین رکھتی ہے۔ سادگی اور سلاست اُن کی نظموں کا خاصہ ہیں۔ اُن کی شاعری میں جذبات کا خوب صورت اظہار اور رجائیت کا پہلو نمایاں ہے۔ شگفتہ کی نظم میں بے ساختگی ہے مگر شائستگی کے ساتھ

نہ جانے کیسی
محبت ہے تمہاری
جس نے
آنکھوں میں میری
آنسوؤں کے چراغ جلائے ہیں
بجائے روشنی و جگمگاہٹ کے
چاروں جانب ہی دھندلے سائے ہیں!

☆

"یاد آتی ہے" کے ہر صفحہ پر طرح طرح کی کہکشائیں اور ضیائیں رنگ و نور بکھیر رہی ہیں۔ شگفتہ جیتی جاگتی سانس لیتی زندگی کے منظرنامے کی شاعرہ ہے۔ وہ زندگی جو اپنی سچائیوں اور کٹھنائیوں

کے ساتھ سانس لے رہی ہے۔ اُن کی نظم میں سطر در سطر ایک عجب روشنی اور تازگی کا احساس موجود ہے۔

دسمبر جب بھی آتا ہے
تو ہم کو یاد آتا ہے
لہو دل کو رُلاتا ہے
دسمبر وہ ستمگر ہے
جو جدائی ساتھ لاتا ہے
اور ہجر کی باتیں
دل بھر کے سُناتا ہے

☆

اظہارِ بیان میں سادگی و روانی ہے۔ شگفتہ نے اپنے الفاظ کے ذریعے اپنی سوچ، فکر اور جذبوں کی اس طرح تشکیل کی ہے کہ ان کے لہجے کی انفرادیت کا اظہار ہوتا ہے۔ احساسات و جذبات کی شدت کو سمیٹ کر جذبوں کی بے شمار تہوں کو بہت خوبصورتی اور نفاست کے ساتھ "یاد آتی ہے" کی ہر سطر میں نمایاں کیا گیا ہے۔

میں اکثر بھول جاتی ہوں
بڑی باتیں ضروری سی
مگر نہ بھول پاتی ہوں
تری یادیں
ادھوری سی

☆

شگفتہ کی نظموں میں منظر نگاری درجہ کمال پر نظر آتی ہے۔ زندگی کے حقائق اور معاشرتی مسائل کا ذکر بھی اُن کی اکثر نظموں میں ملتا ہے۔ شگفتہ ابلاغ کے ہنر سے عاری نہیں، وہ اپنی بات کہنے کے فن سے خوب واقف ہیں۔ وہ مناظر فطرت کو پینٹ کرنا خوب جانتی ہیں۔ جو خیال بھی اُن کی شعری صورت گری کے چاک پر آتا ہے، وہ مکمل ہو کر اُترتا ہے۔

تم بن میرا اثاثہ ہیں
تنہائی، خاموشی
اندھیرا گوشہ
آنسو اور تمہاری یاد!

☆

شگفتہ کو زبان پر دسترس اور لفظیات کے چناؤ کا شاعرانہ سلیقہ آتا ہے۔ ان کی نظمیں اگرچہ فکر و نظر، حسیت مشاہدہ و مناظر کے اعتبار سے زیادہ متنوع اور ہمہ گیریت کی حامل نہیں مگر انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس میں موسیقیت بھی ہے۔ شعریت بھی ہے، نغمگی ابلاغی قوت اور روانی پوری طرح موجود ہے۔ عرفان و آگہی کے نئے نئے جہان ان پر روشن ہوتے چلے جاتے ہیں جنہیں وہ اپنے شعری تجربوں کے خزانے میں محفوظ کر لیتی ہیں۔ شگفتہ کی نظمیں خوشگوار حیرت کے حصار میں مقید کر دیتی ہیں۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ دیا جلنے کے بعد اس پر گزرنے والی کیفیت ایک تخلیق کار کے کرب اور درد و غم سے کتنی مماثلت رکھتی ہے۔

تمہیں میں روکنا چاہتی ہوں
پر آواز دینے میں
ہزاروں الجھنیں بڑھ کے
مجھے آنکھیں دکھاتی ہیں
تمہیں میں سوچنا چاہتی ہوں
پر سوچوں کے کنارے بھی
میری دسترس سے دور
ہو کے مسکراتے ہیں

☆

شگفتہ کی فکری صلاحیت بے حد دلکش، دل آویز اور فکر انگیز ہے۔ تجربے کی آنچ اور مشاہدے کی روشنی نے ان کے کلام کو ایک انفرادیت سے نوازا ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے' وہ خوش اُسلوبی اور خوش سلیقگی سے کہا ہے۔ ان کی نظم جذباتی، فکری اور جمالیاتی وحدت ایک اکائی کی صورت میں نظر آتی ہے۔

اس قدر رگڑنے سے
مل مل کے دھونے سے
تن کی کثافت تو
صاف ہو ہی جائے گی
من کی کثافت کا لیکن
کیا توڑ کرو گے تم؟

☆

جدید سوچ، فکر، خیال، جدت اور اسلوب کو شگفتہ نے اپنی نظم کی اساس بنایا ہے۔ ان کے ہر لفظ میں حساسیت کی بازگشت سُنائی دیتی ہے۔ ان کی نظموں میں چاہت بھی ہے، اپنائیت بھی...... وفا بھی ہے اور خلوص بھی۔ قربانی، ایثار اور خوابوں کے رنگ بھی ہیں، آرزوؤں کا پرتو...... اور عشق کی جھلک بھی۔

آم کی شاخوں پر بور آچکا ہے
نئے شگوفے بھی پھوٹ رہے ہیں
اور بارشوں کے رنگین موسم بھی
آچکے ہیں
تو اب دیر کیسی......؟
تم بھی چلے آؤ ناں......!

☆

شگفتہ نے جدائی، وصال، کیف وارفتگی، ہجر، نارسائی کو مختلف انداز واطوار کے ساتھ اپنی نظموں کا حصہ بنایا ہے۔ وفا اور بے وفائی کا مفہوم ان کے نزدیک اور ہے۔ "یاد آئی ہے" میں صرف حُسن وعشق کے موضوعات ہی نہیں بلکہ نہایت سنجیدگی، سادگی، سچائی اور لطافت کے ساتھ معاشرتی مسائل کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا گیا ہے۔ "سانحہ، سونامی، سوال یہ ہے کہ، ماجرا، مکافاتِ عمل اسی کیفیت کی نظمیں ہیں۔

بجھی ہوئی سی آنکھیں
محرومیوں کا میک اپ
اور آنسوؤں کی چادر
اوڑھے ہوئے کھڑی تھی
چھوٹی سی کومل بچی
تھی "ماسی" کسی کے گھر کی

☆

خلش، منافق، محبت کا دامن، تم، ناممکن، بدلتے رنگ، محبت، ساون میں انتظار، احساس عزت، تمنا، دعویٰ، مکافاتِ عمل، شہر خموشاں، عورت، مجبوری، کیوں، فریاد، حقیقت، خوش گمانی، فیس بک، ستم گر، وہ رستہ چھوڑ دیا ہم نے، خواہش، نیا سال، میرا سائیں، زرد پتے، چاہت کی خوشبو، میرا قیمتی اثاثہ، لاحاصل، اپنے عنوان اور موضوعات کے حوالے سے بہت خوب صورت اور پُراثر نظمیں ہیں۔ "زرد پتے" کی چند لائنیں......

ہوا ہم کو اُڑائے پھرتی ہے
اب یہاں سے وہاں
اور قدموں تلے
یہ عروج وزوال کیسا ہے......؟

اس قدر خوب صورت مجموعہ کلام کی اشاعت پر شگفتہ شفیق کو مبارک باد۔ ☆☆☆

پسند اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار' ادبی ذوق کے آئینہ دار

چکبست ......شازیہ عارف' ساہیوال
انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امر رضا میں جو خم رہے

حامد ......شعبان کھوسہ' کوئٹہ
زبان پر شکوہ رنج والم لایا نہیں کرتے
تمہارے نام لیوا غم سے گھبرایا نہیں کرتے

ناصر کاظمی ......نعیم احمد آکاش' حیدر آباد
گئے دنوں کا سراغ لے کر کہاں سے آیا' کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا' مجھے تو حیران کر گیا وہ

صفی اورنگ آبادی ......سید فرحان احمد' کراچی
کسی کا رزق چھین سکتا نہیں خلاقِ اکبر سے
صفی پتھر کے کیڑے کو غذا ملتی ہے پتھر سے

انیس الدولہ وزیر لکھنوی' مسرت خان' صادق آباد
خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں' پیمبری مل جائے

داغ ......محمد علی' حیدر آباد
خدا دیتا ہے جن کو عیش' اُن کو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے' وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

شاہ عثمان ......واصف علی' گھوٹکی
افشاں جما کے تم نے یہ اندھیر کر دیا
گرنے لگے زمین پہ ستارے نئے نئے

انشاء ......واحد علی' جھنگ
نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاراں' راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں' ہم بے زار بیٹھے ہیں

احمد فراز ......احسن عمرانی سجاول
یہ کون پھر سے انہی راستوں پہ چھوڑ گیا؟
ابھی ابھی تو عذابِ سفر سے نکلا تھا

ناطق لکھنوی ......فلک خان' کراچی
ناطق سے چلو پوچھ لیں اسرارِ محبت
فی الجملہ غنیمت ہے کہ دیوانہ نہیں ہے

جلیل ......فائزہ علی' لاہور
آرام منحصر فقط اسباب پر نہیں
بیمار کو دُعا بھی ہے لازم دوا کے ساتھ

شاہد صدیقی ......زرینہ بیگم' چیچہ وطنی
رنج وغم کی راہوں میں ساتھ چھوڑنا کیسا
دور تک چلے آؤ' دور تک اندھیرا ہے

اختر امام رضوی ......نرگس جمال' حیدر آباد
میں ہر اک حال میں تھا گردشِ دوراں کا امین
جس نے دنیا نہیں دیکھی' مرا چہرہ دیکھے

حسرت موہانی ......مراد خان' کراچی
آرزو تیری برقرار رہی
دل کا کیا ہے' رہا' رہا نہ رہا

یاس یگانہ چنگیزی ......فرزانہ فیض' کراچی
سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں' کون ہوں' کیا ہوں؟
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

فرہاد خان تنولی ......شیر خان' ایبٹ آباد
بے وفائی کی انتہا ہم سے کیا پوچھتے ہو دوست؟
اس نے ہم سے پیار سیکھا کسی اور کے لیے

محمد فیاض غوری ......بشیر احمد بھٹی' بہاول پور
بہار آئی ہے' گلاب' ذرا جھوم لے تو
تیری پتیوں کے بکھرنے کا وقت ہے

فوزیہ مغل ......ریشماں' پنجاب
وہ جس کو دیکھ کے بچے بھی سارے چھوڑ گئے
میں ایک ٹوٹا کھلونا کسی دکان میں ہوں

فراق گورکھپوری ......شاہدہ سعید' پسرور
عمر فراق نے یوں بسر کی
کچھ غمِ جاناں' کچھ غمِ دوراں

جگر مراد آبادی ......یاسمین عمران' ڈسکہ
اب ان کا کیا بھروسہ' وہ آئیں یا نہ آئیں
آ اے غمِ محبت' تجھ کو گلے لگائیں

علامہ اقبالؒ...... انعمتی علی، وہاڑی
اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا ہے
مرزا غالب...... عاصم خان نیازی، میانوالی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
احسان دانش...... نوری بہادر، بھولاری
کرتا ہے آج کون خلوص و وفا کی قدر
کیا لوٹے اپنی جان مصیبت میں ڈال کر
یاس یگانہ چنگیزی...... ناعمہ علی، حیدرآباد
خود اپنے خاک وخوں میں لوٹ کر آلودہ دنیا
پڑا ہے اب گڑھے میں گور کے آلودہ تر ہو کر
صفیہ سلطانہ...... بشریٰ لطیف، کراچی
دل کا اثاثہ تو تیری یادیں ہیں
اور تو گھر سے سامان کھینچتا ہے
سچ اگر بولوں تو یہ حاکمِ وقت
میرے منہ سے زبان کھینچتا ہے
اختر الایمان...... ناہید قاسم، جہلم
دل کے کاغذ پہ کوئی نام نہ لکھا جائے
اب یہ سوچا ہے کسی کو بھی نہ چاہا جائے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں منظر سارے
جس کو چاہوں، وہ جی بھر کے نہ دیکھا جائے
فانی بدایونی...... شہریار، میرپورخاص
میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے
یاس یگانہ چنگیزی...... مجاہد رضا، سرگودھا
ہمارے قتل کا وعدہ غیر کے ہاتھوں
عجیب شرط پر ٹھہرا معاملہ دل کا
میراجی...... حریم احمد، اسلام آباد
نگری نگری پھرا مسافر، گھر کا رستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا، کیا ہے میرا، اپنا پرایا بھول گیا
عزیز حامد مدنی...... شاہد خان، چکوال
ہزار اس کے تغافل کی داستانیں ہیں
مگر یہ بات کہ وہ بھی ہے آدمی آخر

کاشی چوہان...... مان سنگھ، لاہور
ستاروں، چاند سورج سے مجھے کیا
مرے گھر میں دیا رکھا ہوا ہے
رومانہ رومی...... عندلیب خان، پشاور
عشق نے ایک عجب حال میں رکھا دل کو
ہم کو اپنی بھی نہ تھی کوئی خبر صحرا میں
یہ تو احساس کی ہے بات، اسے کیسے کہوں؟
کس قدر ہونا پڑا خاک بسر صحرا میں
عباس تابش...... نائلہ اکبر، چیچہ وطنی
اسی لیے تو اندھیرے بھی کم نہیں ہوتے
کہ اپنے جسم چراغوں میں ضم نہیں ہوتے
اور اب ہے اس لیے افسوس اپنے ہونے کا
کسی کے ہو گئے ہوتے تو ہم نہیں ہوتے
اشرف جاوید...... زوہیب گل، ہزارہ
ہوگا کہیں کہیں یہ پرندہ پڑا ہوا
پتوں کے ساتھ پر ہے اسی کا پڑا ہوا
دریا کی موج موج میں صحرا ہے گامزن
صحرا کی لہر لہر میں دریا پڑا ہوا
شاکر کنڈان...... نرمین خٹک، جہلم
دیکھ، ظلمت میں بہت حد سے زیادہ نہ گزر
یہ نہ ہو گونج اٹھے صورتِ سرائیل ابھی
شاہدہ حسن...... صولت مرزا، واہ کینٹ
کٹھن گھڑی میں بھی کوئی نہ آس پاس ملا
صدائیں دے کے دلِ خوش گماں نے صبر کیا
رمزی آثم...... جہاں آراء، لالہ موسیٰ
ردائے خاک نہیں آسمان ہے یہ بھی
کبھی کبھار تو ہوتا گمان ہے یہ بھی
میں اپنی ذات کے اندر بھی جھانک لیتا ہوں
کہ حیرتوں سے بھرا اک جہان ہے یہ بھی
نینا عادل...... اقراء قمر، ملتان
وصل ہوتا ہے کیا، ہجر کا آئینہ
میں تجھے ڈھونڈتی ہوں ترے روبرو
ان نگاہوں میں سمٹیں اگر دو جہاں
ایک میں ہوں ادھر، ہے ادھر ایک تو

نوٹ: شعر کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھیں۔ شاعر کے نام کے بغیر شعر شاملِ اشاعت نہیں کیا جائے گا۔ (انچارج) پسند اپنی اپنی

آپ کی خبر

...... انتقالِ پُرملال ......

◆ گزشتہ دنوں ہماری دوست لکھاری فریدہ مسرور کے بہنوئی، امتیاز علی ایک اندوہ ناک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ ادارہ دکھ کی اس گھڑی میں اہلِ خانہ کے غم میں برابر کا شریک ہے اور مرحوم کے لیے دُعا گو ہے۔

...... بس دُعا چاہیے ......

◆ ہماری دیرینہ لکھاری گل کے شوہرِ نامدار اچانک علیل ہو گئے ہیں اور ان دنوں ہسپتال میں ہیں۔ ہم ملک صاحب کی صحت یابی کے لیے دُعا گو ہیں۔

◆ ہمارے ساتھی کاشی چوہان کی پھوپھو ممتاز بیگم ان دنوں کراچی میں علیل ہیں۔ تمام دوستوں اور قارئین سے ان کی صحت یابی کے لیے دُعاؤں کی اپیل کی جاتی ہے۔

...... مبارک سلامت ......

ہماری بہت پیاری ساتھی فائزہ شہزاد المعروف نانی پچھلے دنوں سچ مچ نانی کے رتبے پر فائز ہو گئی ہیں۔ اُن کی بیٹی کو اللہ نے اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ رمیصہ سلطان کی صورت آنے والی نواسی نے نانی فائزہ شہزاد کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ 14 اگست کو فائزہ شہزاد اور اُن کے بیٹے محمد عمر بن شہزاد کی سالگرہ بھی ہے۔ اِن ڈھیروں ڈھیر خوشیوں پر ہم انہیں دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دیتے ہیں۔

...... خوش خبری ......

ہمارے پرانے ساتھی جناب شیخ معظم الٰہی کے بھانجے شیر ازافگن کے ہاں چھ سال بعد بیٹا (محمد احمد) اور بھانجی ظلِ ہما کے ہاں چار برس بعد بیٹا (محمد داؤد بن اشفاق) ہوا ہے۔ دنیا میں آنے والے اِن دونوں پھولوں کے لیے ہم دُعا کرتے ہیں کہ اللہ انہیں صحت وتندرستی والی زندگی عطا کرے۔

...... سالگرہ کا دن آیا ہے ......

پچھلے دنوں نامور شاعر حمایت علی شاعر نے اپنی چھیاسی ویں سالگرہ منائی۔ اس تقریب کا اہتمام ان کے فرزند اوج کمال نے کراچی آرٹس کونسل میں کیا جس میں علم وادب کی جانی مانی شخصیات نے شرکت کر کے اس تقریب کو یادگار بنا دیا۔

...... اعزاز ......

وومن رائٹرز فورم خیبر پختون خوا کی صدر اور معروف شاعرہ مسز بشریٰ فرخ خواتین کی عالمی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لیے ایران تشریف لے گئی ہیں۔

...... کتاب خبر ......

☆...... ہمارے دوست شاعر اور قاری علی رضا عمرانی کا پہلے مجموعے ''اجالا تیری یادوں کا'' کی کامیابی کے بعد دوسرا مجموعہ تیاری کے مراحل میں ہے۔ امید ہے، جلد ہی مجموعہ مارکیٹ ہو جائے گا۔ ادارہ ان کی کامیابی کے لیے دُعا گو ہے۔

...... واپسی ......

معروف ادیب، ڈراما نگار طاہر شیخ ڈرامے کے موضوع، مکالمے اور کرافٹ کے حوالے سے ایک نہایت منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ''یور اوبیڈینٹ سرونٹ'' آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی'' پہنچی وہیں پہ خاک'' ان کے یہ ڈرامے، ڈراما آرٹ میں کلاسک کا درجہ رکھتے ہیں۔ طاہر شیخ جو اپنی بعض نجی مصروفیات کے باعث ڈرامے کی دنیا سے دور تھے اب پی ٹی وی پر ایک نئی منفرد موضوع کی حامل سیریل ''بلیک بورڈ جنگل'' کے ساتھ اُن کی واپسی ہو رہی ہے۔

''آپ کی خبر'' کا حصہ بننے کے لیے تمام رائٹرز اور قارئین بلا جھجک اپنی خبریں ادارے کو بھیج سکتے ہیں۔



خدا......؟

آپ نے کبھی سوچا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا خواب کیوں دیکھا تھا جو بعد ازاں سارے اسلامیانِ ہند کا مطالبہ بن گیا؟

آپ نے کبھی سوچا ہے کہ اسلامیانِ ہند نے قیامِ پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا؟ شاید ہماری نوجوان نسل کی اکثریت یہ نہ جانتی ہو سو یہ چند وجوہ انہی کے لیے تحریر کی جا رہی ہیں۔

غیر منقسم ہندوستان میں مسلمان زبان' لباس' تہذیب اور عقائد کے اعتبار سے بھارت کی اکثریت والی آبادی ہندوؤں سے قطعاً مختلف تھے۔ ہندو ہر لحاظ سے اُن پر غالب آنا چاہتے تھے۔ اِس صورتِ حال میں مسلمان دنیا کے رہتے' نہ دین کے۔ یہ صرف اور صرف دین کا تعلق تھا جس کی بنیاد پر انہوں نے الگ قوم ہونے کا دعویٰ کیا اور انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو بھی یہ دعویٰ تسلیم کرنا پڑا کیونکہ اِس دعوے کی بنیاد سچائی پر ہے۔ بالآخر اِس دعوے کی بنیاد پر کیا جانے والا مطالبہ جائز ٹھہرا اور برصغیر کے مسلمانوں کو اپنا الگ وطن مل گیا جس میں وہ اپنے دین کے مطابق اپنا اجتماعی نظام چلا سکیں۔

قیامِ پاکستان عمل میں آیا تو ہر فرد کا یہ خیال تھا کہ اِس سرزمین میں اسلامی قوانین رائج کیے جائیں گے۔ یہاں عدل وانصاف کا دور دورہ ہوگا۔ کوئی کسی کے حقوق غصب نہیں کر سکے گا۔ یہاں صحیح معنوں میں بھائی چارہ اور اخوت ہوگی۔ سب کو برابر تصور کیا جائے گا اور کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جائے گی۔ یہاں ایک ایسا معاشرہ قائم ہوگا جس میں کوئی لوٹ کھسوٹ ہوگی' نہ استحصال۔ سب کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ رہے گی۔ اربابِ اختیار دیانت دار ہوں گے اور پولیس تحفظ کی ضامن۔ ظلم وستم تو دور کی بات ہے' کوئی کسی کی طرف میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھے گا۔ ظلم کرنے والوں کے ہاتھ قلم کر دیئے جائیں گے اور مظلوموں کی دادرسی کی جائے گی۔ مختصر یہ کہ ہر طرف امن وسکون ہوگا اور یہاں رہنے والے اپنے دین و مذہب کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔ یہ محض ایک خواب تھا جو چکنا چور ہوگیا۔ سڑکوں' گلیوں' مسجدوں اور امام بارگاہوں میں نامعلوم' بے رحم قاتلوں کی گولیوں سے دم توڑتے ہوئے ہزاروں لبوں سے جو آواز آ رہی ہے' وہ آپ بھی سن رہے ہیں نا......؟

پاکستان کا مطلب کیا؟

لا اِلٰہ اِلا اللہ

کیا یہی ہمارے خواب کی تعبیر ہے؟

سہام مرزا نے نومبر 1996ء میں ماہنامہ "دوشیزہ" اور "سچی کہانیاں" میں مذکورہ بالا سوال اٹھایا تھا۔